کنول پھول اور
تتلیوں کے پنکھ
ڈاکٹر طاہرہ کاظمی

کنول پھول اور تتلیوں کے پنکھ

ڈاکٹر طاہرہ کاظمی

SANJH
PUBLICATIONS

کنول پھول اور تتلیوں کے پنکھ   سماجیات   ڈاکٹر طاہرہ کاظمی

اشاعت اول : 2020

ٹائٹل : سعید ابراہیم

تعداد : 500

قیمت : 800

Kanwal Phool aur Titleuon Ke Pankh

(Urdu column by Dr. Tahira Kazmi)

Printed by:
Navid Hafeez Press, Lahore.

Price:
In Pakistan: Rs. 800.00

Published by:

سانجھ
SANJH PUBLICATIONS

Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 42 37355323. Fax +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com
ISBN 978-969-593-335-0

ابا جی

شوکت علی کاظمی کے نام

گل کیا جاتا رہا اور سرکشی کرتا رہا
رخت شب میں کوئی تھا جو روشنی کرتا رہا

طاہرہ کاظمی۔ ہماری مایا اینجلو

طاہرہ کی کتاب "کنول پھول اور تتلیوں کے پنکھ" پڑھ کر ہمارا حال قدیم داستانوں کے ان کرداروں کا سا ہوا جو کبھی ہنستے تھے
اور کبھی روتے تھے۔ اسے عورت ہونے پر فخر ہے، یہ مضمون پڑھ کر ہمارا دل بھی خوشی اور فخر کے جذبات سے لبریز ہو گیا مگر جب اس نے عورت پر ہونے والے مظالم کی کہانیاں سنانا شروع کیں تو لاکھ ضبط کرنے پر بھی ہمارے آنسو بہہ نکلے اور سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا ٹشو کا ڈبہ استعمال کرنے کی نوبت آ گئی۔

طاہرہ کی خوبی صرف قاری کو رلانا نہیں بلکہ عورت کو اعتماد اور حوصلہ دینا اور ظلم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا پیغام دینا بھی ہے۔ بیسویں صدی کے ساٹھ اور ستر کے عشروں کی فیمنسٹس اور ایکٹوسٹس کو نوید ہو کہ اکیسویں صدی میں ان کے محاذ کو طاہرہ نے سنبھال لیا ہے۔ تحریک نسواں کی رہنماؤں کو طعنے دیے جاتے تھے کہ انہوں نے اگلی قیادت تیار نہیں کی۔ لو دیکھ لو، طاہرہ جیسی خواتین میدان میں آ گئی ہیں۔

ہم برسوں سے عورتوں کے جن حقوق کی بات کر رہے تھے، طاہرہ نے ان کے بارے میں اتنے زور و شور اور اعتماد سے آواز
اٹھائی ہے کہ پدر سری نظام کے علمبر داروں اور مذہب کی من مانی تشریحات کرنے والوں کی زبانیں گنگ ہو گئی ہیں۔ میرا بس
چلے تو اس کتاب کو یونیورسٹیوں کے سوشل سائنسز کے نصاب میں شامل کرا دوں بلکہ اس کتاب کو میڈیکل کالجوں میں کا نا

کالوجی کے مضمون کے ساتھ ساتھ پڑھانا ضروری ہے کیونکہ ڈاکٹر کا کام صرف چیر پھاڑ کرنا نہیں بلکہ تولیدی صحت کے

حوالے سے عورتوں کے تولیدی حقوق کے لئے آواز اٹھانا بھی ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر طاہرہ نے اپنی کتاب میں بتایا ہے کہ بار بار

سیزرین آپریشن کرانا عورت کے لئے کتنا خطرناک ہے۔ یا یہ کہ بیٹا پیدا نہ ہونے کی ذمہ داری عورت پر نہیں ڈالی جاسکتی۔

عورت کے پاس ایکس ایکس کروموزوم ہوتے ہیں جب کہ مرد کے پاس وائی کروموزوم ہوتا ہے جو مختلف کمزوریوں کا سبب بنتا ہے۔ عورت کا ایکس کروموزوم اسے مضبوط بناتا ہے۔ طاہرہ ہمیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ مرد کی جنسی بے راہ روی کیسے اس کی بیوی کو جنسی بیماریوں میں مبتلا کرتی ہے۔

اس کتاب اور تین چار عشروں سے صنف اور ترقی کے موضوع پر کی جانے والی باتوں پر 'سوسنار کی ایک لوہار کی' مثال

صادق آتی ہے۔ جینڈر پر ہونے والی سینکڑوں ورکشاپس پر طاہرہ کی یہ ایک کتاب بھاری ہے۔ 'مجھے اپنی بیٹی کو قتل کرنا ہے'

میں طاہرہ ہمیں ایران میں غیرت کے نام پر قتل کی جانے والی لڑکی رومینہ کی کہانی سناتی ہیں اور کہتی ہیں 'ایران ہو یا افغانستان، ہندوستان ہو یا پاکستان 'عورت کو دیکھنے، پرکھنے، جانچنے اور فیصلہ سنانے والی وحشت بھری آنکھ اور ہاتھ میں تھامے گئے آلہ قتل میں سرحدوں کی لکیروں سے کوئی فرق نہیں پڑا کرتا۔' ایک اور کہانی جس نے مجھے رلا دیا وہ افریقہ میں نسوانی ختنے کے رواج کے بارے میں ہے "کیا اللہ نہیں جانتا تھا کہ عورت کو کون سے اعضا بخشنے ہیں؟" ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے انہوں عورت کے نازک عضو کی چیر پھاڑ کا جو نقشہ کھینچا ہے، وہ مضبوط ترین اعصاب رکھنے والے قاری کو بھی ہلا کے رکھ دے گا۔ اسی طرح چین میں عورت کے پاؤں کو کنول کی شکل دینے کے لئے اس کے پیروں کی ہڈیاں توڑنے موڑنے کی تفصیل حساس لوگوں کی بھوک اور نیند اڑا دینے کے لئے کافی ہے۔ شکر ہے چین میں انقلاب کے بعد یہ رواج ختم ہو گیا تھا۔

طاہرہ نے پاکستان کے مختلف علاقوں میں رائج رسم سوارہ پر بھی قلم اٹھایا ہے "سوارہ یا انسانیت کا بٹوارہ" میں وہ لکھتی ہیں "ونی یا سوارہ ایک ایسی رسم جو وطن کے سب مردوں کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ عورت کو دو ٹکے کا گردانتے والوں کی ذہنیت اس پنڈال میں کھلتی ہے، جب مردانگی کے زعم میں مبتلا مردوں کا اجتماع اپنے جیسے مرد کی غلطی معاف کرتا ہے، اپنے جیسے ہی کو کفارہ ادا کرنے کو کہتا ہے، اور اپنے جیسے ایک اور مرد کی عیاشی کا سامان کرتا ہے۔ اس ساری اکھاڑ پچھاڑ میں چھری تلے کون آتی ہے، ایک کمسن بچی!"

اپنے مضمون "فرشتہ ہو یا زینب، یہ سب تمہاری حاکمیت کا تاوان ہے" میں طاہرہ ریپ کی ان اقسام سے متعارف کراتی ہیں جو کسی کو نظر نہیں آتیں یعنی ذہن کا ریپ کہ سوچنے کی آزادی نہیں، فیصلہ کر نہیں سکتی۔ خیالات کا ریپ کہ اظہار کی اجازت نہیں، کیا چاہتی ہے، بتانا ناممکن!۔ آزادی کا ریپ کہ باہر نکلنا تمہیں پسند نہیں۔ تمناؤں کا ریپ، جذبات کا ریپ اور مالی ریپ کہ عورت کما کے لائے لیکن اے ٹی ایم کارڈ تمہارے پاس ہو۔"

اپنے قلم کے ذریعے عورتوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف طاہرہ نے جس بے خوفی اور اعتماد کے ساتھ آواز اٹھائی ہے، اس کا کریڈٹ وہ اپنے والد کو دیتی ہیں جنہوں نے عورت کو مالی طور پر مضبوط اور پر اعتماد دیکھنے کا خواب دیکھا اور ایمان کی طرح جزو ذات بنالیا۔ اور یوں ہمیں طاہرہ جیسی تعلیم یافتہ مسیحا اور بے مثل لکھاری مل گئی۔ طاہرہ کی رول ماڈل سیدہ زینب سلام اللہ علیہا ہیں جنہوں نے یزید کے دربار میں کلمہ حق بلند کیا۔

اس کتاب میں طاہرہ نے ایک مشاق عکاس کی طرح عورت پر ہونے والے ظلم کی ہر شکل کی عکاسی کی ہے۔ خواہ وہ قبر سے

نکال کر ریپ کی جانے والی مردہ عورت ہو، جسمانی مار پیٹ سے مضروب، چولہے میں جلنے والی، تیزاب سے منہ بگاڑ دینے والی عورت یا ذہنی اذیتوں سے پاگل ہو جانے والی عورت، جنسی اعضا کو بجلی سے داغی جانے والی عورت، گالیاں سن کر زندگی بتانے والی عورت، طلاق کے بعد بچے چھین کر گھر سے نکالے جانے والی عورت، یا گلیوں میں ننگی گھمائے جانے والی عورت، غرضیکہ ظلم کی ہر شکل کو اس نے بے نقاب کیا ہے۔

مجھے سب سے زیادہ جو بات پسند آئی وہ یہ کہ اس کتاب کی بدولت آپ ان مظالم اور رویوں کی جڑ یعنی پدر سری نظام کو اچھی طرح سمجھ جائیں گے اور ان لوگوں کے رویوں کو بھی جو HIMPATHY کا شکار ہیں۔ HIMPATHY پدر سری معاشرے کا وہ بد صورت سچ ہے، جہاں مرد کسی بھی گھٹیا صورتحال سے بری الذمہ ہونے کے ساتھ ساتھ بے تحاشہ ہمدردی کا مستحق بھی ٹھہرتا ہے اور اس کے ہر فعل کی توجیہہ گھڑ لی جاتی ہے۔ ویسے تو اس کتاب کا ہر مضمون اور ہر کہانی اپنی جگہ ایک شاہکار ہے مگر خاصے کی چیز خلیل الرحمن قمر اور حوروں کہ کہانیاں سنانے والے مولانا کے بارے میں مضامین ہیں۔ مایا اینجلو کے بارے میں انہوں نے اتنی خوبصورتی سے لکھا ہے کہ میں نے انھیں پاکستان کی مایا اینجلو قرار دے دیا ہے۔

جینڈر کی ورکشاپ ہو یا حقوق نسواں کے حوالے سے کوئی پروگرام، ہم لوگوں کو یہ جملہ ضرور سننے کو ملتا ہے کہ عورت ہی عورت کی دشمن ہوتی ہے خاص طور پر ساس کی بہو کے ساتھ زیادتیوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ طاہرہ نے اس بات کا اتنا بھرپور جواب دیا ہے کہ مزید کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ان کا کہنا ہے کہ جب عورت ساس بنتی ہے تب تک پدر سری نظام اسے نوچ نوچ کر نیم مردہ کر چکا ہوتا ہے۔ وہ نظام جس میں مرد ایک عورت کو دوسری عورت پر ظلم کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ عورت اس چکی میں پس کر اپنی ماہئیت ہی تبدیل کر بیٹھتی ہے۔ اپنی بقا کے لئے اس نظام پر ایمان لاتے ہوئے، وہ عورت نہیں رہتی اس نظام کا پرزہ بن جاتی ہے۔ اس کے اندر ایک عورت ہونے کی حساسیت اور دوسری عورت کے دکھ کو پہچاننے کی صلاحیت زندگی کے شروع میں ہی آرزوؤں کی چتا میں جل کے راکھ ہو جاتی ہے۔ طاقت کے اس کھیل میں ماں نامی عورت کو اختیار ملنا صرف ایک مرد کے ذریعے سے ہی ممکن ہے جو کہ اس کا بیٹا ہے۔ ایک دوسری کہانی میں وہ بتاتی ہیں کہ ایک مرد سمجھداری سے کام لیتے ہوئے بیوی اور اپنے گھر والوں دونوں کو خوش رکھ سکتا ہے۔

آخر میں، میں طاہرہ سے کہنا چاہوں گی کہ یہ کتاب لکھنے کے بعد آپ صرف ڈاکٹر اور مصنفہ نہیں رہیں بلکہ حقوق نسواں کی

تحریک کی رہنما بن گئی ہیں۔ اب ساری مظلوم خواتین رہنمائی کے لئے آپ کی طرف دیکھیں گی۔ یہ کتاب لکھ کر آپ نے بہت بھاری ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھائی ہے۔ اللہ آپ کو کامیاب کرے۔ ویمن موومنٹ کی ساری ایکٹیوسٹس آپ کے ساتھ ہیں۔

مہ ناز رحمن

طاہرہ کاظمی: کوئے اناث کی سبالٹرن صدا

گیاتری چکرورتی سپی وک (Gayatri Chakravorty Spivak) ہمارے عہد کے چند ایسے لوگوں میں سے ہیں جن کا بنیادی موقف محکوم و مطیع انسانوں کے گرد گھومتا ہے۔ وہ سوال اٹھاتی ہیں کہ کیا محکوم و مطیع یعنی 'غلام ولد غلام' بول سکتے ہیں؟

Can the subaltern speak?

یہ نہ بول سکنا طبی اور لسانی معنوں میں نہیں، وہ بے زبان ہیں کہ ان آواز کی رسائی نہیں۔ دیکھیے کافکا کی کہانی The Bucket Rider ۔ کیا کچھ چھوڑی تھی غریب سردی مارے نے، کیسی اذیت و آزمائش بھری مسافت کے بعد پہنچا تھا کوئلہ فروش کے دروازے، کس کس طرح چلایا اور دستکیں دی تھیں لیکن کیا اس کی سنی گئی؟ کیا اُسے رسائی حاصل ہوئی؟ نہیں۔ یہ براڈکاسٹنگ والے بھی بڑے ظالم ہیں، ان کے کسی بڑے نے اس نارسائی کا اصل اصول یہ نکالا ہے کہ اگر آپ کی آواز سُنی نہیں گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے کچھ کہا ہی نہیں۔ اب دیکھیے تو ذمہ داری کس کے کاندھوں پر ہے، فردِ جرم بنائی جائے گی تو مجرم کون ہو گا؟ سارے مظلوم، مجبور، محکوم، مطیع اور مقہور یعنی سارے غلام ولد غلام۔

اب میری بھی سُن لیں: دنیا کے تمام معاشرے طبقاتی رہے ہیں، طبقاتی ہیں اور طبقاتی رہیں گے۔ میراز ور تمام یہ ہے اور ہر طبقے کی عورت اپنے طبقے کی Subaltern محکوم، مطیع اور غلام ولد غلام کی غلامہ رہے گی، ان گنت مثالیں ہیں لیکن بالکل سامنے کی مثال "مائی فیوڈل لارڈ" ہے۔

طاہرہ کاظمی کے یہ کالم پڑھ لیں۔ آپ کو ہر کالم میں بکٹ رائڈر یاد آئے گا۔ اُن کی آواز کا ونکا تنک اور کا ونکا سے مجھ ایسے لاکھوں تک پہنچی لیکن کس کام کی؟ پھر بھی طاہرہ کو یہ کام کرنا ہے، سسی فس (Sisyphus) سے ذرا مختلف انداز میں، بھاری پتھر کو سینے پر رکھ کر، کیوں کہ یہ کام بھی لایعنی و بے معنی ہے۔ سسی فس کو دیوتاؤں نے کبھی ختم نہ ہونے والی ایسی سزا دی جو صرف جسمانی نہیں ذہنی بھی ہے۔ ذہنی سزاؤں کا ہولناکی یہ ہوتی ہے کہ اُن کی پیائش اب تک تو ممکن نہیں ہو سکی۔ ہمارے اوپر نیچے، دائیں بائیں سارے اسی میں لگے ہیں کہ ہم اُس طرح کے بن جائیں جیسا وہ چاہتے ہیں، آپ ویسی ہی 'برابر' ہو جائیں جیسی برابر انھوں نے آپ کو کیا ہے۔ نہیں تو پاگلوں کا ساتھ تو آپ نے ڈھونڈ ہی لیا ہے، اسی پر ڈٹی رہیں۔

آپ اِس نوٹ کو پڑھ کر ضرور سوچیں گی کہ یہ کیا ہے، میری اور میرے کالموں کی تعریف تو کی ہی نہیں۔ تو سنیے اگر آپ اور آپ کی تحریریں کسی قابل نہ ہوتیں اور آپ اپنے موضوعات کو فطری ڈھنگ سے بیان نہ کر پاتیں یعنی اپنے مواد کو اُس کی مطلوبہ ہیئت نہ دے پاتیں تو وجاہت مسعود کب کے کنی کترا جاتے اور میں بھی آپ کو پاگل پن پر ڈٹے رہنے کا مشورہ نہ دیتا۔ آخری بات کہ وجاہت آپ کے مداح ہیں اور میں بھی۔

انور سین رائے

شگوفے اور نشتر

طاہرہ کاظمی کی تحریریں شگوفے بھی ہیں اور نشتر بھی اور دردمندی کے ساتھ۔
ہمارے معاشرہ میں ایک دو برس سے ایک نئی وضع در آئی ہے جس میں اخلاق اب ایک لفظ پارینہ اور تہذیب گزرے وقتوں کی کہانی ہے۔ اب عزت کے معنی طاقت سے پیوست ہیں۔
طاہرہ کی تہذیب میں گندھی فکر اور اخلاق سے ترشے رویے بہت سبک لفظوں سے تصویریں بناتے ہیں، یہ اس معاشرہ کا منظر نامہ جہاں عزت لٹنے کے لئے ہوتی ہے اور فیصلہ کن بیانیہ ان کا ہے جو کمزور کو کسی شمار میں نہیں لاتے۔ اور کمزوروں کی کمی نہیں۔ آخر عورتیں ہیں، اقلیتیں ہیں اور کمسن بچے بچیوں کی کمی نہیں۔ وہ دانشور بھی ہیں، وہ پرہیز گار بھی ہیں جو علی اعلان کیسی زبان بولتے ہیں، جس پر زبان شرما جاتی ہے۔

طاہرہ کو اعتبار ہے، اپنے تہذیبی ورثہ پر اور ان اخلاقی رویوں پر جو اختیار اور اقتدار کی کروٹوں میں مسلے جا رہے ہیں۔ کچھ کے لئے یہ تحریریں نقصان کا نشتر ہیں اور کچھ کے تکبر کو تازیانہ۔ زندگی بھولتی بھی نہیں اور انا کی گونج میں گم ہونے والوں کو معاف بھی نہیں کرتی۔

طاہرہ بھی بس اتنا ہی لکھتی ہیں اور کیا خوب لکھتی ہیں ۔ میں تو شکریہ ادا کروں کہ ان کے ضمیر کا آئینہ دھندلایا تک نہیں۔ سلامت رہیے

ڈاکٹر عارفہ سیدہ

صحافت کے کینوس پر ادب کے رنگوں میں عورت کا مقدمہ

کنول پھول اور تتلیوں کے پنکھ... عنوان سے لگتا ہے جیسے شاعری کی کوئی کتاب ہو، کسی کم عمر خاتون کے کومل نرم میٹھے جذبوں کا بیان مگر پہلے صفحے کی پہلی سطر ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مسائل سنگین ہیں، حقیقی ہیں اور ہمارے اپنے ہیں۔ یہ طاہرہ کاظمی کے ان کالموں کا انتخاب ہے جو انھوں نے پاکستان میں عورت کے مسائل کے بارے میں قلم بند کئے۔ پچھلے چند برسوں میں پاکستان میں ان گنت مضامین عورتوں کے حقوق، ان کی حقیقی صورت حال، ان کے ساتھ ہونے والے بہیمانہ سلوک اور پدر سری معاشرے کے استحصال اور جبر، مذہب، رسم و رواج، روایت اور بھانت بھانت کے فرسودہ بنیاد عقائد پر لکھے گئے، انگریزی میں زیادہ، اردو میں کم۔ مسائل کے شکار طبقاتی نظام میں زیادہ تر پسماندہ طبقے کی عورت صنفی امتیاز کی بدترین مثال ہے۔ اکیسویں صدی تک بہت پانی پلوں کے نیچے سے بہ گیا ہے مگر صورت حال روز بروز بگڑتی جاتی ہے، شعور کی بیداری کا عمل جاری ہے مگر تبدیلی زندگیوں میں نظر نہیں آتی۔

ایسی صورتحال میں ہمارا سلام ہے ان خواتین پر جنھوں نے تحریک آزادی نسواں کا آغاز کیا اور اپنی زندگیاں خواتین کے حقوق کی بحالی کے لئے وقف کر دیں اور ہمارا سلام ان خواتین کے لئے جو پوری توانائی کے ساتھ جدوجہد میں لگی ہوئی ہیں۔ طاہرہ کاظمی ایسی ہی ایک بیدار ذہن، نڈر اور بے باک لکھاری ہیں۔ وہ پاکستانی عورت کے مسائل کو بھی سمجھتی ہیں اور اپنے ملک کی تہذیبی روایت سے بھی ناواقف نہیں ہیں۔ تلخی کے ساتھ کہی جانے والی باتوں کو بھی سنبھال کر کہنے کا ہنر انھیں آتا ہے۔ یہ مضامین، آپ چاہیں تو انھیں کالم کہ لیں، اگر مجھے

پسند آئے تو اس کا ایک سبب ان کے اسلوب بیان کی readability کا عنصر بھی ہے۔ کوئی وقتی اخباری عبارت کب ادبی تحریر بن جاتی ہے، اس کا انحصار اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ موضوع کو کس سطح سے دیکھ کر تحریر میں لایا گیا ہے۔ عورت کا مقدمہ ایک بالغ نظر عورت کے قلم سے پڑھیے اور آپ خود اپنی رائے قائم کیجیے۔

افتخار عارف

تتلی کے پنکھ مضبوط ہوتے ہیں

ڈاکٹر طاہرہ کاظمی کے منفرد، مضبوط، انوکھے اور ولولہ انگیز کالموں کا مجموعہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے اس بات کی ازحد خوشی ہے کہ طاہرہ نے اپنی دل جمعی اور استقلال سے لکھی ہوئی تحریروں کو ایک سنجیدہ، بامقصد اور بامعنی کام سمجھ کر مجتمع کیا اور یوں اپنے پڑھنے والوں کے لئے آسانی کر دی۔ اب ہم جب جی چاہے، انہیں ہاتھ میں لے کر پڑھ سکتے ہیں۔

جہاں تک مجھے علم ہے یہ خوبصورت کالم گزشتہ ڈیڑھ برس میں "ہم سب" پر باقاعدگی سے شائع ہوئے اور مقبولیت کے جھنڈے گاڑے۔

میں طاہرہ سے ان کی تحریروں کے ذریعے متعارف ہوئی اور پھر جوں جوں انہیں پڑھا، گرویدہ ہوتی چلی گئی۔ بانو قدسیہ، عمیرہ احمد، نمرا احمد اور دیگر رجعت پسند مصنف خواتین کے دیے گئے آدرشوں کے درمیان جہاں عورت کی حیثیت ہمیشہ کمتر سمجھی گئی، ڈاکٹر طاہرہ جیسی باغیانہ، مجاہدانہ اور متوازن سوچ والی تحریریں ناانصافیوں سے مسلسل برسرپیکار نظر آتی ہیں۔ وہ ہارتی نہیں، ڈٹی رہتی ہیں۔ ان کی جدوجہد کی حیثیت اگرچہ طوفانی ہواؤں کے سامنے ننھے دیے کی سی ہے مگر اپنے حصے کی شمع جلانا تو ہر باشعور انسان کا فریضہ ٹھہرتا ہے اس سے مفر ممکن ہی نہیں، سو ڈاکٹر طاہرہ ڈٹ کر لکھ رہی ہیں۔

کچھ لوگ زندگی کے سفر میں یونہی سرراہ چلتے چلتے مل جاتے ہیں آپ انہیں آسانی سے اپنے ساتھ شامل سمجھنے لگتے ہیں اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہوتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی ہستی اور ذات کے جگ ساپزل کا کوئی کھویا ہوا حصہ تھا جو اچانک آپ سے آن ملا

اور اپنی مخصوص اور متعین جگہ پر خوبصورتی سے فٹ ہو گیا۔ مجھے بھی ڈاکٹر طاہرہ سے مل کر کچھ یونہی لگا گویا یہ میری اپنی ہی ہیں، یہ بھی مجھ جیسی باؤلی ہیں، میں نہ مانوں والی شخصیت ہیں، ہمارا ذہنی قبیلہ چونکہ ایک ہے لہذا ہمیں ایک دوسرے سے قطعی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ ان کی طاقتور اور متاثر کن تحریریں پڑھ کر میں قائل ہو گئی کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں، جو حق سچ بات کہنے کا سلیقہ رکھتے اور ہنر جانتے ہیں۔

یہ خالی خولی طبی ڈاکٹر نہیں بلکہ سماج کی ایک ماہر جراح بھی ہیں۔ وہ برصغیر کی عورت کے مسائل اور رستے ہوئے ناسوروں کی کامیابی سے جراحی کر کے ان پر پھاہے رکھتی ہیں اور مرض کی وجوہات پر کھل کے تنقید کرتی ہیں۔

ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے خواتین کے ذہنی، نفسیاتی، جنسی، معاشی اور معاشرتی مسائل پر ان کی گہری نظر رہتی ہے۔ ایک مشہور ڈرامہ نگار جب عورت دشمنی میں ٹی وی اور پریس میں زہر اگلنے لگے تو طاہرہ تلوار سونت کر ان پہ تیز وار کرنے سے نہیں گھبرائیں اور اس کے خوب لتے لئے۔ ان کی اسی ادا پر ہم مر مٹے اور ان کے مداحین میں شامل ہو گئے۔

دعا ہے کہ طاہرہ طویل عمر پائیں، اپنے مشن پر ڈٹی رہیں اور گیدڑ بھبکیوں سے نہ گھبرائیں۔ ان کے قلم میں بہت طاقت ہے۔ انہیں خرابی کی نشاندہی کرنے اور ذمہ داروں کو چوٹ لگانے کا طلسماتی ہنر خوب آتا ہے افسوس کہ تنگ نظری اور مذہبیت کی گھٹن کی وجہ سے آج بھی ہماری عورت پورن بھگت کے کنویں میں الٹی لٹکی ہاتھ پاؤں مار رہی ہے اور اس کی شنوائی نہیں ہو رہی۔ ہم تیسری دنیا کے لوگ گلوبل ولیج کے باسی ہونے کے باوجود ابھی تک ازمنہ قدیم کے نظریات کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ عورت کو پس چلمن بٹھانے ہی پر اصرار ہے، جدیدیت کی حمایت کو فحاشی سمجھا جا رہا ہے اور ترقی کو روایت سے بغاوت۔

تو ایسے میں طاہرہ جیسی لکھنے والیاں پڑھنے والوں کو چونکانے میں سینہ سپر ہو جاتی ہیں اور جرات کا پیکر بن کر اپنی بات کہنے سے کسی صورت پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہوتیں۔ اس لئے میں ان کی مکمل تائید اور سپورٹ کرتی رہوں گی کہ احساس کی نایاب دولت سے مالا مال ایک باشعور لکھنے والے کا یہی وصف ہوتا ہے اور یہ صلاحیت ان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ

بالغ نظری کی تصویر کھینچتے ہوئے، گھن گرج کے ساتھ فرسودہ خیالات اور رسومات کو تہ تیغ کرنے میں مصروف عمل رہتی ہیں تو حوصلہ ہوتا ہے۔

وہ بدنما موضوعات پر ایسے اجلے اجلے کالم لکھتی ہیں کہ مجھ جیسی بے کار مگر مضطرب لکھنے والی بھی عش عش کر اٹھتی ہے اور رشک آتا ہے کہ کاش میں بھی ایسا ہی لکھ سکتی۔

ہمارے بہت سے لکھنے والے ایک بھیڑ چال میں مبتلا ہو کر پہلے سے موجود روایتی خیالات کے پرچار کا ڈھول پیٹتے رہتے ہیں مذہب کی آڑ لے کر سماجی پستیوں کی پردہ داری اور تحفظ کے لئے لٹھ لے کر نکل آتے ہیں تو ڈاکٹر طاہرہ جیسی بہادر لکھنے والی آنکھ کھول کر زمین اور فلک دونوں کو دیکھتی ہیں، پھر اپنی کالم نگاری کی ہنڈیا میں ایسے مسالے ڈالتی ہیں کہ پریشر ککر کے ڈھکن اڑ کر دور جا گرتے ہیں، شوں شوں سے رولا پڑ جاتا ہے اور لوگوں کے لئے انہیں نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہتا۔

جس معاشرے میں معاشی انصاف اور مساوات نہ ہو، مرد مگرمچھ بن کر عورت کی شخصی آزادی اور زندگی ہڑپ کرنے کو تیار رہتے ہوں، وہاں طاہرہ اور مجھ جیسی کالی بلیاں بساط بھر ان کا راستہ روکنے کی کوشش کرتی رہیں گی ہم انتظار کریں گے اس صبح کا جب ہمارا سماج انسانی حقوق کی دستاویزات مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی تھمائے گا۔ اور وہ اپنے جسم اور اپنی زندگی کی خود مالک و مختار ہوں گی۔

عورتیں کی تقدیر کنول پھول کی صورت مڑے تڑے پاؤں اور لڑکھڑاتی ہوئی چال نہیں، کائنات کے اس پھول کو کھلنے کے لئے پوری دھرتی چاہیے۔ عورت کے تتلی جیسے مضطرب پنکھ تو ہوتے ہی اڑنے کے لئے ہیں، اگر ہمارے بیچ ایسے شعور نے جڑیں پکڑلی ہیں جیسا ہم ڈاکٹر طاہرہ کاظمی کی تحریروں میں دیکھ رہے ہیں تو انہیں اڑنے، اپنی صلاحیتیں آزمانے اور اپنی ذات کو منوانے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔

نیلم احمد بشیر -

آگ دوڑی رگِ احساس میں گھر سے پہلے

طاہرہ کاظمی کے کالموں میں ایک نئے انداز کی بیتابی ہے جس میں رکھ رکھاؤ بھی ہے اور تہذیبِ نفس بھی۔ ہر قدم پر جبر و تشدد کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے طوفان بننے کا عزم ہے۔ عزم و عمل کی آندھی بن جانے کا پیغام ہے۔ دکھ درد کا احساس بھی ہے لیکن اجتماعی شعور کے ساتھ ذاتی اور انفرادی دکھ کی ہمیشگی کا اظہار ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے شاعر عیسیٰ کی طرح اپنی پروانہ کرتے ہوئے صلیب پر لٹکتے ہوئے بھی سب کے لیے دعائے خیر کر رہا ہو۔ تخلیقی وفور سے سرشار ذہن و فکر کے لیے کچھ ایسی کیفیات کا ورود لازم ہے جو کالم نگار کو مجبور کر دیتی ہیں کہ وہ انہیں قلمبند کرے۔ روز مرہ کی اخباری خبروں سے اثر پذیری کے لمحات، بطور ایک عورت، ان کا ذات سے کائنات تک کا تخلیقی سفر ہے لیکن اس سفر میں کئی بار ایسے بھی ہوتا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی ظلم و ستم کی چکی میں پستا ہوا نابالغ بچہ یا بچی یا بے سہارا عورت ایک علامت بن کر ابھرتے ہیں اور گویا صدیوں کی بے زبانی کو زبان دیتے ہوئے سرد آہوں کے مدھم سلسلے سے چیخ و پکار کی سمفنی بنتے چلے جاتے ہیں۔

کوئی تخلیق، موضوع اور مضمون کے انتخاب کے علاوہ، شاعر کی زباندانی یا لسانی اہلیت کی ایک معتبر گواہ ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ بات کیسے یا کس طرح کی جاتی ہے بجائے اس کے کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ میں نے جب کبھی اپنی تحاریر کا لیکھا جوکھا کیا ہے (جو کہ ایک بہت مشکل امر ہے) میں نے محسوس کیا ہے کہ جیسے ایک عمارت کا نقشہ بنا رہا ہوں۔ اس میں سامنے والا باغیچہ ہے۔ اس میں ایسے پھولوں، پودوں کا استعمال کیا جاتا ہے جو اظہار کے عمل کو تصویری مفہوم فراہم کرتا ہے اور زبان اپنی طرف قاری کی توجہ خود ہی مبذول کروا لیتی

ہے۔ یعنی جس موثر طریق کار سے زبان کار کھ رکھاؤ خارج کے تناظر میں نہیں، بلکہ خود اپنے آپ میں قاری کے دھیان کو سمو کر، اسے آگے پڑھنے پر مجبور کر دیتا ہے، وہ طریق کار بآسانی بروئے کار لاتے ہیں اور اس طرح قاری کو اپنی تحریر کی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔

طب کے پیشے سے متعلق طاہرہ کا ظمی جذبات کو الفاظ میں پرو کر ان کے نشتروں کو ایک ماہر سرجن کی طرح استعمال کرتی ہیں۔ بیشتر کالموں کے عنوانات ہی اس بات کی گواہی فراہم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، "کیا اللہ نہیں جانتا تھا کہ عورت کو کون سے اعضا بخشے"، "وفی اور پھنسی"، "مجھے اپنی بیٹی کو قتل کرنا ہے" اور پھر "عورت ریپ کیوں ہوتی ہے؟"

ستیہ پال آنند

پاکستانی عورت غاروں میں نہیں رہتی!

سوا نیزے پہ سورج، لق ودق صحرا، ریتلی زمین کے بیچوں بیچ سیدھی چمکتی سڑک! ٹیکسی دوڑتی جا رہی تھی، ام کلثوم کی آواز اپنا جادو جگا رہی تھی، ڈرائیور جھوم رہا تھا اور وہ چار مسافر کسی بحث میں الجھے تھے۔ پچھلی نشست پر تین مرد اور ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پہ ایک خاتون!

سفر کا آغاز دمشق سے ہوا تھا اور منزل اردن کا دارالخلافہ عمان تھی!

یہ ان دنوں کی کہانی ہے جب ہم سعودی عرب کے شہر تبوک میں قیام پذیر تھے۔ اردن سے آنے والی ٹھنڈی ہوائیں خبر دیتی تھیں کہ ہم سرحدی علاقے میں رہتے ہیں۔ مہم جو طبیعت نے دل میں دبی خواہش کو ہوا دینی شروع کی کہ کیوں نہ سرحد پار صحرا نوردی اور سرزمین انبیا کو دیکھنے کی کوشش کی جائے۔ خواہشات کی پوٹلی اگر کھولی جائے تو مجھے پنڈورا باکس ہی کھل جایا کرتا ہے۔ اردن یاترا کی کونپل نے سر اٹھایا ہی تھا کہ دل میں ایک اور خیال اتر آیا۔ دنیا کی قدیم ترین تہذیب بھی تو کچھ زیادہ دور نہیں، بس تھوڑا سا فاصلہ اور... اور پھر دمشق!

لیجیے، خیال سے ہی رگ وپے میں چنگاریاں پھوٹنے لگیں اور ہم دمشق کے خواب کھلی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔ ویزا کے مراحل ریاض میں دونوں ملکوں کے سفارت خانوں میں ہسپتال کے تعاون سے حل ہوئے، دشوار مرحلہ تھا لیکن سر ہوا۔

اگلا مرحلہ تو دشوار ترین تھا۔ صاحب پاکستان میں تھے اور بچے چھوٹے، سو سیاحت کے شوق کا پتھر ہمیں اکیلے ہی اٹھانا تھا۔ سمارٹ فون، گوگل میپس کا زمانہ تو تھا نہیں کہ اجنبی سرزمین کی گلیاں بھی ہتھیلی میں سمٹ آئیں سو ہمیں باقاعدہ منصوبہ بندی کرنا تھی۔

ڈاکٹروں کے حلقہ احباب میں کسی نے یہ سفر نہیں کیا تھا باوجود اس کے کہ سالہا سال سے تبوک میں موجود تھے۔ سب ہمارے عزم کا سن کے کچھ حیران تھے اور کچھ پریشان۔ لبوں پہ ایک ہی دبا دبا سا سوال تھا

"اکیلی؟"

اور ہم بڑے اعتماد سے جواب دیتے "جی اکیلی، آخر دنیا میں اکیلے آئے اور اکیلے ہی جانا ہے"

ڈیپارٹمنٹ میں کچھ ساتھی ڈاکٹروں کا تعلق اردن اور شام سے تھا اور وہ سب بہت پرجوش کہ ہم ان کی سرزمین دیکھنے کے متمنی ہیں۔ لیجیے جناب، کچھ انٹرنیٹ کی مدد اور کچھ زبانی کلامی معلومات سے ایک کتابچہ برائے اردن وشام تیار کر لیا گیا۔

تینوں بچوں کے ساتھ گھر میں ہماری انڈونیشی مددگار موجود تھی اور کسی ناگہانی سے نمٹنے کی ذمہ داری ہماری دوست ڈاکٹر نصرت اور ڈاکٹر شازیہ نے بہت خوشدلی سے قبول کر لی۔

معلومات کا حاصل یہ تھا کہ تبوک، اردن اور دمشق کے درمیان بہت آرام دہ بس سروس چلتی ہے۔ تبوک اور دمشق کا فاصلہ 650 کلومیٹر ہے، اور درمیان میں دو سرحدیں پار کرنی پڑتی ہیں۔ تبوک سے دمشق کے لئے بس شام چھ بجے چلتی ہے اور اردن سے ہوتی ہوئی صبح چھ بجے دمشق پہنچ جاتی ہے۔

ٹکٹ بک کروائی گئی، سامان پیک کیا، ایک سفری بیگ میں اہم دستاویزات سنبھالیں۔ پاکستان فون کر کے اماں سے امام ضامن بندھوانے کے ساتھ ساتھ جھڑکیاں کھائیں کہ اماں دو باتوں سے بہت مضطرب تھیں۔ بچے گھر میں اکیلے تھے اور ہم اجنبی سرزمینوں کو اکیلے سر کرنے جا رہے تھے۔ اب کیسے کہتے کہ ان سرزمینوں کی کشش ہمیں چین نہیں لینے دیتی تھی۔ صاحب کو فون پہ خدا حافظ کہنے کے ساتھ ایک طویل احتیاطی تدابیر کی یاددہانی سنی، بچوں کو پیار کیا، ان کی آیا کو کچھ باتوں کی پھر سے تلقین کی اور یوں گھر سے رخصت ہوئے۔

وہ ایک لمبا سفر تھا لیکن بہت آرام دہ۔ بس میں کچھ مسافر سو رہے تھے، باقی اونگھ رہے تھے۔ تبوک اور اردن کی سرحد شام کے ملگجے اندھیرے میں پار کی گئی جبکہ اردن اور سریا (دمشق) کے لئے یہ مرحلہ رات کے پچھلے پہر آیا۔

سب سرحدیں ایک سی ہوا کرتی ہیں، ویرانے میں بنی کچھ عمارات، بیزار لیکن چوکنے سرحدی محافظ، مسافروں کی قطاریں، بیریئر، سامان کو سونگھتے تربیت یافتہ کتے اور بد حواس مسافر!

ساری رات بس ویرانوں میں دوڑتی رہی اور پو پھٹنے پہ دنیا کی قدیم ترین تہذیب نے ایک اکیلی، تھکی ماندی سیاح کو اپنی زمین پہ قدم رکھتے دیکھا۔ دل ہی دل میں تھوڑی سی خائف لیکن اشتیاق چہرے سے چھلکتا ہوا!

دمشق دیکھنے کی کہانی تو آپ کو پھر کبھی سنائیں گے، ابھی تو ہم دمشق سے رخصتی اور عمان تک کے سفر کی داستان کہنے بیٹھے ہیں۔ تبوک سے تو ہم نے دمشق تک کا ٹکٹ خریدا تھا لیکن واپسی پہ چونکہ ہمیں اردن کے دار لحکومت عمان رکنا تھا، سو ہمیں بتایا گیا تھا کہ پہلے سے ٹکٹ لینے کی ضرورت نہیں۔ ہوٹل سے نکلتے ہوئے جب ہم نے استقبالیہ سے عمان کو جانے والی بس کے ٹرمینل پہ پہنچنے کا پوچھا تو ڈیسک کلرک جو پچھلے تین دن سے آتے جاتے ہمارا تفصیلی انٹرویو کر چکا تھا اور وجہ وہی تھی کہ اکیلی سیاح عورت، کہنے لگا آپ مسافر ٹیکسی پہ عمان چلی جائیے، آپ کے لئے بہتر رہے گا۔

اس کی ہدایات پہ عمل پیرا ہو کے ہم بین الاقوامی ٹیکسی سٹینڈ پہنچے۔

ایک طرف بیروت جانے والی ٹیکسیوں کی قطار تھی اور دوسری طرف عمان کو جانے والی کار نما ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ ہر ٹیکسی میں چار مسافروں کی گنجائش تھی، ڈرائیور کے ساتھ ایک اور پیچھے تین نشستیں۔ ہم نے ٹکٹ گھر سے ایک ٹکٹ خریدا اور بتایا کہ ہم کار کی اگلی سیٹ پہ بیٹھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ خوش قسمتی سے عمان جانے والی اگلی ٹیکسی پہ ایک مسافر کی جگہ خالی ہے اور ہم اگلی نشست لے سکتے ہیں۔

وہ فورڈ کار تھی جس کے باہر ٹیکسی ڈرائیور آخری مسافر کے انتظار میں کھڑا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اس کے گرد تین اور مسافر بے چینی سے ادھر ادھر دیکھتے تھے،

تینوں سفید فام دکھتے تھے۔ ہمارے قریب پہنچنے پہ ڈرائیور نے ہمیں گھورا، ٹکٹ پکڑا، بغیر کچھ کہے ہمارا بیگ ڈکی میں ڈالا، اور ہمیں اشارہ کیا کہ ہم اگلی نشست سنبھال لیں۔ ڈرائیور کے ساتھ ساتھ باقی تینوں بھی بیٹھ چکے تھے اور ہمارا سفر شروع ہو چکا تھا۔

ہم دمشق کو بہت سی یادوں کے ساتھ الوداع کہہ رہے تھے!

ٹیکسی دمشق کی سڑکوں پہ گھومتی شہر سے باہر نکل چکی تھی۔ اب صحرا کے بیچوں بیچ ہم نے چار گھنٹے کا سفر اور سرحد پار کر کے عمان پہنچنا تھا۔

ہم اپنی سوچوں میں گم تھے، دمشق میں گزرا ہوا وقت ماضی بننے جا رہا تھا، جب ہم نے پچھلی نشست سے کسی کو انگریزی میں مخاطب کرتے سنا،

"معاف کیجیے گا کیا ہم بات کر سکتے ہیں"

اور ہمیں بات کرنا تو کبھی بھی مشکل نہیں رہا،

"ضرور"

"آپ برا تو نہیں منائیں گی اگر ہم پوچھیں کہ آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟"

مہذب لہجے میں سوال تھا

ہم مسکرائے اور ہم نے وہ کرنے کا سوچا جو ہم ماضی میں کئی دفعہ کر چکے تھے۔

"کیا آپ اندازہ لگانا چاہیں گے کہ ہمارا کس رنگ و نسل سے تعلق ہے؟" ہم نے کہا۔

اثبات میں جواب ملنے کے ساتھ تعارف ہوا۔ ایرک کا تعلق نیو یارک سے اور وہ الیکٹرانکس انجینئر تھا۔ مائیکل جرمن ڈاکٹر اور جرارڈ ساؤتھ افریقین جیالوجسٹ تھا۔ تینوں کی ملاقات دمشق میں اتفاقاً ہوئی تھی، چونکہ سیاحت اور اگلی منزل قدر مشترک تھی سو تینوں اکٹھے ہو لیے تھے۔

تینوں تعارف کروا چکے تھے اور اب وہ ہماری قومیت بوجھنے کے لئے تیار تھے۔

"ساؤتھ امریکہ... برازیل، وینزویلا؟"

ہم نے نفی میں سر ہلایا

"سپین؟" تینوں سپین کہتے ہوئے کافی پرجوش تھے۔

ہم نے پھر ناں کہہ دی، اب تینوں سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ دیر بعد خاموشی ٹوٹی۔

"اٹلی؟"

ہمیں ہنسی آ گئی، ان کی پرواز خیال ایشیا کو اکیلی عورت سیاح کے ساتھ تصور کرنے سے عاری تھی۔

"ہم پاکستانی ہیں" ہم نے اور صبر آزمانا مناسب نہیں سمجھا۔

"پاکستانی۔" تینوں کے حلق سے حیرت بھری آواز نکلی۔

"کیا پاکستانی عورت کو اکیلے گھومنے کی اجازت ہے؟ کیا پاکستانی عورت پڑھنے لکھنے اور نوکری کرنے کے لئے آزاد ہے؟ کیا آپ کی فیملی ہے؟ آپ یہاں تک کیسے پہنچیں؟ کیا سفر کرتے ہوئے کبھی کسی مشکل کا شکار ہوئیں؟"

سوالوں کی بوچھاڑ تھی،

ہم نے سب کچھ بہت اطمینان سے سنا اور پھر ان کی ادھوری معلومات میں اضافہ کرنے کا سوچا۔

ہم نے انہیں فاطمہ جناح کا بتایا جو آزادی کی تحریک میں قائد کے شانہ بشانہ چلیں اور پھر پیرانہ سالی میں ایک آمر کا ڈٹ کے مقابلہ کیا۔ ہم نے انہیں اردن کے پرنس شاہ حسن کی بیوی ثروت کا بتایا جو آکسفورڈ میں ان کے ساتھ پڑھتی تھیں۔ ہم نے انہیں بے نظیر بھٹو کا بتایا جو اس وقت تک دو دفعہ وزیراعظم رہ چکی تھیں اور اسلامی دنیا کی پہلی خاتون وزیراعظم تھیں۔ ہم نے ان تمام عورتوں کا بتایا جو اپنے خوابوں کا تعاقب کرتی ہیں۔

ہم نے انہیں بتایا کہ دنیا ہمیں طالبان جیسا، از منہ قدیم کی روایات کا قیدی جانتی ہے لیکن حقیقت ہمیشہ وہ نہیں ہوتی جو دکھا کرتی ہے۔ یہ بات بجا کہ ہمارا تعلق پدرسری معاشرے ہے جہاں اسلام کی آڑ میں عورت کو محصور رکھ کے اس کی زندگی کا مصرف مرد کی طے کی ہوئی زندگی گزارنا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ہم اور ہمارے جیسی بہت اور روایات میں گندھی معاشرت کے سامنے سر جھکانے کی بجائے اپنا جہاں خود تخلیق کرتی ہیں، پاؤں تلے زمین اور سر کے اوپر اپنا آسمان۔

ہم نے ان تینوں کی پریشانی وحیرت کے تاثرات کو بدلتے دیکھا۔ پاکستانی معاشرے کی ایک عورت نے انہیں دلائل سے قائل کر لیا تھا کہ پاکستان غاروں کے زمانے میں سانس نہیں لیتا اور پاکستانی معاشرے کی عورت اہل بھی ہے اور کائنات کی ہر شے میں برابر کی حصے دار بھی!

عمان آچکا تھا اور ہم ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ رہے تھے!

عورت کا اپنا آسمان

"لڑکیوں کو علم کے زیور سے آراستہ کرو، اعلیٰ تعلیم دلواؤ، زندگی میں سر اٹھا کے چلنے کے قابل بناؤ"

ابا اونچی آواز میں برس رہے تھے، بیٹی کی شادی کا نیوتا دینے والے مہمان سر جھکا کے بیٹھے تھے، اماں زیرِ لب مسکرا رہی تھیں اور ہم اپنی کتاب میں گم تھے۔

"کیا کام آئے گا یہ سونے چاندی کا زیور۔ کیا ضرورت ہے چھوٹی عمر میں شادی کی۔ ارے پڑھاؤ انہیں، اپنے قدموں پہ کھڑا کرو انہیں۔ بھلے لڑکے پڑھیں یا نہیں، پروا نہیں۔ مزدوری کر کے بھی پیٹ پال لیں گے۔ پر بیٹی!

کیا کرے گی بیٹی اگر مشکل وقت آیا تو۔ ماں باپ سدا ساتھ نہیں رہتے۔ اگر خدا نخواستہ بیوہ ہو جائے، طلاق مل جائے، کیا کرے گی آخر؟

بھائی کی دہلیز پہ بے کسی کی زندگی گزارے گی کیا؟ بھائی کے ہاتھ کی طرف دیکھے گی کیا اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے؟

ارے اسے اپنا آسمان دو، اپنا آسمان"

یہ تھے میرے ابا!

میری زندگی کا پہلا مرد، میرا باپ اور انتہا درجے کا فیمینسٹ!

ہمارے دبلے پتلے، گورے چٹے ابا، پنجاب کے گاؤں کے رہنے والے، ایک چھوٹے زمیندار کی اولاد پر ایک راز بچپن میں ہی جان گئے، ترقی کے لیئے علم کی سیڑھی لازم۔

یہ سبق پڑھ کے اپنے گاؤں سے نکلے اور پھر پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا۔ زندگی نے انہیں کئی اور سبق پڑھائے جن پر انہوں نے کامیابی سے عمل بھی کیا۔

ہمیں یہ نہیں معلوم کہ معاشرے کے چلن کے برعکس وہ عورتوں کے حقوق اور آزادی کے اتنے شدید حامی کیسے اور کب ہوئے لیکن بقول اماں کے کچھ تو شروع سے ہی زمین نم تھی کہ انہیں پڑھی لکھی اور بااعتماد عورت سے مکالمہ کرنا اچھا لگتا تھا جس کے پاس مرد کی آنکھ میں آنکھ ڈال کے جواب دینے کا حوصلہ ہو اور جو کسی استحصال کا شکار نہ ہو۔

اور اس مزاج کے ساتھ جب انہوں نے اپنی سگی بہن کو کچھ عرصے کی شادی کے بعد بیوگی کی زندگی گزارتے ہوئے بھائیوں اور بھابیوں کا محتاج ہوتے دیکھا تو اپنی آئیڈیالوجی پہ ایمان مزید پختہ ہو گیا۔ ہمارا سید خاندان اور بیوہ کے ذمے خاندان کی عزت، کہ دادا کا یہی خیال تھا۔ ہمارے فیمینسٹ ابا اس کو ماننے سے انکاری سو باپ بیٹا ایک عورت کی خاطر آمنے سامنے۔

ابا نے اس سارے معاملے میں معاشرے کا وجود تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور دادا کے پرزور احتجاج کے باوجود اپنی بہن کی مرضی جاننے کے بعد ان کی دوسری شادی اور رخصتی اپنے گھر سے کی اور چشم فلک نے دیکھا کہ ہماری پھوپھی مرتے دم تک اپنے بھائی کی شکر گزار رہیں۔

لڑکی اور پڑھی لکھی، ان کی آنکھیں خیرہ کرتی تھیں۔ لڑکی کو ہر وہ چیز حاصل ہونی چاہیے جو اس گھر کے لڑکے کو ملے، چاہے وہ خوراک ہو، تعلیم ہو، آزادئ رائے ہو، وراثت ہو یا اپنی ذات کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق۔

ہماری بہن نے اس حق کو استعمال کرتے ہوئے ان کے انتہائی قریبی عزیز کے رشتے کو ٹھکرایا، کسی نے ایک شکن بھی ان کے ماتھے پہ نہ دیکھی۔ ہم نے غیر نصابی سرگرمیوں کے سلسلے میں پورا پاکستان گھوم لیا، ریڈیو، ٹی وی میں جھانک لیا، ان کو سب قبول ہوا۔

ہمیں میڈیکل کالج میں داخل کرواتے وقت ان کے وجود پہ فرحت و انبساط کی وہ کیفیت کہ بیان سے باہر۔ چہیتی بیٹی سے جدائی اور دوسرے شہر میں اکیلے رہنے کے خدشات،

کچھ بھی آڑے نہ آیا۔ ہر مہینے ہمارے اکاؤنٹ میں سب لڑکیوں سے پہلے پیسے آتے۔ ہر ہفتے ان کی مخصوص لکھائی والا خط کا لفافہ اور یہ معمول جاری رہا پانچ برس۔

ڈاکٹر بن کے ہماری نوکری اور سپیشیلائزیشن میں وہ ہم سے بڑھ کے شوقین۔ ہمارے ہر امتحان پاس کرنے کا تحفہ پہلے سے تیار۔

شادی ہوئی تو طلاق کے نظریے کو اجاگر کرتے ہوئے، بلا مشروط محبت اور سپورٹ کی یاددہانی کرواتے ہوئے۔

اور یہ ایک مسوجنسٹ معاشرے کے مرد کا تحفہ تھا اپنی بیٹی کے لئے، غیر مشروط تحفہ!

بیٹی کو بوجھ سمجھے جانے والے معاشرے میں ایک سچ اور حق کی صلیب اٹھائے ہوئے مرد کا تحفہ!

اب ایسے فیمینسٹ ابا کا قرض کیسے ادا کرتے؟

لوگ بارہا پوچھتے ہیں کہ اپنے حقوق کی اتنی شدید آگہی اور سربلند رکھتے ہوئے ان کے لئے اپنی آواز معاشرے میں پھیلانا، یہ کہاں سے سیکھا؟

کیسے بتاؤں کہ روشنی نے سفر کرنا ہی ہوتا ہے، روشنی اور آگہی فنا ہو نہیں سکتے۔ جو اس رستے پہ ایک دیپ جلاتا ہے اس کے پیچھے آنے والوں کو یہ چراغ روشن کرنے ہی ہوتے ہیں۔

ہم اپنے ابا کی محبت اور خود آگہی کے جس سبق کو پڑھ کے بڑے ہوئے تھے، اب ان چراغوں کی لو تو بڑھانی ہی تھی نا کہ ایسے ہی سحر ہوا کرتی ہے۔ ایسے ہی ظلمت کے اندھیروں کو دور کیا جاتا ہے۔

سو یہ دیے روشن کیے اپنی بیٹی کی آنکھوں میں اور علم کی چاہت کی شمع اس کے دل میں۔ یہ پوری دنیا اس کے لیے خلق ہوئی ہے اور اس کی پرواز کا میدان ہے، کا سبق سکھا دیا۔

اور آج میرے سامنے وہ آہستہ آہستہ سٹیج کی طرف بڑھ رہی ہے۔ کاسنی گاؤن پہن رکھا ہے، سر پہ مخصوص ٹوپی ہے اور دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں میں سے ایک، نیویارک یونیورسٹی!

یہ براڈوے پہ بیکن تھیٹر کی عالیشان عمارت ہے۔ ایک طرف بینڈ دھنیں بکھیر رہا ہے۔ فضا میں سرور ہے، خوشی اور انبساط کی لہریں ہیں۔ گریجوئیس کے چہرے خوشی اور کامیابی کی لو سے دمک رہے ہیں۔ زندگی نے علم اور کامیابی کے پر عطا کر دیئے ہیں اور اب پرواز ہو گی شوق کی، چاہت کی جس کا کوئی انت نہیں۔

ہال میں بھانت بھانت کی دنیا ہے اور ستتر ملکوں کے طالب علموں کے ماں باپ ایک لمبی مسافت کے بعد یہاں موجود ہیں۔ سفر کی تھکان ماند پڑی جاتی ہے اس غرور سے، جس کے کارن دنیا کو علم کی روشنی سے بہتر جگہ بنانے کے لئے اپنا ایکٹ ان سب نے کھیلا ہے۔

آج اس دن کو یاد کرنے کا موقع ہے جب ان کی انگلی پکڑ کے ان ستاروں نے سفر کا آغاز کیا تھا، گو کہ یہ پیاس بجھنے والی نہیں پر ایک اہم سنگ میل ضرور پار ہونے کو ہے۔

سٹیج پہ فیکلٹی ممبران اپنے مخصوص لباس میں بیٹھے ہیں۔ فخر سے گردنیں تنی ہیں۔ پیغمبری پیشہ اختیار کرنے والے فخر اور غرور کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ایک اور سال علم و آگہی پھیلانے کے سفر میں گزر گیا، زندگی نے ایک اور ورق پہ رنگ بکھیر دیئے۔

ہمیں مبارک دیجیئے، ہم نے پدر سری معاشرے میں ایک عورت کو پاؤں رکھنے کو زمیں دی ہے اور سر پہ آسماں !

حمل سرا سے مرد کا بلاوا اور عورت کا گناہ

ڈاکٹر فرحت ہاشمی کا بصیرت افروز لیکچر جس میں مرد کے بلاوے پر عورت کے انکار کی پاداش میں ارواح قدسی کی لعنت کی وعید دی گئی تھی، سن کر یقین جانیے، روح تک لرز گئی۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، ٹھنڈے پسینے آنے لگے، رونگٹے کھڑے ہو گئے اور ہمیں ماضی کی اپنی سب کج آرائیاں یاد آنے لگیں۔

تب سے ہم یہ بیٹھے سوچ رہے ہیں کہ نہ معلوم اب تک فرشتوں کی لعنت والے رجسٹر کا وزن کیا ہو چکا ہو گا اور کیا ہمارے کچھ نیک اعمال، جن پر ہمیں عالم غفلت میں اچھا خاصا بھروسہ رہا ہے، ڈاکٹر فرحت ہاشمی کے بیان کردہ نادانستہ گناہوں کا وزن کم کرنے میں مددگار ہوں گے یا مرد کے بلاوے پر انکار کا گناہ بھاری پڑے گا۔

مرد کا بلاوا تو کچھ ایسا یک طرفہ بندوبست ہے کہ ہمارے لئے قریب قریب ایک اجنبی تصور ہے۔ ہمیں تو کائنات کے دو ٹکڑوں میں اس کشش کا علم ہے جسے نیوٹن نے دریافت کیا تھا اور جس کی کیفیت کو ثنااللہ میراجی نے "سمندر کا بلاوا" کے عنوان سے نظم کیا تھا۔ ابتدائی سطریں آپ بھی پڑھ لیجئے

یہ سرگوشیاں کہہ رہی ہیں اب آؤ کہ برسوں سے تم کو بلاتے بلاتے مرے
دل پہ گہری تھکن چھا رہی ہے
کبھی ایک پل کو، کبھی ایک عرصہ صدائیں سنی ہیں مگر یہ انوکھی ندا آرہی ہے
بلاتے بلاتے تو کوئی نہ اب تک تھکا ہے نہ آئندہ شاید تھکے گا

اب آپ ہماری خوش فہمی کا تو کچھ نہیں کر سکتے جو ہمیں رشتوں میں تو نہیں، انسانیت میں تولتی ہے اور بنیادی انسانی تقاضوں کا اس دنیا میں حقدار قرار دیتی ہے۔

ڈاکٹر فرحت صاحبہ کا معاشرے میں ایک مقام ہے۔ پر جوش عقیدت مند ان کے فرمودات ملک کے گوشے گوشے تک بڑے جذب دل سے پھیلاتے ہیں۔ سو وہ سب عورتیں جو اب تک اپنے مجازی خدا کی اطاعت کرنے میں سرکشی کی مرتکب تھیں، ان کو سدھرنے کا ایک اور موقع فراہم کر دیا گیا ہے۔

کرنا کیا ہے آخر، دماغ و روح کو قفل ہی تو لگانا ہے اور بلاوے پہ آمنا و صدقنا کہنا ہے۔

لیجیے فرشتوں کی لعنت سے محفوظ!

کچھ عرصہ پہلے ایک خبر دیکھی تھی کہ مغرب کے ایجاد گروں نے چند مخصوص خواہشات کے لئے ایک گڑیا بنائی ہے۔ گڑیا کیا ہے؟ جی بنائی عورت ہے۔ وہی سراپا، وہی لوچ، وہی خوبصورتی، سریلی آواز کی ڈبنگ، جذبات کی آمیزش۔

تو فرق کیا ہے بھائی!

فرق یہ ہے کہ سب کچھ ہے پر خواہش نہیں، خواہش کا اظہار نہیں، اور فریق ثانی کی خواہش سے انکار نہیں۔

بس بیٹری میں سیل ڈالنے کی دیر ہے!

یوں سمجھ آتا ہے، اس گڑیا کا ڈیزائن ڈاکٹر فرحت کی بیان کردہ عورت کو دیکھ کے بنایا گیا ہے۔ جسے صرف بلایا جاتا ہے اور بس بلایا ہی جاتا ہے۔ خواہش و اقرار و انکار کی تو گنجائش ہی نہیں۔

دیکھیے ہم ویسے ہی مغرب کی ایجادات سے مرعوب ہوتے رہتے ہیں۔ اور اب سمجھ میں آتا ہے کہ وہ تو معتقد ہیں ہمارے معاشرے میں پائے جانے والے مثالی نمونوں کے۔ اور ویسا ہی ڈیزائن بنا کے پیش کر دیتے ہیں اپنے معاشرے کے مردوں کی تفنن طبع کے لئے جو ہمارے مشرقی معاشرے میں مرد کو دستیاب نہیں اور جنہیں بلاوے کی آسان سہولت میسر نہیں۔

ہمیں ایک اور فکر بھی لاحق ہو چکی ہے۔ کچھ ایسا ہے کہ ہمارا پیشہ ہے غیر پوشیدہ کے ساتھ پوشیدہ امراض کا علاج کا، سو ہم ہر صورت حال کو باریک بینی سے کھنگالنے کے عادی ہیں۔ اب تک کی معلومات کے مطابق شوہر کے بلاوے کا ذکر ہے اور انکار پہ فرشتوں کی بے شمار لعنت کا۔

اب پوچھنا یہ ہے ڈاکٹر صاحبہ سے کہ فرشتے تب کیا کرتے ہیں جب مہینہ بھر بلاوا ہی نہ آئے۔ یا پھر دوسری صورت میں بلاوے کی اہلیت ہی نہ ہو جیسا کہ ملک عزیز میں سڑک کنارے لگے تفصیلی اشتہار اس درون خانہ راز پہ کافی روشنی ڈالتے رہتے ہیں۔

کیا کچھ ایسا بندوبست بھی ہے کہ فرشتے خواتین کی ہمدردی میں اپنی لعنت کی توپوں کا رخ دوسری طرف موڑ دیں؟ اور اگر ایسا ہے تو اس صورت میں لعنت و ملامت کا دورانیہ کیا ہو گا؟ حکیم صاحب کی معجون اور کشتوں کے استعمال کا عرصہ بھی شامل کیا جائے گا یا بوجوہ یہ مدت ساقط قرار دی جائے گی۔

ہماری ایک مریضہ کو شادی کے بعد پتہ چلا کہ صاحب کی اہلیت ہی کچھ ڈانواں ڈول ہے۔ بلاوا ہی کوئی دو تین ماہ کے بعد آتا تھا۔ پھر بھی صاحب کبھی مان کے نہ دیے کہ کہیں کچھ خلل ہے۔ وہ اس تاخیری بلاوے کو بھی کسی ثواب کے مسائل سے جوڑے بیٹھے تھے۔

اور ایسی تو بہت سی خواتین دیکھیں جن کے نصف بہتر شروع میں ہی قدموں میں بیٹھ کے اقرار کر لیتے کہ وہ قابل تو نہیں ہیں لیکن خاندان نے ان کی ایک نہیں سنی اور اب ان کی عزت نئی نویلی دلہن کے ہاتھ ہے۔ خواتین نے تو مرد کی نام نہاد عزت کا بوجھ اٹھانا ہی ہوتا ہے، تو یوں ہوا کہ لب سی کے زندگی گزار لی۔

عصمت چغتائی کا " لحاف " ایسی بہت سی کہانیوں کا آئینہ ہے۔

چلتے چلتے آپ کو ایک جی دار خاتون کی بات سنا دیں۔ ناک میں دم تھا، دن کو چکی کی مشقت اور رات کو بلاوے پہ بلاوا۔ انکار کی صورت میں زمین پہ مجازی خدا کی ملامت تھی اور آسمانوں سے پرے فرشتوں کی ساری رات پھٹکار کی نوید بھی۔

ایک دن تنگ آ کے بول ہی پڑیں " چلو ہمارا نام ہی لیں گے نا فرشتے، چاہے کسی مد میں لیں۔ رہی بات عذاب و ثواب کی، تو ابھی کون سا سکون میں ہیں ہم "

ہمیں یقین ہے کہ خالق کائنات، جو رحمان و رحیم اور عادل و ارفع ہے۔ آسمانوں پہ مقیم اپنی پاکیزہ و اعلیٰ مخلوق کو حقارت و تنفر جیسے جذبات کے حوالے نہیں کر سکتا۔ اپنی ہی بنائی ہوئی اور زمین کے طوفانوں کا سامنا کرتی ہوئی ایک اور مجبور مخلوق پہ لعنت بھیجنے کے لئے۔

اسے آپ ہمارا حسن ظن سمجھنا چاہتے ہیں تو سمجھیے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں!

کمسن تتلیوں کے رنگ، لہو اور یوم حساب

امرتا پریتم کہتی تھیں "ہمارے خطے کے مرد نے عورت کے ساتھ سونا سیکھا ہے، جاگنا نہیں"

اور ظاہر ہے سونے کے لیئے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی، بس ایک بچی یا لڑکی یا عورت نما مخلوق ہونی چاہیے!

قومی اسمبلی میں تین پرجوش مردوں کو کم عمری کی شادی کے خلاف کھڑا دیکھ کے تن بدن میں ایک آگ سی لگ گئی ہے۔بقول ان حضرات کے، کم عمری کی شادی اسلام کے عین مطابق ہے۔

اسلام کی آڑ میں نفسانی خواہشات پہ جان دینے والوں کو میرا اسلام۔

بلوغت بلوغت کی رٹ لگانے والے ان پھسڈی کم علموں کو معلوم ہے کہ بلوغت آخر ہے کیا؟

میڈیکل سائنس یہ کہتی ہے کہ بلوغت (puberty) کا قطعی یہ معنی نہیں کہ جسم میں کچھ ظاہری تبدیلیاں اس فرد کو جسمانی، دماغی، جنسی اور جذباتی طور پہ بھی پختہ کر دیں۔ بلوغت نام ہے ایک ایسے دور کا جو محیط ہے کم وبیش آٹھ سے دس سال پہ، جو فرد کو تعلیم و آگہی کا زیور دے کر آنے والے برسوں کے سرد و گرم سہنے، ذمہ داریاں نبھانے، اور اگلی نسل کو پروان چڑھانے کے قابل بناتا ہے۔

ان برسوں میں نئے نئے ہارمون پیدا ہوتے ہیں، انسانی اعضا مضبوطی پکڑ رہے ہوتے ہیں، ذہن بچپن اور سمجھداری کے سنگم پہ کھڑا ہوتا ہے، جذباتی کشمکش عروج پہ ہوتی

ہے۔ فرد اپنی پہچان کے مراحل سے گزر رہا ہوتا ہے۔ کب ہنسنا اور کب رونا ہے، اس کی سمجھ نہیں ہوتی۔ کس کو دوست ماننا ہے اور کس کو دشمن، پہچان نہیں ہوتی۔ فرد کے اپنی ذات پر کیا حقوق ہیں، اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ کونسا لمس شفقت بھرا ہے اور کونسا نفسانی، جاننا ناممکن۔

جسم اور دماغ کی تکمیل تقریباً عمر کے چوبیسویں برس مکمل ہوتی ہے۔ جسم اپنی بڑھوتری مکمل کرلیتا ہے، ذات میں ٹھہراؤ آنے کے بعد دماغ میں ایک سوچ بن جاتی ہے۔ اس وقت فرد اپنی فکر سے آئیڈیالوجی قائم کرنے، معاشرے میں مثبت اور فعال کردار ادا کرنے، ازدواجی زندگی کے مشکل مراحل سے ہوتے ہوئے، زچگی میں موت کی سرحد کو پار کر کے نئی نسل کو پروان چڑھانے کے قابل بنتا ہے۔

یہ وہ وقت ہے جب لوگ زندگی کے سفر میں واقعی ہم سفر بنتے ہیں۔

ٹین ایج یعنی بیس سال سے پہلے کی عمر انتہائی خطرناک عمر گنی جاتی ہے۔ اسے بچپن اور نوجوانی کے سنگم پہ کھڑے بچوں کے لئے سہل بنانے کے بارے میں دنیا بھر کے سائیکالوجیسٹ بات کرتے ہیں۔ اس عمر کے عذاب سے گزرنے والا بچہ / والی بچی ماں باپ کی ذمہ داری بھی ہے اور ماں باپ کی غیر مشروط سپورٹ کا امیدوار بھی۔

ہمارے معاشرے میں لڑکی کی بلوغت کا صرف ایک مطلب سمجھا جاتا ہے کہ لڑکی کے جسم میں ماہانہ نظام چالو ہو گیا، سو اب وہ جنسی عمل کرنے کے قابل ہے۔ اس قابلیت کو کافی سمجھتے ہوئے جاتی جوانی کو ٹھہرانے کے چاؤ میں عمر رسیدہ و بوسیدہ، دیو قامت، گرانڈیل، گھناؤنے مرد اپنی ہتھیلی پہ رکھی ہوئی چڑیا نما بچی سے تعلق قائم کرتے ہیں۔ اس تعلق کے نتیجے میں وہ بچی کیسے زخم زخم ہوتی ہے، یہ ہمارے معاشرے کے وہ سمجھ دار مرد کیا سمجھیں جو اسمبلی میں چھاتی پھلا کے، مونچھوں پہ تاؤ دے کے اپنے آپ کو اسلام کے سپاہی گردانتے ہوئے اسے عین اسلام قرار دیتے ہیں۔ ان عاقبت نااندیشوں نے اپنی فروعی تشریحات میں اسلام جیسے خوبصورت اور آفاقی مذہب کو ایک ایسی بدصورتی میں بدل ڈالا ہے جہاں ہر راستے پہ عورت کا استحصال کرنے والے فتوے نظر آتے ہیں۔

زمانہ جاہلیت میں زندہ رہنے والوں کی ان لن ترانیاں سن کے محسوس یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے عورت کو اسلام کی روشنی سے گذ مڈ کر کے ایک ایسی بھدی تصویر بنائی ہے جو خلقت دنیا کو حیران سے زیادہ پریشان کرتی ہے۔ اس تصویر میں عورت آج بھی مصلوب ہے۔ چودہ سو سال پہلے پیدا ہوتے ہی زمین میں گاڑی جاتی تھی اور آج بھی جانور نما مرد کی بے حد و دو قیود نفسانی خواہشات کی چادر تلے دفن کی جاتی ہے۔

ہمارے پاس آنے والی ٹین ایج کی تمام حاملہ بچیوں میں ایک بات مشترک ہوتی ہے۔ چہرے پہ بے چارگی، پیلی رنگت، پھٹی پھٹی آنکھیں، روبوٹ جیسی حرکات، کم آواز، چڑیا سا کمزور جسم اور بڑھا ہوا پیٹ، جواب دیتے ہوئے آواز میں لرزش، مدد کے لیئے ساس یا ماں کی طرف اٹھتی ملتجیہ نظریں۔

وہ سمجھ ہی نہیں پاتیں کہ گھر کے آنگن میں کھیلتے کھیلتے، خوابوں کے ہنڈولے میں جھولتے جھولتے وہ کس دنیا کی باسی بن گئی ہیں۔ ان کی عمر کا تقاضا ماں کے کندھے سے لگ کے کپڑے کی بنی ہوئی گڑیاں کھیلنا ہے لیکن سماج نے مذہب کے نام پہ جیتی جاگتی گڑیا گود میں ڈالنے کا بندوبست کر دیا ہے۔

ابھی تو اپنی ذات ہی کی آگہی نہ ہوئی تھی کہ پیٹ میں زندگی آ ٹھہری اور اس زندگی کو دنیا میں لاتے لاتے جسم کی ٹوٹ پھوٹ سے بول و براز پہ اپنا اختیار کھو کے زندہ در گور اور لاچاری کی زندگی جینا روز کی کہانی ہے۔ کتنی لڑکیوں کا انجام دماغی مریض بن جانا، ان کے بچے کیسی کیسی اینگزائی لے کے زندگی کی شاہراہ پہ چلتے ہیں، یہ کوئی نہیں جانتا۔

ہماری ایک دوست جن کا تعلق روایتی مذہبی گھرانے سے ہے، بتا رہی تھیں کہ ان کی برادری میں بیس سال کی عمر تک ہر لڑکی دو تین بچوں کی ماں بن چکی ہوتی ہے اور حوالہ ہمیشہ مطہرات مقدسہ کی کم عمری کی شادیوں کا ہی ہوتا ہے۔ سوائے اس مثال کے (جو کہ ہرگز غیر متنازع نہیں)، ان بے مثال ہستیوں کی علمی قابلیت اور آزادی اظہار رائے کی کوئی تقلید نہیں کرنا چاہتا۔

ہماری اماں کی شادی سولہ سال میں ہوئی۔ ہمارے ابا بہت قدر دان تھے۔ جب اماں بائیس برس کی ہوئیں تو پہلا بچہ پیدا ہوا۔ ساس نند کی بخ بھی نہ تھی۔ ہماری اماں نے بہت

آزاد اور مرضی کی زندگی گزاری۔ اس کے باوجود تمام عمر اپنی سولہ سال کی شادی کے متعلق ناخوشی سے بتایا کہ وہ کتنی خوفزدہ اور اداس تھیں۔ انہیں ساری عمر اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ زیادہ عرصہ نہ رہنے کا افسوس رہا۔ انہوں نے مرتے دم تک اپنے ابا کے گھر کو یاد کیا اگرچہ وہ میرے ابا کے گھر کی بلاشرکت وغیرے مالک تھیں۔

ایک تقریب میں ایک پینتیس سالہ سمارٹ، دل کش خاتون سے ملاقات ہوئی، ساتھ میں اٹھارہ انیس سال کی دو بیٹیاں۔ معلوم ہوا کہ پندرہ سال کی عمر میں شادی ہو گئی تھی۔ وہ بتانے لگیں کہ ان کے شوہر نے ان کا بہت خیال رکھا مگر وہ کبھی اپنی بیٹیوں کو کم عمری میں نہیں بیاہیں گی۔ ان کے مطابق یہ انتہائی خوفزدہ کر دینے والا تجربہ تھا۔

ہم اپنے معاشرے کے تمام مردوں سے جو اس قسم کی ہوس کے پجاری ہیں، التجا کرتے ہیں کہ ان پھولوں کو مت مسلیے، ان تتلیوں کے پر مت توڑیے، ان کے رنگ آپ کے قاتل ہاتھوں پہ رہ جائیں گے اور چھوٹیں گے نہیں۔

ڈریے اس دن سے جب خالق کے حضور یہ رنگ باتیں کریں اور ان باتوں سے لہو کی خوشبو آئے۔

بھیگے پروں والی چڑیا، ہماری بیٹیاں اور مشرق کے منافق دیوتا

کیا آپ نے بھیگے پروں والی چڑیا دیکھی ہے جو حملہ آور کو دیکھ کے تھر تھر کانپ رہی ہوتی ہے۔ اس کی روح آنکھوں میں سمٹ آتی ہے؟

کیا آپ نے جنسی شکار ہونے والی لڑکیوں اور بچیوں کی وحشت بھری چیخیں سنی ہیں؟

کیا کبھی آپ نے سوچا کہ زندگی کو کچھ لمحوں میں ہار جانے والی، ہماری ہی طرح کی جیتی جاگتی انسان تھیں، ان کے خواب ہم سے مختلف نہ تھے؟

کیا کبھی آپ نے سوچا کہ فرشتہ مومند اور زینب آپ کی بچیاں بھی ہو سکتی تھیں؟

کیا کبھی آپ نے ان کی آخری لمحوں کی کشمکش کی اذیت محسوس کرنے کی کوشش کی؟

کیا کبھی آپ نے تصور کیا کہ پامال ہونے والی جب آخری سانسوں پہ ہو گی تو اپنے رب سے کیا گلہ کر رہی ہو گی؟

اے رب کائنات، مجھے عورت کیوں بنایا؟ میں بھی تو تیری ہی تخلیق تھی، مجھے کمتر بنا کے اس طرح بے یار و مددگار کیوں اتار دیا؟

آخر مسئلہ ہے کیا؟ حل کیوں نہیں ہو پاتا؟ معاشرے کی اس سنگین تصویر پہ ہمارا رد عمل کیا ہے آخر؟

کچھ لوگ سنی ان سنی کرتے ہیں، اونٹ کی طرح ریت میں سر چھپا کے سوچتے ہیں جہاں آگ لگی ہے وہ میرا جہاں نہیں!

کچھ درد محسوس کرتے ہیں، لیکن اس سے زیادہ کچھ کرنے کا یارا نہیں!
کچھ دل ہی دل میں شکاری کو برا بھلا کہتے ہیں، اور ریاست کو قصوروار ٹھہراتے ہیں
کچھ ماں باپ کا قصور گردانتے ہیں، کچھ پورن ویب سائٹس کو ذمہ دار سمجھتے ہیں،
اور کچھ جنسی تعلیم نہ ہونے کو ذمہ دار جانتے ہیں۔

پورن ویب سائٹس کو ذمہ دار ٹھہرانے والوں کے باپ وی سی آر کو خرابی کی بنیاد سمجھتے تھے۔ چوری چھپے وی سی آر دیکھنے والوں کے باپ اور چچا ٹیلی ویژن کے لتے لیتے تھے۔ ٹیلی ویژن کی اسکرین کے لئے گھر کی چھت پر بالٹیاں لٹکانے والوں کے بزرگ سینما کو گالیاں دیتے تھے۔ مان کیوں نہیں لیتے؟ تخم ایک ہی ہے اور انکار کی زمین سے اٹھا ہے۔ ایجاد کو روتے ہو، اپنی نارسائی کا نوحہ پڑھا کرو۔

کسی کو عورت کا باہر نکلنا اس کا سبب نظر آتا ہے، کچھ کا خیال ہے کہ یہ سب عریاں لباس کا کیا دھرا ہے۔ ان سے پوچھنا ہے کہ جب ہماری مائیں سات پردوں میں لپٹ کے زندگی کرتی تھیں تو تب تمہاری وحشت انہیں کیسے ڈھونڈ لیتی تھی۔

لیکن ایک بات طے ہے!

سیاست چمکانے کے علاوہ مرد باہر نکل کے سنجیدہ احتجاج کے طور پہ دھرنا دینا پسند نہیں کرتے۔ بھوک ہڑتال پہ بیٹھنا قبول نہیں جاتا۔ کبھی کوئی پنچایت مسئلے کا حل تلاش کرنے نہیں بیٹھتی۔

کیا مسجد کے منبر پہ ازواج مطہرات کا نام لے کے اپنی انگلیاں چومنے والا بتاتا ہے کہ وہ کتنا دکھی ہے اس ظلم پہ؟ کیا محلوں میں اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ ایسے درس شروع کیے جائیں جہاں بتایا جائے کہ ضروری ہے کہ عورت پہ اٹھنے والی نظر طاہر ہو؟

جوان ہوتے بچوں کو بتایا جائے کہ ماں دی اور بہن دی ایک زہر ہے جو کانوں کے راستے مرد کو عورت کے بارے میں زہریلا بنا دیتا ہے۔

کیا سکولوں میں صاحب دانش سر جوڑ کے سوچتے ہیں کہ اس بربریت کا علاج ڈھونڈا جائے؟ ایک نئے دور کا آغاز کیا جائے جہاں ہر طبقے کی عورت کو سر اٹھا کے چلنے کا حق

حاصل ہو۔ ہر بچی غبارے والے سے غبارہ لے سکے اور محفوظ رہے، نکڑ کی دوکان سے ٹافی خریدنے تو جائے مگر گھر کا راستہ نہ گم کر بیٹھے۔

کیا ماہر تعلیم یہ سوچتے ہیں کہ ایک ایسا نصاب ترتیب دیا جائے جس کا پہلا سبق عورت کی عزت کرنا ہو؟ کیا میڈیا ایسے پیغام پھیلاتا ہے کہ معاشرے کے مرد کی زبان مصفیٰ ہو؟ عورت کا نام اپنے مزے کے لئے بات بہ بات نہ رگید اجائے۔

نہیں! ایسا کچھ نہیں ہوتا!

قاتل کو پکڑنے کا مطالبہ ہوتا ہے، عورت کو مزید پردے میں رہنے کی ہدایت ہوتی ہے، چاردیواری مزید اونچی کرنے کا ارادہ کیا جاتا ہے، مقتولہ کے لواحقین سے ہمدردی ہوتی ہے، سوشل میڈیا پہ انصاف کے ہیش ٹیگ چلتے ہیں۔

سب کچھ ہوتا ہے مگر ایک کام نہیں ہوتا!

عورت کی بحیثیت انسان عزت کرنے کا خیال نہیں پھیلایا جاتا کیونکہ یہ وہ صلیب ہے جسے اٹھانے کے لئے ایقان کے کندھے درکار ہیں!، یہ وہ چراغ ہے جو جس میں اپنے وجود کا تیل جلتا ہے۔

عزت نہ کرنی ہے، نہ سیکھنی ہے، اور نہ سکھانی ہے!

پھر تھک کے عورت آواز اٹھاتی ہے، صرف اور صرف عزت کرنے کا مطالبہ کرتی ہے اور صرف آواز اٹھانے پہ معاشرے کی باغی عورت کا تمغہ پاتی ہے۔ باغی عورت کا تصور ہی معاشرے کے مردوں کی آنکھوں میں خون اتار دیتا ہے۔ وہ عورت کو محبوب تو بنا سکتا ہے پر عزت کا مقام دے کے آنکھ نہیں جھکا سکتا۔

کوئی سمجھ ہی نہیں پاتا کہ باغی عورت خود فنا ہو رہی ہوتی ہے وہ خود قطرہ قطرہ پگھل رہی ہوتی ہے۔ اس کے دل میں شعلے بھڑک اٹھتے ہیں جب اس کے کانوں میں وہ سب چیخیں گونجتی ہیں۔ ان بچیوں کے جسم پہ لگا ایک ایک زخم اس کے اپنے جسم میں ٹیسیں پھیلاتا ہے۔ ان کی آخری سانسیں تصور کر کے باغی عورت کا اپنا سانس گھٹتا ہے۔ یہ سوچ کے روح لرز جاتی ہے کہ بچی کی روح نے اس کا ننھا سا جسم کیسے چھوڑا ہو گا؟ اس کے گڑیا سے جسم سے کتنا لہو بہا ہو گا اسے تو سمجھ بھی نہ آئی ہو گی کہ یہ سب ہوا کیا؟

باغی عورت کو بستر چبھتا ہے جب اسے خیال آتا ہے جب اس بچی کی لاش کوڑے کے ڈھیر پہ کھلے آسمان کے نیچے برہنہ پڑی تھی۔ جب ننھے سے جسم کو کتوں نے پیٹ بھرنے کے لئے بھنبھوڑا تھا، اس لمحے باغی عورت کو اپنے جسم پہ نوکیلے دانت محسوس ہوتے ہیں۔ سرد تاریک رات کا اندھیرا اور بے رحم آسمان روح میں غم کا بھاری پتھر اتارتا ہے۔

اگر روز قیامت آپ نے اپنے حصے کے سچ کا روزنامچہ پیش کرنا ہے تو ہم سے تھوڑی سی آگ مستعار لیجیے اور دیکھیے کہ زندگی کی تاریک راہوں میں حق کے دیپ کیسے روشن کیے جاتے ہیں اور سنگ باری کے باوجود روح فرحت وانبساط کی کن بلندیوں پہ پرواز کرتی ہے۔

میرا جسم میری مرضی: فحش نعرہ نہیں، انسان ہونے کا اعلان ہے

" میرا جسم میری مرضی، نہایت بیہودہ اور واہیات نعرہ ہے، اس کے الفاظ فحش ہیں، آپ اس کی حمایت کیوں کر رہی ہیں؟"

یہ ہے وہ پیغام جو ہمیں دنیا کے ہر کونے سے موصول ہو رہا ہے۔ دوست احباب، خاندان، ہم جماعت، قارئین، ہم سے پوچھتے ہیں کہ اب تک تو ہم اچھے بھلے ایک " اچھی" عورت کی طرح جیے جا رہے تھے۔ پھر یہ کایا کلپ، آخر کیوں؟

ہم جو اباً ہنس پڑتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ کوئی بتائے کہ کیا بتلائیں ہم!

بات صرف اتنی سی ہے کہ "میرا جسم میری مرضی" کا نعرہ جس طرح فحاشی اور لادینیت سے جوڑا گیا ہے وہ ہمیں ششدر کرتا ہے۔ کسی اور سے کیا گلہ کریں کہ ہم اپنے جیسوں کو نہیں سمجھا پاتے کہ جسم کا تعلق صرف جنسی فعل سے جوڑا جانا حیوانی جبلت تو ہو سکتی ہے، متنوع انسانی فطرت نہیں جس کے ہزار رنگ وروپ ہیں۔

عورت تار تار روح کا کیسے ذکر کرے، داغ داغ دل کا کیا بتائے، احساس پہ لگی ہوئی ضرب سے رستا لہو کیسے دکھائے، اور اضطراب کے فسانے کیسے کہے، سو ظلم کی داستان بیان کرنے کے لئے ایک جسم ہی بچتا ہے۔

"جسم اور مرضی" کے گرد گھومتا یہ نعرہ نہ تو عریانی کا عندیہ ہے نہ جسم فروشی منشا ہے اور نہ ہی اسلام اور معاشرے سے بغاوت۔ یہ نعرہ تو اختیار مانگتا ہے، ایک انسان ہونے کے ناطے اپنی ذات کا اختیار اور فیصلہ کرنے کی آزادی!

آزادی صرف فحاشی اور آوارہ پن کا نام نہیں ہوا کرتا، کئی اور روپ بھی ہیں آزادی کے۔

تعلیم حاصل کرنے کی آزادی، معاشی خوشحالی حاصل کرنے کی آزادی، اپنی مرضی سے شادی کرنے کی آزادی، بچے پیدا کرنے کی آزادی، قانونی رشتوں کا محکوم نہ بننے کی آزادی، طلاق کے حق کی آزادی، جائیداد میں حصے کی آزادی، اپنی رائے کی آزادی اور اپنی زندگی پہ اپنے اختیار کی آزادی!

کیا اس آزادی میں ایسا کچھ ہے جو بنیادی انسانی حقوق اور اسلامی تعلیمات کے منافی ہو؟

عورت اور مرد کے بیچ چھڑی حقوق و فرائض کی بحث میں صنفی تقسیم پہ اصرار، آخر کیوں؟ زندگی کے لائحہ عمل میں دونوں کے توازن میں صنف کا حوالہ، آخر کیوں؟ برتری اور کمتری کے پیمانے ترتیب دینے کی کوشش، آخر کیوں؟

یہ خیال کیوں نہیں کہ دونوں انسان ہیں، ایک طرح سے سانس لیتے ہیں، دونوں کا دل ایک لے پہ دھڑکتا ہے۔ احساسات کے کینوس پہ ایک سی خواہشات جنم لیتی ہیں، دونوں آزاد پرندوں سا افق چاہتے ہیں۔ دونوں سوال پوچھ کے جواب تلاش کرنا چاہتے ہیں، اپنے آپ کو کھوجنا چاہتے ہیں، اور سب سے بڑھ کے یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔

یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ پھر سوچ کا یہ زاویہ کہاں سے کہ ایک آقا دوسرا غلام، ایک دیوتا دوسرا داسی۔ ایک کا یہ خیال کہ دوسرا میری ملکیت ہے اور ملکیت کو اپنی رائے اور خواہش رکھنے کا حق نہیں۔ ایک کو جرگے کے نام پہ زندگی سے کھیلنے کا شوق، اور دوسرا کبھی مختاراں مائی اور کبھی رستوں کی دھول۔

انسانیت کا وہ مقام جو ہر مرد و زن کا حق اول ہے، عورت کے لئے کوہ طور بنا دیا گیا ہے۔ عورت کو کرداروں کی مالا پہنا کے رشتوں کے پنجرے میں پابند سلاسل کر دیا گیا ہے! مثالی ماں، مثالی بیوی، مثالی بیٹی، مثالی بہن اور ان سب کی تکمیل مرد کے ہاتھ میں۔ جب بھی

مثال قائم کرنے کی بجائے اپنی ذات کے اندر جھانک کے اپنے آپ کو تلاش کرنا چاہے گی، جسم پہ ضرب کا حق بھی مرد کو تفویض کر دیا گیا ہے۔

عورت کے رویے تولنے کے لیے بھی اک میزان ہے جو صبح شام عورت کو امتحان کے پل صراط سے گزارتی ہے۔ اگر وفادار ہے تو عورت، اس سے منحرف ہو تو دو ٹکے کی۔ قربانی دے تو پارسا، پیچھے ہٹے تو دو کوڑی کی۔ زبان بند رکھے تو شریف، کھولے تو بے حیا۔ ظلم برداشت کرے تو اعلیٰ کردار، اپنا راستہ تراشنا چاہے تو بد کردار۔ بند کواڑوں کے پیچھے سسکیوں کو گھونٹ دے تو بے مثال، نوک مژگاں سے پھسلتے موتیوں کو دکھا دے تو ٹھکانہ پاتال۔

آٹھ مارچ کا مارچ، نعروں اور سلوگنز سے سجا ہوا ہمیں اداس کر دیتا ہے۔ ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم جبر کے پنجرے میں کھڑے بھیک مانگ رہے ہیں اپنے ناخداؤں سے کہ ہمیں بھی جینے کا حق لوٹا دیجیئے۔ داغ داغ تن کے ساتھ قفس کے روزن دیوار سے تھوڑی سی ہوا اور تھوڑی سی روشنی ہمیں بھی لے لینے دیجیئے۔

ویسے صرف آٹھ مارچ ہی کیوں؟ ہمارے نزدیک تو ہر دن عورت کا دن ہے، ہر ساعت و دقیقہ عورت سے بندھا ہے۔ عورت کو پیدا ہونے کے ساتھ ہی بحیثیت انسان ہر وہ حق حاصل ہے جو اس کرہ ارض پہ کسی بھی اور انسان کو!

سو آج کچھ بھی نہیں مانگیے، بس بتا دیجیے کہ تہذیب کے پھندوں میں الجھائی گئی عورت ہونے کا معنی غلام نہیں، انسان ہوا کرتا ہے

زخم زخم مسکراتی عورتیں۔۔۔ نیل کرائیاں نیلکاں

ایک عورت کے نیل نیل چہرے کی تصاویر سوشل میڈیا پر ہر طرف رقصاں ہیں۔ الزامات کی بوچھاڑ ہے، قران اٹھا کے بیان دیے جا رہے ہیں۔ یہ سب شور و غوغا اپنی جگہ، کون صحیح کون غلط کی بحث بھی جاری ہے مگر ایک بات طے ہے کہ اس کا مضروب چہرہ دل کو دکھی کرتا ہے!

مرزا صاحباں کی رومانوی داستان میں صاحباں کی زبانی فلسفہ عشق کا وہ رزمیہ ہم سب نے سن رکھا ہے،

میں نیل کرائیاں نیلکاں، مرا تن من نیلو نیل
میں سودے کیتے دلاں دے، وچ دھر لئے نین وکیل

صاحباں نے عشق کے مجازی زخموں کا دکھ بیان کیا تھا۔ محبت کرنے والی عورت نے یہ تو نہیں سوچا تھا کہ اکیسویں صدی میں بھی محبت اسے ایسے نشان دے گی جنہیں وہ زمانے کے سامنے رکھے تو رسوا ہو اور اپنے اندر چھپا لے تو مر جائے۔ یہ کیسی محبت ہے کہ نہ نین وکیل بنتے ہیں اور نہ دل سے اپیل کی جا سکتی ہے۔

پدرسری معاشرے میں ہر وہ عورت جو جسمانی، مالی اور ذہنی تشدد کا شکار ہوتی ہے، حساس لوگوں کی اذیت کا باعث بنتی ہے۔ عورت پہ ڈھایا جانے والا تشدد بہت سے سوال بھی اُٹھاتا ہے؟

کیا کوئی اخلاقی اصول اور معاشرتی قاعدہ عورت کو پیٹنے کی اجازت دیتا ہے؟

کیا کوئی قانون عورت کو گالیاں بکنے کا جواز دیتا ہے؟

کیا عورت کو ذہنی طور پہ ہراساں کرنا جائز ہے؟

کیا عورت کی زندگی کا ماحصل یہی ہے کہ اپنا حق مانگنے اور زبان کھولنے کی پاداش میں مضروب ٹھہرے!

عورت یا مرد بن کے اس دنیا میں وارد ہونا کسی کے اختیار سے بالاتر ہے۔ یہ جبر وقدر کا وہ مسئلہ ہے جہاں سب کے پر جلتے ہیں۔ ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرنے والے کی الفت پہ ہم یہ شک کر نہیں سکتے کہ اس نے ایک مخلوق کو دوسری کا پنچنگ بیگ بنایا ہو!

عورت اور مرد، گاڑی کے دو پہیے!

گو پرانی مثال ہے لیکن اب بھی دل کو لگتی ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوتا ہے کہ عورت مرد کے ساتھ زندگی کے سفر میں دوڑتے دوڑتے اس کا کچرا دان بن جاتی ہے!

حضور کا دفتر میں دن اچھا نہیں گزرا، افسر اعلیٰ نے آج طبعیت کچھ زیادہ صاف کر دی سو ایک غبار ہے جو مزاج کو برہم کئے ہوئے ہے۔

بزنس کلائنٹس کے ساتھ میٹنگ اچھی نہیں گئی۔ کنٹریکٹ نہ ملنے کی صورت میں دفتر میں سبکی کا ڈر ہے، موڈ چڑچڑا ہو رہا ہے۔

محکمے میں ساتھی کی ترقی ہوئی، دفتر میں سب اس پر رشک کر رہے ہیں، سو اب جھنجھلاہٹ کا دورہ ہے۔

ٹریفک کانسٹیبل سے چالان ہونے پہ منہ ماری ہوئی، غصہ ہے جو ابل رہا ہے کسی پر نکالنا تو ہے۔

اور اس غصے اور آگ کا شکار بننے والی ہے ایک ہستی، جو کہنے کو مرد کی زندگی کی ہم سفر ہے لیکن اصل میں مرد کی تمام فرسٹریشنز، ہر طرح کی کمی و کجی کو سہنے والی قوت گویائی سے محروم ایک گوشت پوست کا مجسمہ ہے۔

عورت کو پیٹ کے، گالیاں بک کے یا چیخ چلا کے اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے والے کے پاس اپنے اس عمل کی بے شمار توجیہات ہوتی ہیں اور ہر توجیہ کو جائز قرار دینے کے لیے بے

شمار دلائل۔ یہ دلائل دیتے وقت بھی اس کے ذہن میں ملکیت کا تصور ہوتا ہے، ویسی ہی ملکیت جیسے صحن میں چارہ کھاتی بکری، یا باہر باڑے پہ بندھی گائے!

(میری گائے، میری بکری، میری بیوی! میری، میری۔۔۔۔)

بنیادی تصور ایک ہی ہے یہ سب مرد کی املاک ہیں۔ ان سے کام لو، فائدہ اٹھاؤ، نفر میں اضافہ کرواؤ، ضرورت پڑے تو اپنی طاقت کا مظاہرہ چھمک لگا کے کرو، لیکن گردن اور آنکھیں جھکی رہنی چاہیں آخر مالک سے کون سوال وجواب کیا کرتا ہے؟

پاکستان میں کلینک کرتے ہوئے ہزاروں خواتین سے پالا پڑا جو اپنے زخم چھپاتے ہوئے ان پہ پردہ ڈالنے کی کوشش کرتیں۔

یہ منہ پہ نیل کیوں ہے؟ کیڑے نے کاٹ لیا تھا۔

کان کا پردہ کیوں پھٹ گیا؟ الماری کی صفائی کرتے ہوئے اونچائی سے گر پڑی تھی۔

سامنے کا دانت کیوں ٹوٹا؟ کار تیز رفتاری سے جا رہی تھی اچانک بریک لگی تو منہ ڈیش بورڈ سے جا ٹکرایا۔

ماتھے پہ گومڑ کیوں ہے؟ دروازے سے ٹکر ہو گئی۔

ہم بھاری دل اور نم آنکھوں سے یہ سب توجیہات سنتے اور کبھی بھرم توڑنے کی جرات نہ کر سکے۔

ہمارا پتی ورتا کا عادی پدرسری معاشرہ عورت کو کسی بھی ایسی صورت حال میں ہمدردی دینے کی بجائے شرم دلانے کی روایت کا عادی ہے۔ معاشرہ عورت کے ساتھ کھڑے ہو کے اس ظلم میں آواز بلند کرنے کی بجائے وہ اسباب ڈھونڈتا ہے جس سے مرد نے مشتعل ہو کے عورت کو مضروب کیا۔ اس سب کا مقصد مرد کو اخلاقی طور پہ بری الذمہ کرنا ہوتا ہے۔

"ضرور تم نے زبان چلائی ہو گی"

"تم نے شوہر کی مرضی کا کھانا نہیں بنایا ہو گا"

"تم نے اس کے ماں باپ کا خیال نہیں کیا ہو گا"

"تم اسے غصہ کیوں دلاتی ہو آخر"

دیکھا آپ نے، عورت کو پیٹنے کی وجوہات کو جائز قرار دینے کی کوشش اور پھر شرم دلاتے ہوئے چپ رہنے کی تلقین!

"اب چھوڑو، گھر کی بات باہر مت نکالو"

"لوگ تم پہ ہی ہنسیں گے"

"تمہارا یقین کون کرے گا"

"صبر کرلو، آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا"

"عورت ہی مصالحت کرتی ہے گھر قائم رکھنے کو"

ہم نے معاشرے کے اس جبر میں پستی عام گھریلو عورت سے لے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتیں دیکھیں۔ شادی کو کامیاب کرنے کا بھاری پتھر معاشرے نے انہی کے نازک شانوں پہ رکھ چھوڑا تھا۔

"اب اتنی ذہین عورت ہو اور اپنا گھر نہ سنبھال سکے"

"دیکھو، پڑھی لکھی عورت کے معاملے میں لوگ ویسے ہی کنفیوز رہتے ہیں، تم ہی سمجھوتہ کرلو"

"اگر طلاق لے لو گی تو لوگ کیا حشر کریں گے"

"اور اگر اگلا شوہر بھی ایسا ہی ہوا تو؟ بہتر ہے اس کے ساتھ گزارا کرلو"

"بچوں کا کیا ہوگا"

یہ ہیں سوشل کرنسی کے تیر جو کھا کے عورت زہر کا پیالہ بھی پی لیتی ہے اور سولی بھی چڑھ جاتی ہے۔ یوں کہیے کہ اپنا گلا خود گھونٹ دیتی ہے۔ پدر سری معاشرے میں جہاں عورت کا موقف سننے کا چلن ہی نہیں اور سچی ہونے کی صورت میں بھی وہ شک زدہ نظروں سے دیکھی جاتی ہے، وہاں اپنے زخم عیاں کرنا آسان نہیں۔

اس عورت نے بھی تو یہی کیا۔ پہلی دفعہ مضروب ہونے کے بعد ان زخموں کو عیاں کرنے کی بجائے صبر کا گھونٹ پی لیا کہ گرہستی بچانے کا بوجھ اسی کی ذمہ داری بنا دیا گیا تھا۔

اے ہم صنف، تم نے بہت غلط کیا!

شادی شدہ زندگی اور گھر کو قائم رکھنا صرف عورت کا کام نہیں۔ یہ ایک معاہدہ ہے جو دو لوگوں کی ذمہ داری ٹھہرتا ہے اور مکان کو گھر میں بدلنے کے لئے بھی دونوں فریق برابر کے شریک ہیں۔ طوفانوں کے گرداب اور بارشوں میں ٹپکنے والی چھت کو ایک نہیں دونوں ساتھیوں کے سہارے کی ضرورت رہتی ہے۔

تشدد کا شکار ہونے والی عورتوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ جو ہاتھ ایک دفعہ ظلم کے لئے اٹھ گیا وہ پھر کبھی پیچھے نہیں ہٹے گا۔ جو زبان ایک دفعہ کھل گئی، وہ اب کبھی نہیں رکے گی۔ جنہیں زدوکوب کرنے کی عادت پڑ گئی وہ اب چھٹے گی نہیں۔

ضرب لگانے والے کا ہاتھ اور زبان پہلی دفعہ میں روکنا ہوتا ہے۔ پہلی دفعہ میں ہی چیخ چیخ کے معاشرے کو اور مرد کو بتا دینا ہوتا ہے کہ اس رشتے میں یہ سب نہیں ہو گا۔ مرد کی جذباتی اور انسانیت سے گری ہوئی حرکات کو عورت اپنے دامن میں نہیں چھپائے گی۔

وہ سب جی دار جو عورت کی لغزشوں (مرد کی نظر میں) کی داستانیں بیان کر کے اپنے ہتھ چھٹ ہونے کو جائز قرار دیتے ہیں، انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ عورت اگر ہزار غلطیاں کرنے کی قصوروار بھی ہو، مرد کی پسندیدگی کی سند سے محروم بھی ہو تب بھی اسے مرد کے وحشیانہ پن کا شکار نہیں ہونا، عورت کے نازک جسم پر مرد کی مردانگی کی مہر نہیں لگوانی۔

معاشرے کے ناخداؤں کو جان لینا چاہئے کہ شرم اور جھوٹی عزت کی پروا صرف عورت کا نصیب نہیں۔ عورت کو اپنے دل پہ گرنے والے آنسوؤں کو سمندر نہیں بنانا۔ کائنات کے رنگوں پہ اس کا بھی مرد جتنا ہی حق ہے اور وہ عورت بہادری کا تمغہ سجانے کی حقدار ہے جو معاشرے کے بدنما داغوں کا پردہ چاک کرتی ہے اور سنگ باری کا نشانہ بنتی ہے۔

کراچی میں شوہر اور ساس کے ہاتھوں جلائی جانے والی لڑکی کا پرسہ

نہ جانے دروازے پہ کون یہ لفافہ چھوڑ گیا ہے۔ اٹھا کے چاک کرتے ہوئے سوچتی ہوں۔ بظاہر کوئی دعوت نامہ معلوم ہوتا ہے۔

"شاہ لطیف ٹاؤن، کراچی میں چولہا پھٹنے سے جھلس کے مر جانے والی کے آنسو پونچھنے کے لئے ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا ہے۔ آپ کی آواز نقار خانے میں طوطی کے مثل ہی سہی لیکن ہمارے زخموں پہ پھاہا رکھنے کے مانند ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ تشریف لائیں۔ بے بسی، درد، رنج والم مجسم حالت میں آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

متمنی شرکت—شہر خموشاں کے باسی"

ہاتھوں پیروں میں سکت نہیں، زبان گنگ ہے، دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہیں۔ کچھ بے بس آنسو گریبان بھگوتے ہیں، لیکن ہمیں جانا ہے بنت حوا کی اس محفل میں چاہے کلیجہ پھٹ ہی کیوں نہ جائے۔

شام کا جھٹپٹا ہے، سرسراتی ہوا کا شور جیسے دور کوئی ماں بین کر رہی ہو۔ سورج منہ چھپانے کو ہے، پرندے نڈھال ہیں، اور وہ قطعہ گیتی کربلا سے کم معلوم نہیں ہوتا۔

عورتیں، کم عمر لڑکیاں، بچیاں، پتھر آنکھیں اور اذیت کی منجمد تصویریں!

وہ اپنے آبلوں بھرے ہاتھ سے، جس سے جلد اور گوشت علیحدہ ہو چکے ہیں اور ہڈیاں جھانک رہی ہیں، میرا ہاتھ تھامتی ہے۔ پورا جسم چولہے میں پڑی ادھ جلی لکڑی کی مانند سیاہ پڑ چکا ہے۔ آنکھوں کے غاروں میں سیاہی ہے، ناک منہ سب پگھل چکے ہیں، اس کی آواز میں آگ کے شعلوں سی لپک ہے۔

"کیا آپ نے کبھی گرم کوئلوں پہ کسی ذبح شدہ جانور کے گوشت کو پکتے دیکھا ہے جب لال رنگت آگ کی حرارت سے بدل جاتی ہے۔ گوشت کی چربی پگھل پگھل کے کوئلوں پہ گرتی ہے اور اگر کبھی آگ تیز ہو تو گوشت جل کے سیاہ پڑ جاتا ہے۔"

میرا جسم بھی ایسے ہی جلا، تیز انگاروں میں، میں زندہ حالت میں ہی جل کے کوئلہ ہو گئی۔ میں اپنی چیخیں سنتی تھی اور درد مجھے دنیا و مافیہا سے بے خبر کرتا تھا کیا یہ جہنم کی آگ تھی؟ لیکن اس آگ کو بھڑکانے والا خدا تو نہیں تھا!

"میری شادی ہوئے دو ہی مہینے گزرے تھے۔ ہم دونوں بہت خوش تھے۔ میری ساس کچھ خفا سی رہتی تھی ہم اسے پہناؤنی میں سونے کے جھمکے نہیں دے سکے تھے۔ اتنے پیسے نہیں تھے ابا کے پاس۔ اس دن میں نے چائے بنانے کے لئے چولہا جلایا تو مجھے سانپوں جیسے شعلوں کی لپٹیں تھیں جنہوں نے میرا جسم بھسم کر ڈالا۔ میں دروازہ پیٹ رہی تھی لیکن نہ معلوم کیوں نہیں کھلا؟ میرا شوہر تو باہر ہی تھا اور اسی نے چائے بنانے تو بھیجا تھا۔ سنا تھا شوہر مر جائے تو بیوی کو اس کے ساتھ جل کے مرنا پڑتا تھا لیکن میرا شوہر تو باہر ماں کے پاس بیٹھا تھا۔ اب بھی اس دھوئیں سے میرا دم گھٹتا ہے۔ اماں بہت یاد آتی ہیں"

میں آنسو چھپانے کی خاطر منہ دوسری طرف پھیر لیتی ہوں جہاں ایک کم عمر لڑکی کراہ رہی ہے

" میں گھر سے سکول جا رہی تھی۔ وہ چار تھے مجھے پکڑ کے پاس والے کھیت میں لے گئے۔ بہت درد تھا، میں بہت روئی بہت تڑپی لیکن ان کی ہوس تھی کہ ختم ہی نہیں ہوتی

تھی۔ ایک کے بعد ایک! وہ تو اچھا ہوا اللہ نے مجھے لینے کے لئے عزرائیل بھیج دیا۔ خوف سے اب بھی نیند نہیں آتی"

وہ پیلی رنگت والی ادھیڑ عمر، جس کے چہرے سے بے چارگی پھوٹتی ہے۔

" دنیا میں شوہر کی مار پیٹ جسم پہ نیل چھوڑتی تھی۔ سوچا تھا دفن ہو کے چین آئے گا۔ قبر کی پہلی رات میں خوش تھی، تنہائی، اندھیرا اور سکون! ٹھوکر مار کے کمینی کہہ کے اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ لیکن اس رات بھی، اس رات بھی مجھے چھ فٹ مٹی کے نیچے سے نکال لیا گیا۔ میرے جسم پہ میری مرضی مرنے کے بعد بھی پوری نہ ہوئی۔ پوری رات ان تینوں نے یہ وحشیانہ کھیل میرے ساتھ کھیلا۔ سمجھ نہیں آئی کیا میں قبر میں لیٹی ہوئی بھی بے حیائی کی مرتکب تھی، یا قبر میں پڑا میرا جسم اللہ کی امانت نہیں تھا؟"

ایک پتھر صورت آگے بڑھتی ہے،

" کیسے بتاؤں کہ جب میں گاؤں کی گلیوں میں ہزاروں کے مجمعے میں سے ننگی گزاری گئی۔ کوئی میرے بدن کو کہیں سے کاٹتا، کوئی کہیں سے کچوکے دیتا۔ وہ سب وحشی جانور تھے اور میرے بدن پہ ان کی مرضی ہر جگہ پہ نیل ڈالتی تھی۔ چھتوں پہ چڑھے لوگ تماشا دیکھ کے ہنستے تھے اور میں اس بدن سے نفرت کرتی تھی۔ ابھی بھی اس بدن سے نفرت ہے مجھے، جس پہ ان کی بہت سی یادگاریں موجود ہیں۔ اب میں ایک پتھر کی عورت ہوں"

کوئی میرا دامن کھینچتا ہے، وہ پریوں جیسی بچی جس کے آنسو گال پہ سے پھسل رہے ہیں

" میں تو صرف ٹافی لینے نکڑ کی دوکان تک گئی تھی۔ اس انکل نے مجھے گود میں اٹھا لیا اور کہا کہ آؤ غبارہ بھی لے دوں۔ مجھے غبارہ اچھا لگتا تھا جب وہ آسمان پہ اڑتا تھا۔ پتہ نہیں انکل نے مجھ سے گندی حرکتیں کیوں کیں۔ میرے رونے پہ میرے منہ پہ تکیہ رکھ دیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ میں آسمان پہ اڑ رہی ہوں اور میرے پاس بہت سے غبارے ہیں۔ مجھے اپنا گھر یاد آتا ہے"

ایک اور معصوم صورت میری آستین پکڑتی ہے،

" مولوی صاحب جب بھی سیپارہ پڑھانے آتے، جوتا اتار دیتے۔ پھر میز کے نیچے سے میری ٹانگ پہ آہستہ آہستہ اپنا پاؤں پھیرتے۔ جونہی اماں آتیں، پاؤں ہٹا لیتے۔ ایک دن میں گلی میں کھیل رہی تھی، مجھے کہنے لگے کہ انہوں نے میرے لئے گڑیا خریدی ہے۔ میں گڑیا لینے ان کے ساتھ گئی۔ پھر مجھے بہت درد ہوا، میں بہت روئی۔ میں نے سبق یاد کرنے کا وعدہ کیا لیکن وہ نہیں مانے۔ اماں مجھے ڈھونڈتی ہی رہی لیکن میں کیسے ملتی؟ میں تو اس رات پچھلی گلی میں کوڑے کے ڈھیر پہ پڑی تھی اور گلی کے کتے اپنے پیٹ کی بھوک مٹا رہے تھے"

وہ سب ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتی ہیں۔ درد بھری آواز میں ایک لے میں کچھ کہتی ہیں۔

سنتے ہیں کہ تیرا پیار
ستر ماؤں کے پیار پہ بھاری ہے
سنتے ہیں کہ تیرا عدل
فرق روا نہیں رکھتا
سنتے ہیں کہ خالق تو ہے،
زندگی پھونکنے والا تو ہے
اختیار تیرا، سانسیں تیری، دنیا تیری، بندے تیرے، جنت و دوزخ تیری
اتنا بتا دے مالک
عورت کون ہے؟
اس کا آقا کون ہے؟
اس سے زندگی چھیننے والا کون ہے؟
شہر خموشاں سے ہم کچھ آگ اپنے ساتھ لے آئے ہیں جو نہ بجھتی ہے نہ جینے دیتی ہے!

(بہت برس پہلے ہمارے بچوں کی آیا کبری بی بی کی بڑی بیٹی سسرال میں چولہا پھٹنے سے جل کے مر گئی۔ تب سے دل کے ایک گوشے میں اس کی یاد دھری تھی جو کل کراچی میں اس جیسی ایک معصوم کے مرنے سے زندہ ہو گئی۔)

کاش میں آپ کی بیٹی ہوتی

ایک خیال میں گندھی یہ خواہش ہوا کے دوش پہ تیرتی ہوئی ہم تک آن پہنچی اور ہماری آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے۔ نہ جانے اس معصوم خواہش کے پیچھے کرب تھا یا کوئی ناتمام حسرت، جبر یا کوئی سسکی، ایک کراہ، ایک نالہ جو ہمارا جگر چیر گیا۔ ہمارے معاشرے میں عورت کے مقام کی سچی اور تلخ حقیقت!

ہم متضاد کیفیات کا شکار ہوئے! خوش کہ ہم مردانہ بالادستی کے اسیر معاشرے میں عورت کے حقوق کے علمبردار کے طور پہ جانے گئے اور ہماری یہ پہچان آج سے نہیں بلکہ اس دن سے ہے جب شعور کی سرحد پہ قدم رکھا۔ ہمیں فخر محسوس ہوا کہ کسی معصوم دل نے ہمیں اپنی ماں کا مقام دینے کی خواہش کی اور اداس کیا کہ جانے وہ کیا تشنہ لبی ہے جو اس بچی کو مضطرب کرتی ہے!

زندگی کی کہانیاں سن سن کے جانتے ہیں کہ ہمارا پدرسری معاشرہ لڑکی ذات کو ایک ادنیٰ شہری قرار دیتا ہے۔ برہمن ذہنیت رکھنے والے لوگ لڑکی کو شودر سمجھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے اور یہ سلوک اس دن سے شروع ہوتا ہے جس دن سے حمل ٹھہرتا ہے۔

حمل کی خبر سنتے ہی ساس پوتے کی آس لگائے مصلے پہ بیٹھ جاتی ہے۔ شوہر بیٹا پیدا کرنے کا فرمائشی پروگرام سنا دیتا ہے۔ خاندان کی بڑی بوڑھیاں اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے بیٹا پیدا ہونے کی دعائیں بانٹنا شروع کر دیتی ہیں۔

پہلے الٹرا ساؤنڈ پہ ہی ڈاکٹر سے جنس جاننے کی فرمائش کی جاتی ہے۔ بیٹے کی صورت میں سب کے چہرے کھل اٹھتے ہیں۔ بیٹی کی صورت میں ایک مرجھائی سی مسکراہٹ چہرے پہ دوڑتی ہے اور ٹھنڈی سانس بھر کے کہا جاتا ہے، اللہ کی مرضی! اور کہیں کہیں تو حمل گرانے کے منصوبے ترتیب دے دیئے جاتے ہیں۔

یہ ہے حوا کی بیٹی جو پیدا ہوتے سے پہلے ہی راندہ درگاہ قرار دی جاتی ہے۔ جس کی آمد کسی کے دل میں خوشی کی جوت نہیں جگاتی۔ بیٹا پیدا ہونے کی صورت میں ہسپتال میں لڈو بٹتے ہیں، بیٹی ہونے کی صورت میں آہیں۔ کوئی بھرے منہ مبارک بھی نہیں دیتا۔ اگر کچھ پوچھ لیا جائے تو بر اسامنہ بنا کے کہا جاتا ہے، کیا کریں؟ بیٹی کے نصیب سے ڈر لگتا ہے!

چلیے بیٹی پیدا ہو گئی اور اب بچپن سے ہی بوجھ سمجھی جا رہی ہے۔ باپ بھائی گھر ہوں تو اونچا نہیں بولنا، ان سے لاڈ نہیں کرنا، کسی چیز سے اختلاف نہیں کرنا، کسی بات کا جواب نہیں دینا، کوئی سوال نہیں کرنا، اپنی جائز خواہشات کا اظہار نہیں کرنا۔ جو بات بیٹے کے لئے صحیح ہے وہی بات بیٹی کے لئے غلط۔ گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں، سہیلیوں سے ملنے کا رواج نہیں۔ رنگ، روشنی، خوشبو، ہنسی اور آزادی پہ اختیار نہیں۔

تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کی بجائے جہیز جمع کرنے کی فکر ہے۔ بوجھ سمجھ کے سر سے اتارنے کی جلدی ہے۔ دن مہینے گنے جا رہے ہیں کہ کب بچپن کی سرحد پار کرے اور بیٹی کو ٹھکانے لگایا جائے۔ اچھے خاصے باشعور لوگ یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ وہ دن جلد آئے جب ہم اس فرض سے فارغ ہوں، بیٹی کو کسی اور کے سر منڈھنے کا فرض! ایک مالک سے دوسرے مالک کے حوالے کرنے کی سبک دوشی!

حق تو یہ ہے کہ جس لڑکی کو آپ اپنی مرضی سے اس دنیا میں لے کر آئے، اسے معاشرے میں سر اٹھا کے کھڑا کرنے کے قابل بنانا آپ کا خواب ہونا چاہیے۔ علم کی دولت اس کی جھولی میں ڈالنے کا ارمان ہو، جہیز جمع کرنے کی بجائے اس کی مالی خود مختاری کا بندوبست کیا جائے۔ اسے اپنا حق لینے کی تربیت دی جائے۔ زمانے سے ٹکر لینے کا اعتماد بخشا جائے۔ جس مقدر کو سوچ کے آہ بھری جاتی ہے اس کا علاج تعلیم اور کھلی پرواز میں ڈھونڈا جائے نہ کہ ایک اور پنجرے میں ڈال کے مطمئن ہوا جائے کہ یہی نصیب ہے۔

حق یہ ہے کہ وراثت میں حق معاف کرانے کی بجائے اسے ساتھ کھڑا کیا جائے۔ شادی میں اس کی رائے مقدم جانی جائے اور یہ کہہ کے رخصت مت کیا جائے کہ جہاں ڈولی جا رہی ہے وہاں سے جنازہ نکلے۔ وہ ظلم کی چکی میں پستی رہے لیکن طلاق کا مت سوچے اور طلاق کی صورت میں گھر کے دروازے اس پر تو کھلیں مگر اس شرط پہ کہ وہ اپنے جگر گوشے چھوڑ کے واپس آئے۔

یاد رکھیے، عورت کے دل کا خمیر ایسی مٹی سے اٹھا ہے جس پہ اگر محبت کی بارش کی پھوار نہ گرے تو وہ بنجر زمین بن کے چٹخ جایا کرتی ہے۔ سب ارمانوں اور آرزوؤں کو دفنا کے جیتی جاگتی عورت حنوط زدہ لاش بن جایا کرتی ہے جو سانس تو لیتی ہے مگر کسی اور کی مرضی سے۔

ان تمام لڑکیوں اور عورتوں سے، جو ہمیں پڑھتی ہیں اور ہمیں اپنی آواز سمجھتی ہیں، سے یہ کہنا ہے کہ ہمارا دل آپ کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ وقت اور زمانہ ہمارے درمیان حائل ضرور ہے لیکن ہم آپ کی ان کہی سنتے ہیں اور اس کا کرب ہمارے احساس پہ اترتا ہے۔

ہماری یہ تمنا ہے کہ ایک دن وہ صبح طلوع ہو جب ہر عورت آزاد ہو، اپنی خواہش کی مالک ہو، اس کا ٹھکانہ قوس و قزح سے بھرا آسمان ٹھہرے، معاشرے کا قفس نہیں!

اور یاد رکھیے عورت ہونا اعزاز ہے، شرمندگی نہیں!

اک دن رہیں بسنت میں
اک دن جئیں بہار میں
اک دن پھریں بے انت میں
اک دن چلیں خمار میں
دو دن رکیں گرہست میں
اک دن کسی دیار میں

کنول پاؤں کا مضروب حسن اور پورے پاؤں پر کھڑی عورت

"اماں! کنول کسے کہتے ہیں"

ریڈیو کے مختلف چینیلز ڈھونڈتے ڈھونڈتے یک لخت کسی بھولے بسرے اردو گیت کے مانوس لفظ فضا میں بکھر گئے جو ہماری بیٹی کے لئے قطعاً اجنبی تھے اور وہ بے اختیار بول اٹھی تھی۔

"اف یہ انگریزی دان بچے" ہم زیر لب بڑبڑائے،

"کنول ایک پھول ہے جسے تم لوٹس کے نام سے جانتی ہو گی"

کنول یا لوٹس کا ذکر ہمیں اوائل عمری کا ایک دن یاد دلا گیا جب ہم نے پرل ایس بک کا ناول "The Good Earth" پڑھ کے لوٹس کا اردو نام جاننا چاہا تھا۔ وقت کے پہیے کی الٹی گردش میں آج ہم کنول کو لوٹس میں بدل رہے تھے۔

ایشیا کے قدیم باشندوں سے لے کر آج تک کے معاشرے کے لئے کنول اجنبی نہیں۔ کنول کا پھول جوہڑ میں کھلنے کے محاورے سے لے کر آنکھ کنول اور بہت سی تشبیہیں اردو ادب میں بہت عام ہیں۔ کنول کا پھول حسن اور پاکیزگی کی علامت تو ہے ہی لیکن تاریخ میں ظلم و بربریت کی کچھ داستانیں بھی اس سے جڑی ہیں۔

ان داستانوں سے آگہی ہمیں پہلی دفعہ پرل بک کی پلیٹزر ایوارڈ یافتہ اس کتاب سے ہی ہوئی اور ہمارے پاؤں میں ان تمام عورتوں کا درد اتر آیا جو اس ظلم کا شکار ہوئی تھیں۔ ہمیں آج بھی اپنی نوعمری کی وہ کیفیت یاد ہے جب ہم نے انتہائی دکھ میں مبتلا ہو کے پنجوں کے بل چلنے کی کوشش کی تھی اور لڑکھڑا کے گر پڑے تھے۔

عورت کے پاؤں میں کشش پا کے عاشق ہونے والوں کی تو آج بھی کمی نہیں لیکن اسے کنول روپ میں ڈھالنے کا تصور صدیوں قبل کے قدیم چین نے اختیار کیا۔ عورت کے جسم کو اپنی ملکیت سمجھ کے اپنی مرضی سے تراش خراش کرنے والے تصور کاروں کے بنیادی خیال کی زمین وہی تھی، کیسے اس ملکیت سے زیادہ سے زیادہ حظ اٹھایا جائے؟

چلیے چھٹی صدی عیسوی کے شہنشاہ زیاؤ بھاؤ ژان کے دربار میں چلتے ہیں جہاں محبوب ملکہ پانو کنول کے سنہری پتوں کے نقش و نگار سے سجے فرش پہ محو رقص ہے کہ شوہر کا دل لبھانا ہے۔ رقص کرتی ملکہ کے سروں پہ تھرکتے پاؤں اتنے زیب نظر ہیں کہ شہنشاہ کہہ اٹھتا ہے " تمہارے پاؤں سے کنول پھوٹ رہے ہیں" اور شاید یہیں سے سنہری کنول یا کنول پاؤں کی اصطلاح کا آغاز ہوا۔

وقت آگے بڑھا۔ گیارہویں صدی میں شہنشاہ لی یو نے مقدس کنول کا چھ فٹ اونچا ہیرے موتی سے مزین مجسمہ بنوایا اور اپنی محبوبہ سے فرمائش کی کہ وہ اپنے پاؤں پہ سلک کی پٹی لپیٹ کے پنجوں کے بل اس مجسمے پہ رقص کرے۔ جکڑے ہوئے قدموں کے ساتھ اعضا کی یہ شاعری اس قدر دل کش تھی کہ مرد کی آنکھیں عورت کی خوبصورتی کا پیمانہ پنجوں کی مانند چھوٹے پاؤں قرار پائے۔ شروع میں امراء کے طبقے نے اپنی چاہت کو زبان دی اور رفتہ رفتہ پورے معاشرے میں یہ بدصورت خواہش پھیل گئی۔

پھر آغاز ہوتا ہے اس ظالم رسم کا جو نو صدیوں تک چینی معاشرے میں رائج رہی اور عورت کو اپنی مرضی کا حسن و دلکشی دینے کے لئے بچپن سے معذور کر دیا گیا۔

ہر چھوٹی بچی جونہی چار پانچ سال کی عمر پار کرتی، اس کے پاؤں پر یہ عمل شروع کیا جاتا کہ اسی عمر کے پاؤں کا حجم معاشرے کے ناخداؤں کو مطلوب تھا۔ پہلے پاؤں کو جڑی بوٹیوں اور جانوروں کے خون سے بنے محلول میں ڈبو دیا جاتا، پاؤں پہ لپیٹنے کے لئے دس فٹ لمبی پٹی کو بھی اسی محلول میں بھگویا جاتا۔

جب پاؤں نرم ہو جاتے تو پاؤں کا سائز کم رکھنے کے لئے انگلیوں کو پوری قوت سے موڑ کے تلوے کے ساتھ لگایا جاتا۔ انگلیاں ٹوٹ کے تلوے میں پیوست ہو جاتیں۔ پھر پاؤں کو ٹانگ کے ساتھ سیدھا بنانے کے لئے تلوے کا خم توڑا جاتا۔ اس ٹوٹے پھوٹے پاؤں پہ

پٹی لپیٹی جاتی اور اوپر سے تنگ جوتا پہنا دیا جاتا جو لوہے یا لکڑی کا بنا ہوتا۔ اس پٹی کو روزانہ چیک کیا جاتا کہ ڈھیلی پڑنے کی صورت میں پاؤں مطلوبہ شکل اختیار نہ کر پاتا۔ جب کبھی پٹی تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی، پاؤں کو پھر محلول میں ڈبویا جاتا اور پھر نم پاؤں پہ ضربیں لگائی جاتیں کہ جوڑوں کی ہڈیاں ٹوٹ کے نئی شکل اختیار کر سکیں۔ بندھے اور مضروب پاؤں میں اکثر انفیکشن ہو جاتی اور انگلیاں مردہ ہو کے جھڑنے لگتیں۔ جھڑتی ہوئی انگلیاں ایک خوش آئند بات ہوتی کہ پاؤں سے ایک فالتو بوجھ اتر جاتا لیکن گینگرین ہونے سے دس فیصد لڑکیاں جان کی بازی ہار جاتیں۔

یہ عمل کئی برس جاری رہتا۔ شباب کی عمر کو پہنچنے والی لڑکی کے پاؤں کی ہڈی اگر سخت ہو جاتی، مزید ضربیں لگا کے اسے پھر توڑا جاتا تاکہ پاؤں کا سائز تین یا چار انچ سے بڑھنے نہ پائے۔

کنول پاؤں رکھنے والی لڑکیوں کی چال عام لوگوں سے مختلف ہوتی۔ ٹوٹے ہوئے پاؤں وزن سہارنے میں ناکام رہتے سو لڑکی چھوٹے چھوٹے قدم آہستہ آہستہ اٹھاتے ہوئے ڈگمگاتی اور اس چال کو جنسی کشش کی علامت سمجھ کے کنول چال پکارا جاتا۔

شادی کے لئے موزوں ترین امیدوار کا تعین 'کنول چال' اور 'کنول پاؤں' کے حجم سے کیا جاتا۔ تین انچ کے پاؤں رکھنے والی کو 'سنہری کنول' سمجھا جاتا اور چاہنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی۔ دوسرے نمبر پہ چار انچ پاؤں والی ٹھہرتی اور اسے 'چاندی کنول' کا نام دیا جاتا اور پانچ انچ پاؤں والی سب سے کمتر جان کے 'فولادی کنول' کہلائی جاتی۔

کسی بھی مرد کے لئے سنہری کنول سے شادی اس کے اعلیٰ معاشرتی مقام کی ضامن ہوتی۔ لڑکیوں کے والدین کے سر پہ بھی یہ سہرا سجتا کہ انہوں نے ایک جیتی جاگتی

انسان کے پاؤں کئی برسوں کی محنت کے بعد کنول بنا دیے ہیں۔ اس سارے عمل میں لڑکی کی جسمانی اور ذہنی اذیت ایک مرد کی جنسی خواہش کے پیچھے چھپ جاتی۔

بالآخر بیسوی صدی کے سورج نے ان اندھی روایات کو بدلنے کی خواہش کا آغاز دیکھا۔ نسائی برابری کی سوچ رکھنے والی خواتین نے اس تحریک کی بنیاد رکھی۔ اس تحریک کی ممبر خواتین نے اپنی بیٹیوں کو اس رواج سے مبرا قرار دیا اور اپنے بیٹوں پہ کنول پاؤں رکھنے والی لڑکیوں سے شادی پہ پابندی لگائی۔

قلم کار دانشوروں نے اس کے خلاف لکھ کے لوگوں میں شعور پیدا کیا۔ عورت کو اپنی تسکین کے لئے زندگی بھر کی معذوری دینے کے ظالمانہ عمل کو چیلنج کیا گیا۔ محنت رنگ لائی اور نو سو سال سے رائج ایک بربریت بھرا عمل بیسویں صدی کے وسط میں اپنے اختتام کو پہنچا۔

عورت کنول پاؤں کی بد صورتی سے تو آزاد ہوئی لیکن اسے ارزاں جنس سمجھ کے اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے والوں کی نہ کل کمی تھی نہ آج ہے۔ عورت کا جسم مضروب کل بھی ہوتا تھا اور آج بھی بند دروازوں کے پیچھے گھٹی ہوئی چیخیں، سسکیاں، کراہیں سنائی دیتی تھیں۔ عورت کو وفا شعاری، پاکیزگی، اعلی کردار کے بھجن سنا کے کل بھی دیوار میں چنا جاتا تھا، آج بھی مذہب، اقدار، اخلاق اور روایت کی بیڑی پہنا کے ملکیت کے خانے میں بند کر دیا جاتا ہے۔

کبھی احساس کا جگنو چمکے تو سوچیے گا، کیا کبھی کوئی مرد ان اذیتوں کو جھیل سکتا ہے؟ کیا کبھی ان حکایات کو پڑھ کے آپ کو اپنے مرد ہونے سے نفرت محسوس ہوئی؟ کیا آپ اپنے جیسوں کے مکروہ افعال و افکار پہ شرمندگی محسوس کرتے ہیں؟

مجھے عورت ہونے پر فخر ہے

مجھے فخر ہے کہ میں ایک آواز ہوں، ایک زندہ عورت کی آواز!
مجھے اپنی آواز کے معنی پر اعتماد ہے۔
اور یہ آواز تب گونجتی ہے جب عورت کے کردار، اختیار اور مقام پہ حملہ کیا جاتا ہے۔ وہ لاکھوں عورتیں جو بول نہیں سکتیں، محض لہو کے گھونٹ بھر کے رہ جاتی ہیں، ان کے لئے میری آواز صحرا کی تپتی دھوپ میں تھوڑا سا سایہ اور دو گھونٹ پانی کے مترادف ہے۔
مجھے اپنی طاقت کا احساس ہوتا ہے جب احساس کمتری مین ڈوبی ہوئی زبانیں میرے سچ سے گھبرا کے انگارے اگلتی ہیں۔
مجھے ناز ہے جب میں دیکھتی ہوں کہ ہر رنگ، نسل، اور عمر کے مرد کے اعصاب پر عورت کا خوف سوار ہے۔
میں مسکراتی ہوں جب گیان دھیان سے عورت کے کردار کا پیمانہ متعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور پیمانے پہ پورا نہ اترنے کی صورت میں لفظ عورت سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے۔
میں کھل کے ہنستی ہوں جب اپنا قد اونچا کرنے کی ناکام کوشش میں قعر مذلت میں گرے ادنیٰ لوگ مزید بونے نظر آنے لگتے ہیں۔
مجھے لطف آتا ہے جب مجھے بتایا جاتا ہے کہ دنیا کے بازار میں میری صنف کی بولی کیا ہے اور میں خریداروں کی اوقات بیان کرتی ہوں۔

مجھے اور بھی لطف آتا ہے جب میں بے وقعت گھمنڈیوں کو عورت پہ تبصرہ کرتے دیکھتی، سنتی یا پڑھتی ہوں اور جہنم کے دروازے عورت پہ کھول دیئے جانے کی نوید سنا دی جاتی ہے۔

مجھے اپنی جھوٹی عزت نفس میں ڈوبے ہوؤں پہ ترس آتا ہے جب وہ یہ سوچ کے سنگ باری کرتے ہیں کہ ان کے اسفل الزام اور ہلکے الفاظ عورت کو ارزاں کر دیں گے۔

سنو!

میری آواز وہ آواز ہے جو عرب کے صحراؤں میں وقت پیدائش ہی زندہ دفن کی جاتی تھی۔

اور آج احسان جتایا جاتا ہے عورت پہ، کہ وہ جو زمین میں زندہ گاڑی جاتی تھی، ننھی سی جان پہ مٹی ڈال کے ڈوبتی سانسوں کا نظارا کیا جاتا تھا، روشن آنکھوں کے دیپ بجھا دیے جاتے تھے، اس عورت کو زندگی کی نوید دے دی گئی۔ دین حق نے وحشی دلوں کو موم ہونے کا حکم دے دیا۔

مگر کیا کیجئیے کہ سوال پوچھنا ہماری مجبوری ہے۔

کیا واقعی عورت کو مٹی میں زندہ دفن ہونے سے بچا لیا گیا؟

کیا واقعی معاشرے نے اپنی بربریت تسلیم کر لی؟

کیا واقعی عورت کو آزادی سے جینے کا حق دے دیا گیا؟

کیا یہ تسلیم کر لیا گیا کہ وہ مرد جیسی ہی جیتی جاگتی امنگوں بھری مخلوق ہے؟

کیا اسے بھی پرواز کا وہی حق حاصل ہوا جو مرد کو میسر ہے؟

کیا اس کی بھی خواہشات، احساسات اور جذبات کا احترام ہوا جو مرد کو حاصل ہے؟

کیا اسے بھی اپنی زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہوا جو مرد کے حصے میں آیا؟

کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ معاشرے نے چلن بدلنے کی بجائے دفن کرنے کے لئے کچھ برسوں کی مہلت مانگ لی؟

اور اب سمجھ میں آتا ہے کہ ہوا کچھ یوں ہی ہے!

انسانیت اور محبت بھرا حکم آیا کہ ننھی بچی گڑھے میں زندہ دفن نہیں ہو گی۔ زندگی سے محروم نہیں ہو گی، شقاوت القلبی کا مظاہرہ نہیں کیا جائے گا۔

حکم سن لیا، مان لیا، ماننا ہی تھا لیکن دلوں میں جو سنگدلی بسی تھی، روح جو بے بس کی چیخیں سن کے فخر کے ہلکورے لیتی تھی، میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ماہیت قلب نہیں بدلی، آنکھ نہیں جھکی اور جھک کے عزت کرنا نہیں سیکھا۔ حقوق دینا نہیں سیکھا، حقارت سے دیکھنا نہیں چھوڑا۔ دوسری طرف بھی انسانی دل دھڑکتا ہے، خواب دیکھے جاتے ہیں، خواہشات کا الاؤ ہے، یہ نہیں جانا۔

نہیں کچھ بھی نہیں سمجھا، جانا اور پہچانا!

کیونکہ ضرورت نہیں تھی یہ سب کشٹ کاٹنے کی کہ اس سب کے لئے دل میں کچھ جگہ خالی کرنا تھی۔ کچھ حقوق دینے کے لئے من کو راضی کرنا تھا، آنکھ پہ پہرے بٹھانے تھے، دل میں عزت پیدا کرنی تھی، نفس کو لگام دینا تھی اور عورت کو اپنے جیسا، اپنے جیسا زندہ انسان سمجھنا تھا۔

یہ ایک کٹھنائیوں بھرا سفر تھا سو کیوں اتنی مشکل میں پڑیں یہ بے وقعت نفس کے مالک، کیوں بدلیں اپنے آپ کو؟

سو نوزائیدہ بچی کو زندگی بخش کے زندہ قبر میں تو نہیں اتارا گیا، مگر انتظار کیا گیا کچھ برسوں کا کہ عورت کو ظالم روایات کی تنگ قبر میں اتار کے تماشا دیکھا جا سکے، وہی تماشا جو ننھی بچی کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ وہاں جسم دفن کیا جاتا تھا، یہاں روح کو صلیب پہ گاڑنے کی تیاری کی گئی۔ تعفن زدہ غیرت کے بوجھ تلے دبا دیا گیا، مصنوعی عزت کے بار تلے کچل دیا گیا۔ بنیادی مقصد تو ہوا، روشنی اور زندگی سے محروم کرنا تھا تو چلیئے پیدائش پہ ننھی بچی نہ سہی، کچھ برسوں بعد کی نو عمر لڑکی سہی۔

عورت کی قسمت میں مالک کی چاکری لکھی ہے، مرضی کی زندگی نہیں۔ سکول جانا، علم حاصل کرنا، کام کر کے معاشرے کا فعال رکن بننا، ہنسنا بولنا، مرضی سے جینا، شادی کا

فیصلہ خود کرنا، آزاد پرندے کی طرح پرواز کرنا، یہ سب مالک کی بنائی وہ دیواریں ہیں جنہیں غلام مالک کی مرضی کے بغیر نہیں پھلانگ سکتے۔

سو پدرسری معاشرے میں نصیب وہی رہے گا، سر تسلیم خم کرو، بچپن میں باپ بھائی کا حکم اور باقی عمر میں شوہر کی تابعداری۔ محض کھونٹا بدلنا ہے سو نکیل تو رہے گی اور اس سے بندھی رسی بھی کوئی تھامے رکھے گا۔

پاکستان سے ایک مہربان کا فون تھا!

رندھے لہجے میں سسکیاں بھرتی آواز!

"کیوں لکھتی ہو ایسا؟ جب سنگ باری ہوتی ہے تو کیا ٹیس نہیں اٹھتی؟

کیا درد رگوں میں نہیں پھیلتا؟ لفظوں کے تیروں سے زخمی نہیں ہوتیں کیا؟

یہ مشکل راستہ ہے جو تم نے چنا ہے"

ہم مسکرا دیئے" سنو تمھیں معلوم ہے کیا کہ وہ لاکھوں عورتیں جنہیں زباں بندی کا حکم سنایا گیا، وہ کیسا محسوس کرتی ہیں میرے الفاظ پڑھ کے۔ روح کیسے شانت ہوتی ہے ان کی کہ کہیں تو کوئی نقار خانے میں آواز بلند کرنے کی جرات رکھتا ہے۔ بھلے صدا صحراؤں میں گونج کے کھو جائے۔ پروا نہیں کہ شکار کی تلاش میں اندھے بہرے گدھ اپنے کان بند کر لیں۔ سچ کا عذاب سقراط کو زہر پینے پہ مجبور تو کر دیتا ہے لیکن صدیوں پہ محیط وقت کے سفر میں سچائی کی دہلیز پہ اپنا نام امر کر جاتا ہے"

"روؤ نہیں میری بہن، یہ میری آگہی کا تاوان ہے اور اس کا بوجھ مجھے اٹھانا ہی ہے"

زندگی کے کھیل میں پہلا ایکٹ

اگر ہم یہ کہیں کہ ہم زندگی کے کھیل میں شامل وہ فنکار ہیں جن کے سامنے پہلا اور آخری ایکٹ کھیلا جاتا ہے تو غلط نہ ہو گا۔ ہم برسہابرس سے اس کھیل میں ایک ہی کردار نبھائے چلے جا رہے ہیں ہر دن، ہر لحظہ، ہر وقت!

دنیا کے سٹیج سے پردہ اٹھتا ہے، نیا فنکار قدم رکھتا ہے۔ پہلی چیخ بیتھوون کی سمفنی کی مانند سماعت میں رس گھولتی ہے اور ہمارے دل کی کلی کھل جاتی ہے۔ اس کی پہلی سانس اس غوطہ خور کی سی محسوس ہوتی ہے جو لمبی ڈائیو کے بعد پانی کی سطح پہ ابھرا ہو۔ اعضا کی پہلی حرکت تو کسی ماہر رقاص کے بھاؤ سے قطعی طور پہ کم نہیں ہوتی۔

آپریشن تھیٹر میں دو باتیں ہمارے دل کو چھو جاتی ہیں۔ ماں کے درجے پہ فائز ہونے والی کی آنکھیں اور ماں کا درجہ دینے والے کی معصوم ادائیں۔

آپریشن تھیٹر میں آنے والی خاتون جو ماں بننے جا رہی ہے پہ رات کی بے خوابی کے آثار نمایاں ہیں۔ پریشانی اور گھبراہٹ کی تحریر چہرے پہ پڑھی جا رہی ہے، امید بھری آنکھیں نم سی دکھائی دیتی ہیں۔

خاموش ماحول میں اجنبی چہرے ماسک پہنے ہر طرف گھومتے ہیں۔ اوزار لائے جا رہے ہیں۔ ایک کمرے کے وسط میں ایک لمبی سی میز پڑی ہے، سرہانے آکسیجن اور بے ہوشی والی دواؤں کے سلنڈر لگے ہیں، سر پہ تیز روشنی والی لائٹس لگی ہیں۔ جب مریض اس میز پہ لیٹتی ہے، آنکھوں کا رنگ بدل جاتا ہے، ڈر اور خوف آنکھوں میں سما جاتا ہے اور سمندر چھلک اٹھتا ہے۔

ایسے مواقع پہ ہم ہمیشہ اپنا ماسک منہ سے ہٹا کے اپنی شناخت کرواتے ہوئے مریض کا ہاتھ تھامتے اور اسے تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو اکیلا نہ سمجھے۔ آنکھوں کا موسم پھر بدل جاتا ہے۔ اب تشکر کے رنگ نمایاں ہیں۔ وہ ہمارا ہاتھ تھام لیتی ہے اور ہم اس لرزتے ہوئے ہاتھ کو اپنا لمس محسوس کرنے دیتے ہیں۔ جذبات کے اس دریا کو دونوں کناروں پہ الفاظ کی ضرورت نہیں پڑتی۔

آج کل میڈیکل سائنس سیزیرین کے لئے مکمل بے ہوشی کے حق میں نہیں سو مریض کا نچلا دھڑ سن کرنے کے لئے کمر میں ٹیکہ لگایا جاتا ہے۔ مریض جاگتی رہتی ہے۔ اس کے پیٹ اور چھاتی کے درمیان ایک پردہ تان دیا جاتا ہے۔ وہ ہمیں سنتی ہے اور ہم اکثر اس کے نام سے مخاطب کر کے اسے بتاتے ہیں کہ آپریشن شروع ہوا چاہتا ہے۔ اس وقت ہم اس کی آنکھوں میں جھانک نہیں سکتے لیکن ہمیں علم ہے کہ اب بے چینی اور انتظار کی کیفیت چھلک رہی ہوگی۔ آخر ہم بھی تو کبھی اس مرحلے سے گزرے تھے۔

آپریشن کا آغاز ہوتا ہے۔ جلد، چربی، فیشیا، ریکٹس شیت، پیری ٹونیم کی پرتیں کاٹتے ہوئے بطن تک پہنچ جاتے ہیں۔ ہماری اسسٹنٹ اور نرس کٹی ہوئی پرتوں کو پکڑ کے خون کا اخراج بند کرتی ہیں۔ ہماری نظر کے سامنے مثانہ اور رحم ہے۔ مثانے کو احتیاط سے علیحدہ کرتے ہوئے رحم میں کٹ لگاتے ہیں۔ پانی کی تھیلی سامنے ہے جس میں دور سے آنے والا مسافر تیر رہا ہے۔ تھیلی پھوڑی جاتی ہے اور ننھے فرشتے کا بالوں بھرا سر ہمارے سامنے ہے۔ ہم اپنا دایاں ہاتھ اس کے سر کے گرد حمائل کرتے ہوئے اسے باہر کی طرف کھینچتے ہیں، ماتھا، آنکھیں، ناک، منہ، ٹھوڑی۔ اب گردن کی باری ہے ہم اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں گردن کے گرد ڈالتے ہوئے احتیاط سے کھینچتے ہیں، کندھے، بازو، پیٹ، ٹانگیں، پاؤں۔ لیجیے دور دیس کا مسافر آن پہنچا۔ ہم مریض کو اونچی آواز میں بتاتے ہیں۔ اور ہمیں علم ہے کہ اب ان آنکھوں میں خوشی کے نقرئی رنگ بھر چکے ہوں گے۔

ننھا مسافر اتنی ہلچل دیکھ کے گھبرا جاتا ہے اور چیخ کی صورت میں آواز بلند کرتا ہے۔ اس چیخ کے ذریعے کائنات میں پہلی سانس بانسری کی سریلی کوک بن جاتی ہے۔ ہم سب

ماسک کے پیچھے مسکرا اٹھتے ہیں۔ ہماری سماعت میں یہ چیخ دنیا کی اعلیٰ ترین موسیقی سے کسی صورت کم نہیں کہ زندگی نے اپنی آمد کی اطلاع دی ہے۔

بچہ ماں کی ٹانگوں پہ لیٹا ماں کی آنول سے ہمیشہ کے لئے جدا ہونے کا انتظار کر رہا ہے۔ وہی آنول جس نے نو ماہ اسے ماں سے نہ صرف جسمانی خوراک کے کر دی بلکہ ماں کی ہر کیفیت اسی کے ذریعے بچے پہ اثر انداز ہوئی۔ کب کب ماں ہنسی اور روئی، کب محبت کے حصار میں رہی اور کب دھتکاری گئی، یہ اس ننھے فرشتے کو نو ماہ کی ہمراہی میں علم ہو چکا ہے۔

ننھا مسافر گھبرایا ہوا ہے۔ اسی اضطراب میں کبھی ہماری انگلی تھامتا ہے اور کبھی آنکھیں کھول کے مسکراتا ہے۔ ایک مرتبہ ننھے فرشتے کی گرفت اس قدر تھی کہ ہماری اسسٹنٹ نرس کو ہماری انگلی چھڑوانی پڑی۔ ادھر ادھر دیکھنے کے ساتھ ساتھ بازو اور ٹانگیں ہل رہی ہیں اور کوئی کوئی بچہ تو بول و براز سے بھی وہیں فراغت حاصل کر لیتا ہے۔ ہم سب ہنس پڑتے ہیں۔ ایک منٹ کے بعد آنول کاٹی جاتی ہے اور نرس کے حوالے کرنے سے پہلے ہم اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کے پردے کے اوپر سے مشتاق ماں کو دیدار کرواتے ہیں۔ اب کے بے قرار ماں کی آنکھیں ہیرے کی کنیاں بن کے چمکنا شروع ہو جاتی ہیں۔

نرس بچے کو لپیٹتی ہے اور ماں کی طرف بڑھتی ہے تاکہ بچہ شیر مادر کی لذت سے اسی گھڑی لطف اندوز ہو سکے۔ ماں کی آنکھوں میں قوس قزح جھلکنے لگتی ہے۔ ماں اور بچے کا پہلا لمس وہ لمحہ جاوداں ہے جو وہاں موجود ہر کسی کے دل کو ایک عجیب سی کیفیت میں مبتلا کرتا ہے۔ شاید ہر کوئی اپنی اپنی ماں کی گود کی گرمی اس لمحے میں پھر سے محسوس کر لیتا ہے۔

ہم رحم کو ٹانکے لگا رہے ہیں۔ بچہ سیر ہو کے پر سکون ہو چکا ہے، رونا تھم چکا ہے۔ ماں نے آنکھیں موند لی ہیں، اضطراب ٹھہر چکا ہے۔ رت جگے سے بھری آنکھوں پہ نیند کی دیوی دستک دے رہی ہے۔

ہم جلدی جلدی بطن کی ہر پرت کو ویسے ہی سی کے جوڑتے ہیں جیسے کاٹا تھا۔ تھکن تو ہے لیکن ایک اور زندگی سے ہاتھ ملانے کی فرحت شاد کرتی ہے کائنات کی تیرگی میں ایک اور امید نے جنم لیا ہے۔ تخلیق کے اس سفر میں ہم نے ایک عورت کو اپنی معراج پہ دیکھا ہے۔

یقیناً آپ کو علم ہو گیا ہو گا ہمیں اپنے کام سے کیوں محبت ہے؟

اکیسویں صدی کی تعلیم یافتہ بھیڑ بکریاں اور شرم حیا سکھانے والے

لو جی، تصویریں آ گئیں، دیکھ کے دل باغ باغ ہو گیا کہ یونی ورسٹی کے ارباب اختیار نے کچھ حیا سے عاری لڑکیوں کو باحیا بنانے کا بیڑا اٹھایا ہے اور اپنے ایمان کو خدا کے فضل و کرم سے محفوظ کر لیا ہے۔

ہمارے نزدیک وہ بہت زیادہ مبارک کے مستحق ہیں کہ معاشرے میں ایک نئے ٹرینڈ کے بانی ہیں۔ وہ کام جو ضیا الحق کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ صرف میڈیا کی عورتوں کے ساتھ محدود رہے، وہ آج ان کے پیروکاروں نے کر دکھایا۔

ایک اور لحاظ سے بھی وہ قابل تحسین ہیں کہ انہوں نے بچارے کم عقل، اور نا سمجھ ماں باپ کو گائیڈ کیا ہے جو غم روزگار میں الجھ کے اپنی بیٹیوں کو اعلی تعلیم یافتہ بنانے کا خواب دیکھ کر یونی ورسٹی تو بھیج دیتے ہیں مگر ساتھی طالب علموں سے لے کر استادوں تک، کو اذیت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اسی لئے کسی بہت ہی ذہین اور فطین شخص نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور ماں باپ کو آئینہ بھی دکھایا گیا ہے اور تنبیہ بھی۔

تصویریں بہت دل چسپ ہیں، بیک گراونڈ میں اقبال اور جناح ہیں اور ایک انتہائی صحت مند شخص انتائی دل جمعی سے لڑکیوں کے سروں پہ ہاتھ بھی رکھے ان کو چادریں اوڑھا رہا ہے۔

سٹیج پہ بیٹھے ہوئے لڑکوں کی کھلی ہوئی باچھیں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ لڑکے بے چارے تنگ تھے، روز روز رنگوں کی برسات دیکھ کے، اپنے آپ پہ جبر کرتے تھے جو صحت کے لئے انتہائی مضر تھا۔ اب کائنات کے مالک سے تو کہہ نہیں سکتے کہ لڑکی نام کی منحوس چیز پیدا ہی نہ کرے۔ اپنی آنکھوں کو ہر وقت جھکائے رکھنا بھی ممکن نہیں تھا تو بہتری اسی میں کہ ضیاالحق کی سوچ کو آگے بڑھایا جائے۔

ان تصویروں میں موجود لڑکیاں جو بیس بائیس سال کی دکھتی ہیں، یونی ورسٹی تک پہنچ چکی ہیں اور شہروں کی پروردہ ہیں۔ یہ اندرون سندھ کی وہ لڑکیاں نہیں جو سو کالڈ مہذب دنیا سے بہت دور یا تو کاری کر دی جاتی ہیں یا قران سے بیاہ دی جاتی ہیں۔ یہ قبائلی علاقوں کی وہ لڑکیاں بھی نہیں جو ونی کر دی جاتی ہیں یا غیرت کے نام پہ قتل کر دی جاتی ہیں۔ یہ دیہات کی وہ لڑکیاں بھی نہیں جنہیں نہایت چھوٹی عمر میں کسی وڈیرے یا سردار سے بیاہ دیا جاتا ہے۔ یہ وہ لڑکیاں نہیں جنہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکا جاتا ہے اور اپنے مالک کی غلامی کرنی پڑتی ہے۔

یہ شہر میں پیدا ہونے اور پرورش پانے والی لڑکیاں ہیں جن پہ زندگی اتنی نامہربان نہیں ہوتی۔ جو اپنے والدین کی مکمل اعانت کے ساتھ اپنے خوابوں کا پیچھا کرتی ہیں۔ یہی لڑکیاں، ونی اور کاری ہونے والیوں کے لئے ایک سورج کی کرن ہوتی ہیں، ایک ایسی سورج کی کرن جو ان کی اندھیری زندگی میں امید کی علامت ہوتی ہے، مالک کی غلامی سے آزادی کی علامت۔ اپنے قفس سے رہائی کی علامت۔

معلوم نہیں ان لڑکیوں نے اس سارے پاکھنڈ میں شامل ہونے کی حامی کیسے بھری؟ کیسے اپنے آپ کو اتنا ارزاں کیا کہ مردوں نے سر عام چادر اوڑھا کے انہیں پاکباز بنانے کی کوشش کی۔ کیا وہ اپنے آپ کو اب سے پہلے حیادار نہیں سمجھتیں تھیں اور اس محفل میں یہ سرٹیفکیٹ حاصل ہونے کے بعد انہیں حیا عطا ہوئی۔

اسلام کے احکامات آ چکے، ہر کسی کا مقام بیان ہو چکا، جزا اور سزا کا فیصلہ کا دن بھی متعین ہو چکا۔ یہ بھی بتایا جا چکا کہ اس دن کوئی کسی کو نہیں پہچانے گا، کوئی رشتہ ایک دوسرے کے پیچھے نہیں بھاگے گا، ہر کسی کو اپنی فکر ہو گی۔

مزید یہ کہ اسلام میں کسی قسم کا جبر نہیں، تربیت کرنا اور سیدھے راستے پہ رہنے کی تلقین کرنا ہر ماں باپ کا فرض، مگر جب بچے جوان ہو جائیں، معاشرے کے ذمہ دار افراد بن جائیں تو ان کے سارے اعمال ان کی اپنی ذمہ داری بن جایا کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ایک پڑھی لکھی، اکیسویں صدی کی لڑکی، کیا حیا اور اس کے تقاضوں سے بے خبر ہے؟ ایک لڑکی نے کیا پہننا ہے، کیسے زندگی گزارنی ہے یہ اس کی ذاتیات ہے اور یا پھر اس کے والدین کا معاملہ۔

مجھے تو ان لڑکیوں کی عقل پہ حیرانی ہے جو مردوں کے اس کھیل میں شریک ہو کے ان حضرات کو محظوظ ہونے کا موقع دے رہی ہیں۔ لڑکیاں نہ ہوئیں بھیڑ بکریاں ہو گئیں، یونی ورسٹی پہنچ کے معاشرے کے انتہائی تعلیم یافتہ لوگوں میں شمار اور عزت نفس دو کوڑی کی۔ اگر چادر اوڑھنی ہے تو خود اوڑھو، اپنا حلیہ خود طے کرو، کیا تم مسلمان نہیں، کیا تمہیں احکامات نہیں پتہ، کیا تم باڑے میں ہانکی جانے والی جانور ہو جس کی زندگی، حلیہ اور قسمت مالک کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ مگر یہ یونی ورسٹی والے تو تمہارے مالک بھی نہیں۔ پھر تم نے ان کو اپنا تماشا کیوں لگانے دیا؟ کیوں اتنی ارزاں ہو گئیں تم؟ کیوں رول دیا تم نے اپنے آپ کو، ان سستی شہرت حاصل کرنے کے شوقینوں کے ہاتھوں۔ ان مذہب کے ٹھیکیداروں کے حوالے کیوں کیا خود کو؟

اگلی حیرانی ان صاحب پہ ہے جو بلا تکلف لڑکیوں کو چھو رہے ہیں، سر پہ ہاتھ پھیرا جا رہا ہے۔ انتہائی قربت سے چادر پہنائی جا رہی ہے، کہیں کہیں جامے سے نکلا ہوا پیٹ نظر آ رہا ہے۔ کیا ان صاحب کو معلوم ہے کہ وہ کس غیر ذمہ داری کا شکار ہو کر یہ سب کر رہے ہیں؟ کیا سر عام کسی اور کی بیٹی کو چھونے کا حق انہیں حاصل ہے؟ کیا کسی کی عزت کرنے کے لئے اس کے سر پہ ہاتھ رکھنا ضروری ہے؟ جب اسلام کے اصولوں پہ عمل کروانا آپ کی ذمہ داری نہیں، تو آپ کس خوشی میں راجہ اندر بنے کھڑے ہیں؟

تصویر میں بیٹھے لڑکوں کے تاثرات دیکھ کر لگتا ہے کہ ان کی مردانہ ایگو آج بہت بلند ہے۔ وہ لڑکیاں جو سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھیں آج کیسے منہ میں گھنگنیاں ڈالے کھڑی ہیں۔ بظاہر ان نوجوانوں کی آنکھوں میں ایک خواب سج رہا ہے جب وہ بھی عمر کے کسی

جسے میں ایسی ہی لڑکیوں کو حیا سکھانے کے بہانے چھو رہے ہوں گے۔ ایک ٹکٹ میں دو مزے۔

قائد اپنی تصویر میں حیران بیٹھے ہیں کہ یہ آئیڈیا انہیں کیوں نہ آیا؟ اپنی بہن کو بھی چادر اوڑھاتے اور دوسروں کی بہنوں کو بھی۔ ایسے ہی اپنی بہن کو حیا نہ سکھائی اور ہر جگہ مردوں کے ہجوم میں بغیر چادر کے لئے پھرے۔

ہے نا قائد کا فیلیر!

اقبال بھی سوچ رہے ہیں کہ عطیہ فیضی کے ساتھ اتنا وقت گزارا، اتنی خط و کتابت ہوئی، کاش ان کی عاقبت کی فکر بھی کی ہوتی ایک چادر اوڑھا کے۔

میں سوچ رہی ہوں، منٹو اور عصمت چغتائی ہوتے تو کیا کہتے؟ منٹو مسکراتے ہوئے کہتے "کھول دو کے بازی گروں کو اوڑھا دو کی فن کاری آگئی"

اور عصمت پکارتیں "پاکھنڈ ہے سب، سالوں کا، چھونے کے نت نئے بہانے"

جیکولین کینیڈی کا گلابی لباس اور بے نظیر بھٹو کا نیلا جوڑا

دوستوں سے ملاقات طے تھی!

ہم لباس منتخب کرنے کی کشش و پیچ میں تھے کہ نسیم آپا چائے لے آئیں اور یہ کہتی ہوئی تشریف لے گئیں کہ میں نے آپ کا گلابی جوڑا نکال دیا ہے وہ پہن لیجیے۔

"گلابی کپڑے" ہم زیر لب بڑبڑائے اور آج تاریخ کیا ہے" بائیس نومبر"

چھن سے تاریخ کے اوراق سے ایک یادگار گلابی لباس ہماری آنکھوں کے سامنے آٹھہرا۔ تو چلیے، تاریخ کا سفر کرتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ آج کے دن کس نے گلابی لباس بہت ارمانوں سے پہنا جو بعد میں ایک المناک انجام سے دوچار ہوا اور تاریخ کا حصہ بنا۔

تاریخ میں بدقسمت قرار دیا جانے والا یہ لباس مشہور عالم فیشن ڈیزائننگ کمپنی "شینل" نے بنایا تھا۔ اسے امریکہ کی خاتون اول جیکولین کینیڈی نے بائیس نومبر 1963 کی صبح زیب تن کیا تھا، جب وہ اپنے شوہر صدر جان ایف کینیڈی کے ساتھ ریاست ٹیکساس کے شہر ڈیلس کے سرکاری دورے پہ گئیں۔

جیکولین کینیڈی کا ذکر ان خواتین میں ہوتا ہے جو شہرت کے لئے اپنے شوہر کینیڈی کی محتاج نہیں تھیں۔ وہ پیشے کے لحاظ سے فوٹوگرافر تھیں اور انتہائی خوش لباس اور خوش شکل ہونے کی بنا پر فیشن اور کلچر کا بین الاقوامی استعارہ سمجھی جاتی تھیں۔

اکیس نومبر، انیس سو تریسٹھ کی شام صدر کینیڈی نے جیکولین سے کہا،

" میں چاہتا ہوں تم کل ڈیلس میں ہونے والے ظہرانے میں منفرد نظر آؤ، ان تمام خواتین میں سے جو قیمتی منک کوٹ میں ملبوس ہوں گی۔ کیا ہی اچھا ہو اگر تم اپنا گلابی

لباس پہنو اور دکھادو کہ سادگی میں شاندار نظر آنے کے لئے ہیرے جواہرات کی ضرورت نہیں ہوتی"

یہ گلابی لباس جیکولین چھ مختلف مواقع پر پہن چکی تھیں اور صدر کینیڈی کے ساتھ ساتھ ان کا بھی یہ پسندیدہ لباس تھا۔ لیکن کسے خبر تھی کہ یہ لباس ایک ایسے کا حصہ بن کے تاریخ میں امر ہو جائے گا۔

ڈیلس پہنچنے پہ جیکولین اور کینیڈی ایک نیلی کھلی لیموزین میں سوار ہوئے۔ جیکی کینیڈی کھلے آسمان تلے روشن صبح میں نیلے کالر والے گلابی لباس میں دمک رہی تھیں۔ سڑک پر دونوں طرف لوگ استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ اور پھر یک گولی چلنے کی آواز آئی اور ہر طرف خون بکھر گیا۔

"یہ منظر ابھی بھی میری آنکھ میں زندہ ہے۔ کار کی پچھلی سیٹ پہ گلابی رنگ کا ڈھیر تھا جیسے گلابی پھول ہر طرف بکھرے ہوں۔ یہ جیکی تھیں جو اپنے خون آلود شوہر کے جسم پہ جھکی ہوئی تھیں "

نائب صدر لنڈن جانسن کی بیگم نے اخباری نمائندوں کو بتایا۔

جیکی کا گلابی لباس اپنے شوہر کے خون سے تر ہو چکا تھا، اور وہ اسی حالت میں ہسپتال پہنچیں۔ صدر کینیڈی زندگی کی بازی ہار چکے تھے۔ جیکی کینیڈی کو خون آلود لباس بدلنے کے لئے کہا گیا مگر جیکی نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا

" میں چاہتی ہوں سب دیکھیں کہ جیک کے ساتھ کیا کیا گیا ہے "

اور کچھ ہی گھنٹوں کے بعد جب لنڈن جانسن نے ایک طیارے میں امریکہ کا چھتیسواں صدر ہونے کا ہنگامی حلف اٹھایا تب بھی جیکولین اسی لباس اور اسی حلیے میں تھیں۔

"ان کے بال چہرے پہ گرے ہوئے تھے اور وہ خاموش تھی، بہت خاموش۔ ان کا لباس، دستانے اور بائیں ٹانگ پہ خون کے دھبے تھے، ان کے شوہر کے خون کے دھبے۔ یہ ایک اداس لمحہ تھا۔ انتہائی حسین خاتون، شاندار لباس اور شوہر کے خون سے لتھڑا ہوا لبادہ"

آنے والے برسوں میں جیکی کو ساری عمر افسوس رہا کہ انہوں نے اپنے چہرے سے لہو کے دھبے کیوں صاف کیے؟

جیکی نے شوہر کے پسندیدہ لباس میں ہی ان کی لاش کے ساتھ وائٹ ہاؤس واپسی کا سفر کیا۔ واشنگٹن میں گھر پہنچنے پہ انہوں نے جب لباس تبدیل کیا تو یہ لباس ان کی والدہ کے حوالے کر دیا گیا جنہوں نے اپنے ہاتھ سے اسے ایک ڈبے میں محفوظ کیا اور اس پہ ایک چٹ لکھ کے لگائی، 22 نومبر، 1963۔ لباس کے ساتھ پہنا جانے والا ہیٹ جیکی نے گاڑی میں ہی اتار پھینکا تھا اور وہ ہیٹ ایک گمشدہ داستان بن گیا۔

تاریخ کا یہ مشہور عالم گلابی لباس بعد میں امریکن تاریخ کا حصہ بنا اور قومی آرکائیوز میں محفوظ کیا گیا۔ تاہم یہ عوام کی نظر اور پہنچ سے دور رکھا گیا ہے اور یہ جیکی کی بیٹی کیرولین کینیڈی کا فیصلہ ہے۔ 2103 تک قومی آرکائیوز کا شعبہ اس فیصلے کا احترام کرنے کا پابند ہے۔

یہ لباس صرف اس لئے اہم نہیں کہ یہ کینیڈی اور جیکی کی رفاقت کے آخری لمحوں کا گواہ تھا، بلکہ اس لئے کہ یہ ایک عورت کے احساسات کی ترجمانی بنا۔ ایک عورت نے اپنے محبوب شوہر کو اپنے ہاتھوں میں دم دیتے دیکھا اور اس کا غصہ، دکھ، رنج، بے بسی، اور

بے چارگی اس خون آلود گلابی لباس نے دنیا میں اجاگر کر دی۔ یہ لباس ایک احتجاج اور ہار نہ ماننے کا اعلان بنا اور پوری دنیا نے اس کو محسوس کیا۔

یونہی خیال آیا!

ہمارے ہاں بھی ایک وزیر اعظم خاتون نے زندگی ہاری تھی۔ اسی طرح سر پہ گولی کھائی تھی۔ اسی طرح خون کے چھینٹے اڑے تھے اور اسی طرح گاڑی خون آلود ہوئی تھی۔ یقیناً کسی نے سر بھی گود میں رکھا ہو گا۔ کیا کسی نے بے نظیر بھٹو کا لباس اور چادر محفوظ کرنے کا سوچا؟ وہ بھی ہار نہ ماننے والی عورت تھی، کیا ہم اس کی طاقت اور مزاحمت کی نشانیاں محفوظ رکھنے کی اہلیت نہیں رکھتے یا ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہمیں تو سڑکوں سے لہو کے نشان اور جرم کے شواہد دھونے کی عجلت در پیش ہوتی ہے۔

تاریخ تو کہانیوں سے زیادہ شواہد پہ یقین رکھا کرتی ہے!

خون سے بھیگے ہوئے کچھ لفظ
ٹوٹ کے بکھرتے ہوئے ہوئے کچھ حرف
وہ آخری دموں کی سرگوشیاں
وہیں فضا میں تیرتی ہیں
اور تمہارا حق اور سچ کی خوشبو سے بھرا لباس
خون آلود چادر
وہیں کہیں کسی کوڑے کے ڈھیر پہ
شاید منتظر ہے آج بھی
ان قدردان ہاتھوں کی
جو اسے تمہاری جدوجہد کا استعارہ بنادیں
ہم شرمندہ ہیں تم سے!

جج ہی نہیں، ڈاکٹر بھی صاحب دل ہوتے ہیں

رہ رہ کے تاؤ آ رہا ہے اپنے آپ پہ، بھلا اتنی جلد دنیا میں نازل ہونے کی ضرورت کیا تھی؟

چالیس سال پہلے کی ہمارے بچپن کی دنیا!

اتنی بور کہ آج کے بچوں کا سانس بند ہو جائے! نہ انٹرنیٹ، نہ سوشل میڈیا، نہ سو پچاس چینل، نہ سمارٹ فون، نہ لیپ ٹاپ، نہ ٹویٹر، نہ واٹس ایپ، نہ فیس بک، نہ انسٹا گرام، نہ کچھ اور۔ ہمیں تو ان کمبختوں کے پوری طرح نام بھی نہیں آتے!

اب حیرت ہے کہ ہم آخر کرتے کیا تھے؟ شاید کچھ بھی نہیں، تو پھر زندہ کیسے تھے؟ شاید " بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے" والا معاملہ تھا۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر ہمیں اتنا تاؤ کیوں؟ اتنا محرومی زدہ غصہ کیوں؟

بات یہ ہے کہ جب سے نیب کے چیئرمین صاحب کے ایک صاحب کی نازبرداری کرنے والے آڈیو اور وڈیوز کا جلوہ ہوا ہے، دل بے طرح کچوکے لگا رہا ہے، مان کے ہی نہیں دے رہا کہ ہم سے کتنی بڑی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں!

قصہ کچھ یوں ہے کہ راہ حیات میں بے شمار مقام آہ و فغاں ایسے آئے جہاں آج کی دنیا کے یہ سب آلات استعمال کیے جا سکتے تھے اور کافی رنگین داستانیں دنیا کو سنائی بھی جا سکتی تھیں اور دکھائی بھی، اور ہم نے یہ ہمت ہی نہ دکھائی۔

یقین جانیے، ہمارے پھسڈی پن میں سارا قصور ہمارا ہی نہیں تھا، بس زمانہ دغا دے گیا کہ سٹیو جابز اور بل گیٹس نے ابھی ایقان کی منزلیں نہ طے کی تھیں اور جہان ہفت ابھی روپوشی میں تھا!

ان سب داستانوں میں ہمارا رول ایک تماشائی کا سا رہا۔ اس کی وجہ قطعی یہ نہ تھی کہ ایک دفعہ آئینہ دیکھ کے دوسری دفعہ کی تمنا نہ ہوتی تھی۔

تماشائی رہنے اور بننے کی تین وجوہات تھیں۔ ایک تو ہماری زبان جو موقع دیکھتی تھی نہ محل، بس مشین گن کی طرح فائر کیے جاتی تھی سو لوگ پہلی ملاقات میں ہی خوفزدہ ہو جاتے اور شفقت نہیں فرماتے تھے۔ (زبان کا اندازہ ہمارے قاری اب تک لگا ہی چکے ہوں گے)

دوسری وجہ ہماری غصہ آور گھوری والی شکل جسے پہلی دفعہ میں لوگ دیکھ کے ڈرتے، دوسری دفعہ میں مغرور سمجھتے، اور تیسری دفعہ دیکھنے کی ہمت ہی نہ ہوتی۔ (اب پتہ چلا آپ کو 'ہم سب' پہ ہماری پہلی تصویر کیوں بدلی گئی)

تیسری اور سب سے اہم وجہ تھی ہمارے میاں اور وہ بھی فوجی!

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

چلیے آپ کو کچھ قصے سناتے ہیں!

ہم ایک بہت بڑے ہسپتال میں کام کر رہے تھے۔ ہمارے سینیر ڈاکٹرز میں بہت مرد شامل تھے۔ ان میں سے ایک، پچاس سے اوپر کا سن، خوب گھاگ، اور گھیرنے کا اپنا انداز!

ہر نئی آنے والی کو میرا بچہ کہہ کے مخاطب کرتے۔ اب اکثر لڑکیاں اتنے پروٹیکٹڈ ماحول سے ہوتیں کہ انہیں اس شفیق انداز میں باپ کی شفقت نظر آنا شروع ہو جاتی اس سے آگے نظر ہی نہ جاتی۔

اب وہ ڈاکٹر صاحب پہلے کندھے پہ ہاتھ رکھتے، نامحسوس طریقے سے قریب کرتے اور پھر میرا بچہ میرا بچہ کہتے کہتے کمر پہ ہاتھ چلتا رہتا۔ نئی آنے والی کو قطعی سمجھ نہ آتا کہ کیا کرے؟

ہاتھ جھٹکے تو شاید وہ برا مان کے کہیں کہ تمہارے دماغ کا فتور ہے میں تو شفیق سینیر کا رول ادا کر رہا ہوں اور اگر کچھ نہ کہیں تو کیا اپنے عورت ہونے کا تاوان دیں!

کاش نہ ہوا کیمرے والا فون اپنے ہاتھ میں!

انہیں آئس کریم کھانے کا بھی بہت شوق تھا اور وہ بھی کسی " میر ابچہ " کے ساتھ ایک کپ میں۔ ان کی بد قسمتی کہ کسی وارڈ میں آنے والے شرارتی صحافی نے سب دیکھا، ریکارڈنگ کی سہولت تو نہ تھی پر رپورٹ تو کیا جا سکتا تھا۔ اگلے دن چشم فلک نے اخبار میں ان کی حرکتوں کی تفصیل دیکھی، ویسے ہی جیسے نیب کے چیر مین کی دیکھی گئیں۔

اب چئر مین صاحب کا رد عمل تو ہمیں معلوم نہیں مگر ہمارے وارڈ میں قیامت آ چکی تھی۔ زخمی شیر چنگھاڑ تا پھر رہا تھا، ان کا شک ان سب لوگوں پہ تھا جو ان کی مہربانیوں کے حلقے سے باہر تھے کہ ان میں سے کس موذی نے یہ خبر لیک کی ہے۔ خیر چور کو پکڑنے کے لئے قران پہ ہاتھ رکھوا کے سب سے پوچھا گیا۔ ہم اس وقت بہت نا سمجھ تھے، وارڈ کے گھاگ مردوں کے گروہ جو زندگی کی پچپن سے زیادہ بہاریں دیکھ چکے تھے، سے کچھ نہ کہہ سکے۔

آج سوچتی ہوں کہ منہ کیوں نہ نوچ لیا جب قران پہ ہاتھ رکھوا کے پوچھا گیا!

ایک اور پروفیسر صاحب تھے جو ہر نئی آنے والی ڈاکٹر کو کمرہ بند کر کے پڑھانے کے بہت شوقین تھے، اب خدا جانے علم کی منزلیں طے ہوتی تھیں یا ٹھرک کے زینے!

کسی کانفرنس میں گروپ کی صورت جانا ہوتا تو پروفیسر صاحب اپنی کار کی فرنٹ سیٹ سب سے خوبصورت لڑکی کو عطا کرتے! ہم اور ہم جیسے کئی اور ویگن پہ جھولتے منزل پہ پہنچتے!

جب ہم ذرا بڑے ہوئے، یعنی تھوڑے سے سینیر، تو کئی جگہ زیر عتاب آ جاتے کہ پروفیسر اور منظور نظر کے درمیان آنے کی غلطی کر بیٹھتے۔ کبھی کبھی کسی معمولی بات پہ تحریری جواب دہی طلب کر لی جاتی، زخم کھایا ہوا ہوس زدہ کچھ تو کرے گا نا!

کسی کسی جگہ تو با قاعدہ سزا کا سسٹم نافذ تھا۔ آپ پیش قدمی کا خیر مقدم کریں تو آپ کا سر گھی میں اور انگلیاں کڑاہی میں کہ سرجری بھی سکھائی جائے گی، مقام اعلی بھی مل جائے گا اور غلطیوں سے بھی چشم پوشی ہو گی۔

لیکن اگر لڑکی نے سوچ لیا کہ وہ اس کام میں حصہ دار نہیں بننا چاہتی تو پھر اس کی جگہ وہی جو ہسپتال کے خاکروب کی۔ آئیں، نچلے درجے کا کام کریں، کچھ بھی نہ سکھایا جائے اور ٹریننگ کا وقت پورا ہونے پہ روانہ ہو جائیں۔

ڈاکٹر لڑکیوں کے مسائل اپنی جگہ، مریض لڑکیوں پہ بھی بدرجہ اتم شفقت برتی جاتی تھی۔ ہم ایک چھوٹی جگہ کے چھوٹے ہسپتال میں کام کر رہے تھے۔ ہم نے راؤنڈ کے دوران ایک ڈاکٹر کو ایک لڑکی کا معائنہ کرتے دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب بہت دیدہ دلیری سے نو گو ایریاز میں اپنے ہاتھ لے جا رہے تھے، جہاں معائنے کی ضرورت ہی نہ تھی اور کم سن مریضہ اس کو بھی معائنے کا حصہ سمجھ رہی تھی۔

اپنے مقام اور حثیت سے عورت کا فائدہ اٹھانا، دوسرے لفظوں میں گدھ کا روپ دھارنا، یہ وہ ناسور ہے جو صرف ہمارے معاشرے میں نہیں، دنیا بھر میں پایا جاتا ہے۔ اب تبدیلی یہ آئی ہے کہ جو بات پہلے عورت کے لئے باعث شرم سمجھی جاتی تھی اور معاملہ رفع دفع کرنے کو ہی اچھا جانا جاتا تھا۔ اب عورت نے یہ سمجھ لیا ہے کہ شرم حملہ آور کے نصیب میں آنی چاہیے، معاشرے میں تھو تھو اس کا حق ہے جو دست دراز ہے، اس کا نہیں جس کو مجبور جان کے کھلواڑ کیا گیا ہے۔

ہم بہت خوش ہیں اس انقلاب سے جو الیکٹرونک کی دنیا میں آیا اور جو عورت کے من میں آیا۔ اب عورت وہ کچھ دنیا کو دکھا سکتی ہے جو پہلے بند کمروں کے اندر تو تھا، باہر نہیں۔ اگر کوئی جیالی ہمت بھی کرتی تھی تو بری طرح جھٹلا دی جاتی تھی۔

اب سب دکھتا ہے اور سب بکتا بھی ہے!

کیا ہوا جو معاشرہ سنگ لے کے کھڑا ہے، جسم کے زخم ہیں بھر جائیں گے۔

روح کا کیا کریں گے جناب جسے معاشرے کے گدھ عرصے سے نوچ نوچ کے کھا رہے ہیں اور عورت ان دیکھے بوجھ تلے صدیوں سے سسک رہی ہے!

بونے آدمی اور عورت کا سہارا

کالم لکھا تو نامی گرامی مرد نے تھا پر عنوان بڑا زنانہ تھا "زنانہ جمہوریت" - پڑھا تو اندر سے اور بھی زنانہ تھا۔ عورت اور ہیجڑے میں بال برابر فرق نظر آیا تھا انہیں۔ خیر ہیجڑا بھی ہماری طرح ہی کی مخلوق ہے اس لئے ہمیں تو فرق نہیں پڑتا لیکن وہ زندگی کو کس رخ سے دیکھتے ہیں، اس کی قلعی کھل گئی۔

عورت اور گالی، گالی یا عورت، ایک ہی جنس کے دو نام ہیں اور پدرسری معاشرے کا مرد بہت نازاں ہے اس پہ۔

کسی دوسرے کی تضحیک کرنی ہو، کسی کی بھد اڑانی ہو، مذاق کرنا ہو، تحقیر مدعا ہو، کسی کو کمزور بتانا ہو، کسی کا ٹھٹھا اڑانا ہو، عورت ہے نا- آپ کی ہر مشکل میں آپ کا ہتھیار۔

"یہ عورتوں کی طرح آنسو کیوں بہا رہے ہو؟"

"بڑے بزدل ہو یار عورتوں کی طرح"

"یہ منمنا کیوں رہے ہو عورتوں کی طرح، مرد بنو مرد"

"عورت جیسا نازک دل ہے تیرا"

"تیرے منہ میں تو زبان ہی نہیں کھلتی، عورت کی طرح"

"یار تو نخرے بڑے کرتا ہے عورت کی طرح"

کسی صورت حال کا تجزیہ ہو، بازی الٹ رہی ہو، کوئی بات مناسب حال نہ لگ رہی ہو، پھر پڑ جائے گی ضرورت اس نام کی جو آپ کو ریلیکس کر دے

"جمہوریت زنانہ ہے"

"سیاست رنڈی ہے"

"دولت لونڈی ہے"

یہ تو ہوا جہاں ہمارے مرد کی زبان پھر بھی قابو میں تھی۔ تماشا اس وقت ہوتا ہے جب عورت کے اعضائے مخصوصہ کا ذکر کلاشنکوف کی طرح منہ سے خارج ہوتا ہے، اپنی ذات کی بھڑاس نکالنے کے لیے۔ حسرت ہے کوئی جی دار، ماں بہن کی جگہ باپ بھائی کا استعمال کر چھوڑے تو کیا ہی لطف ہو۔

ہماری ایک دوست کے میاں بہت گالیاں دیتے تھے بس تکیہ کلام کے طور پہ زبان سے نازل ہوتی رہتی تھیں۔ پیار سے سمجھایا، غصہ دکھایا پر کچھ اثر نہ ہوا۔

چونکے وہ اس دن جب ان کی ماں بہن کی بلاضرورت یاد کے سامنے ہماری دوست کے منہ پہ باپ بھائی کی تعریف تھی۔ سو نتیجہ یہ نکلا کہ اب وہ کچھ بھی بولنے سے پہلے سوچتے ضرور ہیں۔

کسی اور سے کیا گلہ کریں، جب ہمارے کپتان صاحب بھی اسی ڈگر کے راہی ہیں۔ کسی کی ٹانگ کھینچنے کے لئے انہیں بھی ایک صاحبہ کی ضرورت پڑ ہی گئی۔ جوش خطابت میں یا جوش طنز و مزاح میں وہ یہ بھول گئے کہ انہوں نے اپنی سیاست ہی ایک صاحبہ کے نام پہ ہسپتال بنا کے چمکائی ہے۔

ان سب مردوں کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اپنی نصف بہتر صاحبہ کی بے شک عزت نہ کریں لیکن وہ دنیا میں آنے سے پہلے ایک صاحبہ کے بطن میں ہی براجمان تھے اور وہی ان کو نو ماہ لئے لئے پھری تھی۔ اور جس عمل کا وہ دن رات ذکر کرتے نہیں چوکتے وہ اسی کی پیداوار ہیں۔

ہمیں یہ سب مرد کمزور دکھتے ہیں جنہیں ہمیشہ بات پہنچانے کے لئے ایک سہارے کی ضرورت رہتی ہے اور سہارا بھی کونسا جس کو کمزور سمجھ کے اس پہ حکمرانی کرنا چاہتے ہیں۔

میری دنیا کے جی دارو، حکمرانی سے پہلے آداب حکمرانی تو سیکھ لو، عظمت کے تاج بونوں پہ نہیں سجا کرتے۔

واہت تونا کا آرٹ: پاؤں کی جوتی سے منہ پر جوتی تک

گو کہ ہمیں خبریں سننے کا قطعی کوئی شوق نہیں لیکن پچھلے دنوں اس قدر شور و غوغا تھا کہ ہمیں کان دھرنا ہی پڑے۔

سنا ہے کوئی وزیر مشیر ٹی وی پہ آئے اور اپنی زنبیل سے جوتے برامد کر کے میز پہ پٹخ دیے۔ اینکر اور ساتھی تو محظوظ ہوئے ہی، اہل پاکستان کی بھی باچھیں کھل گئیں۔ پاکستان میں چونکہ تفریح کی شدید کمی ہے سو ایک مفت کا تماشا لوگوں کے ہاتھ لگا، خوب ٹھٹھے لگے۔ یوں مہنگائی اور سردی کے مارے ہوؤں کے سٹریس میں خاطر خواہ کمی ہوئی۔ تحریک انصاف کے سر پہ ایک سہرا اور سجا کہ عوام کی صحت کا بھی خیال رکھنے کا کماحقہ بندوبست ہے۔

ہمیں تو ان مشیروں، وزیروں اور اینکروں سے کچھ لینا دینا نہیں، نہ ہی جوتوں کے شجرہ نسب کھنگالنے کا کوئی شوق ہے۔ ہمارے کان یوں کھڑے ہوئے کہ رنگا رنگ جوتے پہننے کا بہت شوق ہے۔ موقع محل کی مناسبت، لباس کی میچنگ، پاؤں کی سہولت اور آرام سب مد نظر رہتا ہے۔

ہسپتال میں لوفرز، جمنیزیم میں ٹریزز، سیر کے لئے جاگرز، سفر کے لئے فلیٹ، اور پارٹی کے لیئے اونچی ایڑی۔ دوسری قومیتوں سے تعلق رکھنے والے ہمارے ساتھی اکثر پریشان ہو کے ہم سے پوچھ لیتے ہیں کہ ہم اتنے جوتوں سے کیسے نباہ کرتے ہیں؟

ہم آہستہ سے دل ہی دل میں جواب دیتے ہیں، کیسے بتائیں تم لوگوں کو کہ پاکستانی عورت تو بچپن سے ہی جوتے کھانے کی عادی بن جاتی ہے۔ جوتوں کے ساتھ مزے مزے کی گالیاں، بقدر ضرورت تھپڑ اور گھونسہ اضافی سہولیات ہیں۔

جوتوں سے تواضع کی تیاری والدین بچپن سے ہی کروانا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر بچیاں فرمائشوں اور خواہشوں کی تھوڑی ضد وغیرہ پکڑیں تو فوراً پیش گوئی کر دی جاتی ہے کہ یہ ہونہار سسرال میں خوب جوتے کھائے گی۔ ماں باپ کے منہ سے یہ سنہری الفاظ سن کے بچی بے چاری کی سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ جوتے کھانا شادی کے کس پیکج کا حصہ ہے؟

عورت کو جوتے رسید ہونے کی تیاری میں صرف ماں باپ ہی حصہ نہیں ڈالتے، یہ کام خاندان کا ہر فرد کماحقہ کر رہا ہوتا ہے۔

"سنو، بیٹی کو اتنی آزادی مت دینا، تمہیں جوتے پڑوائے گی"

"دو جوتے روز مارا کرو، عقل ٹھکانے رہے گی"

"دوں ایک جوتا، ہمارا چونڈا اکٹوائے گی کیا"

دن رات جوتے سے پذیرائی ملنے کی پیش گوئی کے بعد مستقبل کے اندیشوں میں گھری دلہن سسرال کے کچھار میں پہنچتی ہے تو پہلے ہی دن سمجھا دیا جاتا ہے کہ بی بی کسی یوٹوپیا میں مت رہنا یہاں تمہارا مقام کبھی جوتے کی نوک ہوگی اور بوقت ضرورت پاؤں کی جوتی۔

لیجیے جناب، وزیر صاحب کے جوتوں نے تو ہمیں نہ جانے کیا کچھ یاد دلا دیا۔ پاکستان میں تو جو ہوتا ہے سو ہوتا ہے لیکن ہمسایہ ملک ترکی کے ایک آرٹسٹ نے انہی جوتوں کو کرب کی علامت بنا کے ابھارا ہے۔ خبر ہے کہ سالانہ اعداد و شمار میں 2018 میں ترکی میں گھریلو تشدد کے بعد شوہروں کے ہاتھوں ہلاک ہونے والی عورتوں کی تعداد چار سو چالیس تھی جو دو ہزار سترہ کے مقابلے میں زیادہ رہی۔

حساس دل کے حامل آرٹسٹ واہت تونانے دل گرفتگی کے عالم میں سوچا کہ اس ظلم کے متعلق عوام الناس میں آگہی کیسے پیدا کی جائے،

"میں چاہتا تھا سڑک سے گزرنے والا ہر شخص یہ یادگار دیکھے۔ میں اپنے کام کی نمائش آرٹ گیلری کے کسی بند کمرے میں نہیں کرنا چاہتا تھا"

واہت نے زندگی ہارنے والی ان چار سو چالیس مقتول عورتوں پہ ہونے والے اس ظلم و تشدد کو چار سو چالیس جوتوں کے جوڑوں کی شکل میں اجاگر کیا ہے جنہیں ایک آرٹ انسٹالیشن کی صورت میں استنبول میں ایک دیوار پہ ٹانگا گیا ہے۔ 260 میٹر لمبی دیوار پہ ٹنگے

440 جوتے ان عورتوں کی کہانیاں سناتے ہیں جو خامشی سے گھروں کے اندر ماری گئیں۔ وہ کہانیاں جو کبھی کہی نہیں گئیں، جو کبھی سنی نہیں گئیں۔ یہ جوتے علامت ہیں ان تمام چیخوں کی جو بڑی بڑی دیواروں کے پیچھے گلے میں ہی گھٹ گئیں۔

واہت کا کہنا یہ ہے کہ میرا یہ کام صرف آرٹ انسٹالیشن ہی نہیں بلکہ قتل کی جانے والی عورتوں کی آواز بھی ہے جسے روزانہ ہزاروں لوگ دیکھتے اور سنتے ہوئے گزرتے ہیں۔

ہمیں یوں محسوس ہوا کہ جوتے نہ صرف ان عورتوں کی یادگار ہیں بلکہ خاموش زبان میں عورت کا مرد کی زندگی میں مقام بھی واضح کرتے ہیں۔ زندگی کے ہر سرد و گرم میں سختیاں جھیل کے ساتھ دینے والا کس خاموشی سے تاریک راہوں میں مارا جاتا ہے کسی کو خبر ہی نہیں ہوتی۔

آگ میں جھونکی گئی آنکھوں سے پوچھو
تم نے دیکھی اور سہی ہیں
ان گنت شعلوں کی بل کھاتی زبانیں

حاکمیت مردوں کی ہے تو عورت ریپ کیوں ہوتی ہے؟

23 مارچ ہے۔ ٹھیک 80 برس پہلے ہندوستان کے مسلمانوں نے تقسیم کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ مطالبہ تسلیم ہو گیا، دو ملک وجود میں آ گئے لیکن اس تقسیم کے اسکرین پلے سے آج تک لہو ٹپک رہا ہے۔ لہو جو شریانوں کو کاٹ کے بہایا جاتا ہے۔ لہو جو عزتوں کی ہولی کھیل کر آنکھوں کے راستے ٹپکایا جاتا ہے۔

ایک کتھا سنانا چاہتے ہیں ہم!

یہ کہانی سات دہائیوں سے کہی جا رہی ہے لیکن اذیت ہے کہ زائل نہیں ہوتی، درد ہے کہ کم نہیں ہو پاتا۔ زخم ہے کہ مندمل نہیں ہوتا۔ یہ صرف ایک خطہ زمین بانٹ لینے کی نہیں، ان گنت دلوں کی تقسیم کی داستان ہے جہاں دو قوموں نے اپنے آدرشوں کے مطابق زندگی جینے کا طریقہ ڈھونڈا تھا۔

دیس کا خواب دیکھنے کا آغاز تو بہت پہلے ہوا لیکن تیئیس مارچ انیس سو چالیس کو اس خیال کو ایک مطالبے کی شکل دی گئی۔ اب ہر طرف تعبیر کا انتظار تھا، امیدیں ہر طرف مسرت کی کرنیں پھیلاتی تھیں، خیال کے جگنو دلوں میں اجالا کرتے تھے۔ جدوجہد کامیاب ہوئی تھی، شادیانے بجے تھے، شہنائیاں گونجی تھیں لیکن ساتھ میں لہو کی بو بھی فضا میں رچ بس گئی تھی۔ محبتوں نے دم توڑا تھا اور انسان نے اپنے جیسے انسان ہی کو رسوا کیا تھا۔ ایک نفرت کا لاوا پھوٹ پڑا تھا جس نے انسانی قدروں کو جلا کے راکھ کے ڈھیر میں بدل ڈالا تھا۔

خوابوں اور خیالوں سے سجے اس تاج محل میں جہاں نظریات کی اینٹیں چنی گئی وہاں بہت کچھ ایسا ہوا جس نے آزادی کی اس خوشی کو گہنا دیا۔

تقسیم کی اس جنگ میں عورت وہ جنس ٹھہری جو اس بری طرح کچلی اور مسلی گئی جیسے کوئی شریر بچہ کھلنڈرے پن سے اڑتی تتلی کو اپنی انگلیوں میں مسل کے اس کے پر توڑ ڈالے، اجلے دھنک رنگ مٹا ڈالے، اور اپنی انگلیوں پہ کچھ مٹے مٹے رنگ دیکھ کے احساس جرم کی بجائے یہ سوچے کہ اس سب میں جیت کی سرشاری کس قدر تھی۔

عقل آج تک یہ سمجھنے سے عاری ہے کہ اس سارے قضیے میں عورت کہاں سے قابل سزا ٹھہری؟ جیت کے جوش میں عورت کو اس درندگی کا نشانہ کیوں بنایا گیا، لکیر کے اس طرف بھی اور لکیر کے اس طرف بھی۔

حتمی جواب کا تو کسی کو علم نہیں، بس ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ کامیابی کا جشن منانے کے لئے ہر طاقتور کو ایک کمزور کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ سو اس نشے میں دونوں طرف کا انسان مردانگی کی وحشت کا شکار ہوا تھا، وحشت دیوانگی میں بدلی تھی اور مذہب بھی کوئی سدباب نہ کر سکا کہ جنون کی زد میں آئے ہوئے مرد کا کوئی مذہب نہیں تھا، لکیر کے اس طرف بھی اور لکیر کے اس طرف بھی۔

سعادت حسن منٹو، اردو ادب کا وہ نباض جو اس دیوانگی کو دیکھ کے چپ نہ رہ سکا اور معاشرے کو یہ تعفن دکھانے کا فیصلہ کیا۔

ایشر سنگھ کا کردار جو اقرار کرتا ہے کہ جس مکان پہ اس نے دھاوا بولا تھا، سات مردوں کو قتل کرنے کے بعد اس نے بچ جانے والی سندر لڑکی کا کچھ اور مصرف ڈھونڈا تھا۔

اس بربریت کے عالم میں بھی اسے عورت صرف ایک جسم دکھائی دیتی تھی اور نظریات سے اختلاف کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ مرد کو نہیں ملا تھا کہ عورت کو روند کے تاراج کیا جائے۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ کا بشن سنگھ جو پاگل خانے میں تھا، خود سے ہی پوچھتا رہتا تھا کہ اس کی بیٹی روپ کور اب کیوں ملنے نہیں آتی؟ رگوں میں ایک سرد لہر دوڑ جاتی ہے جب فضل دین اسے ملنے آتا ہے اور بتاتا ہے،

"میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں لیکن فرصت ہی نہ ملی.... تمہارے سب آدمی ہندوستان چلے گئے.... تمہاری بیٹی روپ کور...."

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ بشن سنگھ کچھ یاد کرنے لگا، "بیٹی روپ کورا!"

فضل دین نے رک رک کر کہا "ہاں... وہ...وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ ان کے ساتھ ہی چلی گئی"

فضل دین جو کہہ نہ سکا، وہ قاری کے لئے سمجھنا مشکل نہیں اور یہی منٹو کی نشتر زنی کا کمال تھا جو اپنوں کو بھی معاف کرنے کو تیار نہیں تھا۔

سردار گورمکھ سنگھ کا لڑکا جو عید کی سویاں صغری کو دے کر مرے ہوئے باپ کا وچن نبھانے آیا تھا۔

"سردار گورمکھ سنگھ کا لڑکا سنتوکھ، جج صاحب کے مکان کے تھڑے سے اتر کر چند گز آگے بڑھا تو چار ڈھاٹے باندھے ہوئے آدمی اس کے پاس آئے" کیوں سردار جی، اپنا کام کر آئے، اب کر دیں معاملہ ٹھنڈا"

"ہاں.... جیسے تمہاری مرضی" یہ کہہ کر گورمکھ سنگھ کا لڑکا چل دیا۔

عورت نہ صرف کچلی گئی بلکہ مال غنیمت سمجھ کے بانٹی بھی گئی۔ بالکل اسی طرح جیسے بچے بالے ڈور کٹنے کے بعد ڈولتی پتنگ کو پکڑنے بھاگتے ہیں اور رواں رواں خوشی سے تھر کتا ہے۔ مظلومیت کی اس تصویر کو راجندر سنگھ بیدی نے "لاجونتی" کے روپ میں امر کر دیا،

"مغویہ عورتوں میں ایسی بھی تھیں جن کے شوہروں، جن کے ماں، باپ، بہن اور بھائیوں نے انھیں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر وہ مر کیوں نہ گئیں؟ اپنی عفت اور عصمت کو بچانے کے لیے انھوں نے زہر کیوں نہ کھالیا؟ کنوئیں میں چھلانگ کیوں نہ لگا دی؟ وہ بزدل تھیں جو اس طرح زندگی سے چمٹی ہوئی تھیں۔ سینکڑوں ہزاروں عورتوں نے اپنی عصمت لٹ جانے سے پہلے اپنی جان دے دی لیکن انھیں کیا پتہ کہ وہ زندہ رہ کر کس بہادری سے کام لے رہی ہیں۔ کیسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے موت کو گھور رہی ہیں۔ ایسی دنیا میں جہاں ان کے شوہر تک انھیں نہیں پہچانتے۔ پھر ان میں سے کوئی جی ہی جی میں اپنا نام دہراتی۔ سہاگ ونتی۔۔۔ سہاگ والی۔ اور اپنے بھائی کو اس جم غفیر میں دیکھ کر آخری بار اتنا کہتی۔ تو بھی مجھے نہیں پہچانتا بہاری؟ میں نے تجھے گودی کھلایا تھا رے۔

مجمعے میں سے کوئی آواز آتی،

"ہم نہیں لیتے مسلمران (مسلمان) کی جھوٹی عورت"

کرشن چندر نے بھی روح پہ لگے زخموں کو الفاظ کا ایسا روپ دیا جن سے قطرہ قطرہ لہو رستا ہے۔ "پشاور ایکسپریس" وہ آئینہ ہے جو بٹوارے میں دونوں طرف کے لوگوں کی وحشت کو عیاں کر کے دکھا دیتا ہے۔

"وزیر آباد کا اسٹیشن لاشوں سے پٹا ہوا تھا۔ شاید یہ لوگ بیساکھی کا میلہ دیکھنے آئے تھے۔ لاشوں کا میلہ۔ شہر میں دھواں اٹھ رہا تھا اور ہجوم کی پر شور تالیوں اور قہقہوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھی۔ چند منٹوں میں ہجوم اسٹیشن پر آگیا۔ آگے آگے دیہاتی ناچتے گاتے آرہے تھے اور ان کے پیچھے ننگی عورتوں کا ہجوم، مادر زاد ننگی عورتیں، بوڑھی، نوجوان، بچیاں، دادیاں اور پوتیاں، مائیں اور بہوئیں اور بیٹیاں، کنواریاں اور حاملہ عورتیں، ناچتے گاتے ہوئے مردوں کے نرغے میں تھیں۔ عورتیں ہندو اور سکھ تھیں اور مرد مسلمان تھے اور دونوں نے مل کر یہ عجیب بیساکھی منائی تھی، عورتوں کے بال کھلے ہوئے تھے۔ ان کے جسموں پر زخموں کے نشان تھے اور وہ اس طرح سیدھی تن کر چل رہی تھیں جیسے ہزاروں کپڑوں میں ان کے جسم چھپے ہوں، جیسے ان کی روحوں پر سکون آمیز موت کے دبیز سائے چھاگئے ہوں۔ ان کی نگاہوں کا جلال دروپدی کو بھی شرماتا تھا اور ہونٹ دانتوں کے اندر یوں بھنچے ہوئے تھے۔ گویا کسی مہیب لاوے کا منہ بند کئے ہوئے ہیں۔ شاید ابھی یہ لاوا پھٹ پڑے گا اور اپنی آتش فشانی سے دنیا کو جہنم راز بنادے گا۔ مجمع سے آوازیں آئیں۔

"پاکستان زندہ باد"

"اسلام زندہ باد"

"قائداعظم محمد علی جناح زندہ باد"

ٹرین سرحد پار کر کے کیا دیکھتی ہے،

"جالندھر کے پاس جنگل میں بہت سارے مسلمان مزارع اپنے بیوی بچوں کو لئے چھپے بیٹھے ہیں۔ ست سری اکال اور ہندو دھرم کی جے کے نعروں کی گونج سے جنگل کانپ اٹھا، اور وہ لوگ نرغے میں لے لئے گئے۔ آدھے گھنٹے میں سب صفایا ہو گیا۔ بچے اور مرد

ہلاک ہو گئے تو عورتوں کی باری آئی اور وہیں اسی کھلے میدان میں جہاں گیہوں کے کھلیان لگائے جاتے تھے اور سرسوں پھول مسکراتے تھے۔ اسی وسیع میدان میں، انہیں شیشم، سرس اور پیپل کے درختوں تلے وقتی چکلے آباد ہوئے۔ پچاس عورتیں اور پانچ سو خاوند، پچاس بھیڑیں اور پانچ سو قصاب، پچاس سوہنیاں اور پانچ سو مہینوال"

اس سے زیادہ یاد کرنے کی ہمیں تاب نہیں۔ دل بوجھل ہو جاتا ہے کہ فضا میں لو کے تھپیڑوں کی طرح ان بے کس عورتوں کی آوازیں تیرتی پھرتی ہیں، کچھ کہتی ہیں، کچھ پوچھنا چاہتی ہیں۔ آزادی کے ماتھے پہ عورت ایک ایسا جھومر ہے جو اپنے ہی لہو میں بھیگ کے سرحد کے دونوں طرف ایک ہی سوال پوچھتا ہے۔ ہر برس یہ خیال زخمی دلوں میں سر اٹھاتا ہے کہ عورت کو کس جرم کی سزا دی گئی؟

بات صرف ہندوستان اور پاکستان کی نہیں، روس اور جرمنی کی نہیں، ویت نام اور افغانستان کی نہیں، بوسنیا اور سربیا کی نہیں، انسانی تاریخ میں طاقت ور کی تلوار مردوں کی گردن کاٹتی آئی ہے اور عورت کی آبرو۔

آج کل کرونا نے زبردستی ہم سب کو گھروں میں بٹھا رکھا ہے۔ ممکن ہے اس

فرصت میں کچھ لوگ کوئی کتاب پڑھنا چاہیں۔ اگر پسند آئے تو مارٹا ہلرز (Marta Hillers) کی کتاب A woman in Berlin پڑھ لیجئے۔ اور اگر کتاب پڑھنے کی فرصت نہیں ہو یا فلم دیکھنا زیادہ پسند ہو تو اسی کتاب پر 2008 میں بننے والی فلم A woman in Berlin دیکھ لیجئے۔ ڈائریکٹر کا نام Max Färberböck ہے۔ ارے ہاں، اگر اپنی

زمین پر گزرنے والی قیامت کو محسوس کرنا ہے تو بھیشم ساہنی کے ہندی ناول تمس کا اردو ترجمہ پڑھ لیجئے۔ تمس ہندی میں اندھیرے کو کہتے ہیں۔ اندھیرے کو عربی میں ظلمت کہا جاتا ہے۔ راولپنڈی کے بیٹے بھیشم ساہنی نے 47 کے اندولن کو اندھیرے اور ظلم کی زبان دی ہے۔ آپ مارٹا ہلرز کو پڑھیے یا بھیشم ساہنی کو، سوال ایک ہی اٹھے گا، وہی سوال جو دنیا بھر کی عورت صدیوں سے پوچھتی آئی ہے کہ حاکیت مردوں کی ہے تو عورت ریپ کیوں ہوتی ہے؟

کیا کوئی جواب ہے آپ کے پاس؟

گل سما کے نام: وہ پھول جسے پتھروں سے کچلا گیا

گل سما، میری بچی ہم تم سے شرمندہ ہیں!
آنکھ سے لہو ٹپکتا ہے اور دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہیں!
نہیں معلوم تمہاری جنم دینے والی ماں تمہارے نازک بدن کو ہڈیوں اور گوشت کا ایک ڈھیر دیکھ کے زندہ درگور ہوئی یا تمہارے ساتھ ہی چل بسی!

میری بچی! تمہاری بدقسمتی کہ تم اکیسویں صدی کے ترقی یافتہ دور میں تو پیدا ہوئیں لیکن تمہارا واسطہ اجہی وحشی اور سنگ دل جابروں سے پڑا جن کے سیاہ دلوں کو اسلام کی روشنی منور نہیں کر سکی اور شاید وہ انسان ہیں ہی نہیں۔

سنا ہے، تمہیں زندگی کی آخری سرحد پہ کھڑے، اپنی قبروں میں پاؤں لٹکائے سنگی بڈھوں نے کاری کرنے کا حکم دیا۔ جو جنت کی امیدواری میں ایک اور تمغہ چھاتی پہ سجانے کے لئے بے چین تھے۔ جن کی مردہ بے نور آنکھیں تمہارے ننھے جسم کو ٹٹولتی تھیں اور سنگباری سے تمہاری زندگی کی آخری سانسوں کا فیصلہ کرتی تھیں۔

میں تم سے کبھی مل نہیں سکی اور تمہاری بھولی صورت کو دل میں اتار نہیں سکی۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ دس سال کی بچی کیسی دکھا کرتی ہے، آخر میں دو بچیوں کی ماں ہوں۔

میں تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتی ہوں کہ تم نے ابھی بچپن کی دہلیز کو پار نہیں کیا ہو گا۔ بھولی سی صورت، بڑی بڑی سرمہ بھری آنکھیں، بالوں کی دو چوٹیاں، رنگ برنگی چھینٹ کا کرتا، ہاتھ میں کپڑے کی گڑیا، نرم آواز، لبوں سے پھوٹتی ہنسی۔ اور بھلا دس سالہ بچی کیسی ہوا کرتی ہے۔

تم ابھی اماں کی گود میں سر چھپا کے سوتی ہوں گی۔ بہن بھائیوں سے نوک جھونک بھی چلتی ہو گی۔ سہیلیوں کے ساتھ صحن کے آنگن میں کھیلتی ہوں گی۔ معلوم نہیں، غبارے والا تمہاری بستی میں آتا ہو گا کہ نہیں اور نکڑ کی دوکان سے قلفی تو کھاتی ہی ہوں گی۔

ہم سوچتے ہیں کہ سکول تو تم جاتی ہی ہوں گی اور شاید چہارم یا پنجم میں پڑھتی ہوں گی۔ روز سکول جانا، ہم جماعتوں کے ساتھ بیٹھ کے سبق یاد کرنا، شرارتیں کرنا، استانی سے بات کرنے کی کوشش کرنا، وقفے میں اماں کا دیا ہوا ڈبہ کھولنا اور دیکھ کے ناک بھوں چڑھانا اور کہنا پھر وہی اچار اور روٹی۔ وقفے میں سہیلیوں کے ساتھ پٹھو گرم کھیلنا، اور تھوڑی بے ایمانی کے بعد خوب ہنسنا۔

سکول واپسی سے کھلے آسمان اور اڑتے پرندوں کو دیکھنا اور پھر یہ سوچنا کہ شاید میں بھی ایک دن ایسے ہی پرواز کروں گی۔ تتلیوں کو پکڑنا اور ان کے رنگ اپنی انگلیوں پہ دیکھ کے اداس ہو جانا۔ تمہیں کیا معلوم تھا کہ ایک دن تم بھی اپنے رنگ کچھ ظالم ہاتھوں پہ مل دو گی کہ پھر وہ چاہیں بھی تو ان رنگوں کو دھو نہیں سکتے۔

اس شام باہر ہواؤں میں تندی ہو گی، تم نے ماں کے ہاتھ کی روٹی کھائی ہو گی۔ تم نے بستہ کھول کے کتاب سے سبق یاد کرنا شروع کیا ہو گا۔ تم ماں کو کبھی کبھی نظر اٹھا کے دیکھتی ہو گی اور سوچتی ہو گی،

آخر ماں اتنی خاموش کیوں ہے؟ ماں زخمی نگاہوں سے میری بلائیں کیوں لیتی ہے؟ آج مجھے زیادہ ہنسنے سے منع بھی نہیں کیا۔ اور سب سے چھپا کے اپنے آنسو کیوں پونچھتی ہے؟

بابا بھی جانے کہاں ہے؟ مجھ سے پچھلے کچھ دنوں سے بات ہی نہیں کر رہا۔ کل بھی میں نے میلے پہ لے جانے کا پوچھا تھا، جواب ہی نہیں دیا۔ کل رات ماں جب اس کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی، جانے کیوں اس نے منہ پھیر لیا تھا؟

آج باہر ہوائیں اتنی تیز کیوں ہیں؟ جیسے کائنات سسکیاں بھر رہی ہو۔ جب کھڑکی زور سے بجتی ہے تو دل ڈر جاتا ہے۔ باہر اندھیرا ابھی تو بہت ہے، ارے دروازے پہ آہٹ

ہوئی۔ شاید بابا آیا ہے، یہ اماں کو کیا ہوا؟ اس کی آواز کیوں کپکپانے لگی؟ یہ مجھے چومتی ہی کیوں جا رہی ہے؟

ماں، ماں، تو بولتی کیوں نہیں؟

ماں، بابا مجھے ساتھ چلنے کو کہہ رہا ہے نہ جانے کہاں؟ اس وقت تو نکڑ والی دوکان بھی بند ہوتی ہے۔ ماں تو رو کیوں رہی ہے؟ میں تو بابا کے ساتھ جا رہی ہوں، کسی غیر کے ساتھ تو نہیں۔

بابا، تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ سب کیوں جمع ہیں میرے گرد؟

بابا، مجھے ڈر لگ رہا ہے، مجھے گھر لے چلو بابا۔ مجھے اماں کے پاس جانا ہے، ابھی سکول کا کام بھی باقی ہے اور ہاں ابھی میں نے اپنی گڑیا کا کرتا بھی آدھا ہی سیا ہے۔

بابا، دیکھو تو یہ کون آدمی ہے؟ مجھے گھسیٹ رہا ہے بابا، میرا ہاتھ مت چھوڑو بابا۔ میں تمہاری بیٹی ہوں نا بابا۔

بابا مجھے کہاں پھینک دیا، بابا مجھے اس گڑھے میں کیوں اتار دیا؟ بابا مجھے ڈر لگ رہا ہے، بابا میں وعدہ کرتی ہوں آئندہ کوئی شرارت نہیں کروں گی۔

بابا، یہ سب پتھر کیوں اٹھائے ہوئے ہیں؟ بابا، یہ چاچا ہے نا، اس کے ہاتھ میں اینٹ کیوں ہے؟ اور وہ ماما، اس کے دونوں ہاتھوں میں پتھر۔ بابا کچھ بولو نا، بتاتے کیوں نہیں؟

آہ، آہ بابا، بابا، چاچا نے مجھے اینٹ دے ماری۔ بابا مجھے پکڑ لو، بابا مجھے بچا لو۔ میرا سر، بابا دیکھو، خون بہہ رہا ہے، درد بہت ہے۔

اف، ایک اور ضرب، مجھے نظر نہیں آ رہا، آنکھوں میں خون ہے۔ اف ایک اور پتھر، بابا، بابا، بابا۔

اوہ میرے خدا!

بابا تو سنتا نہیں، تو ہی سن لے۔ مجھے بہت درد ہو رہا ہے، کچھ نظر نہیں آ رہا۔ میں گڑھے میں ڈھیر ہو چکی ہوں، میرے منہ میں مٹی بھی ہے اور نمکین سا ذائقہ بھی۔

آہ ایک اور ضرب، بس کرو، بس کرو، مجھے درد ہو رہا ہے، سانس نہیں آ رہی

ایک اور پتھر... ایک اور... ایک اور... آہ، آہ آہ...............

میں کہاں آ گئی؟ بہت روشن جگہ، بہت پر سکون۔ یہ کس نے مجھے گود میں لے لیا؟

یہ کون ہیں محبت بھری نظروں سے دیکھنے والی اداس ہستیاں؟

مجھے اب درد نہیں ہو رہا، خون بھی نہیں بہہ رہا۔

لیکن مجھے اب تک سمجھ نہیں آئی کہ یہ میرا قصور کیا تھا؟ میں تو ماں اور بابا کا کہنا مانتی تھی۔ میری استانی بھی مجھے اچھی بچی کہتی تھی۔ میں تو قرآن کا سبق بھی پڑھتی تھی، نماز بھی یاد کر چکی تھی۔ بابا، ابھی تو مجھے بڑے ہونا تھا، پڑھنا تھا۔ مجھ سے زندگی کیوں چھین لی بابا؟

بابا اماں کو جا کے بتا دینا میں اسے یاد کروں گی یہاں۔ چھوٹے کو کہنا کہ اب وہ میرا بستر لے لے۔ اور میری گڑیا پھینک دینا بابا، دنیا میں ویسے بھی گڑیوں کی جگہ نہیں ہوتی۔ میری استانی کو بتا دینا کہ میں نے سبق یاد کر لیا تھا مجھے بھی استانی بننا تھا۔

جاؤ بابا، گھر جاؤ، رات ڈھل رہی ہے، ماں رو رہی ہو گی۔ ویسے اچھا ہوتا اگر تم مجھے ایک دفعہ گلے سے لگا لیتے، مجھے ایک الوداعی بوسہ دے دیتے۔

خدا حافظ بابا، جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا، تم جو کہتے ہو کہ میں کھیلتے ہوئے سر پر پتھر گرنے سے مر گئی۔۔۔

اور سندھ کے اس وزیر کو بھی معاف کیا جو کہتا ہے کہ دادو کے علاقے جوہی میں لڑکی کو کاروکاری کرنے کے شواہد نہیں ملے!

فحش نگار منٹو کی سالگرہ

کہتے ہیں وہ فحش نگار تھا!

بات کچھ سمجھ میں آتی نہیں! کیا جو اس نے لکھا وہ ہوا نہیں؟ یا جو کچھ ہوا وہ لکھا نہیں؟

کیوں تھا آخر وہ ایسا؟ ایک معما، اپنے محبت کرنے والوں کے لئے بھی، اور نفرت کرنے والوں کے لئے بھی!

کہتے ہیں، کثرت شراب نوشی نے اس کا جگر چھید ڈالا! کیا محض شراب وجہ بنی یا اردگرد پھیلا وہ ننگا سچ جسے بھلانے کے لئے وہ نشے کا سہارا لیتا تھا۔ بدقسمتی سے پھر بھی بھول نہیں پاتا تھا کہ کچھ ہی دیر میں جگر کے زخموں سے ٹیسیں پھر اٹھنا شروع کر دیتی تھیں۔ اندھوں کے شہر میں آئینہ دکھانے کے بعد وہ کیسے جی سکتا تھا؟ معاشرے کی دوغلی اقدار اور سیاسی غلام گردشیں اس کے سچ کی تاب کیسے لا سکتی تھیں؟ انصاف کے پجاریوں نے جس عینک سے منٹو کو دیکھا اور جس میزان میں تولا، اس میں تعصب کے گہرے شیشے جڑے تھے۔

منٹو کا المیہ یہ تھا کہ وہ شرفا کی پھیلائی ہوئی گندگی سے نظر بچائے اور منہ ڈھکے نہیں گزر سکتا تھا۔ تعفن زدہ شہر اسے دکھائی بھی دیتا تھا اور اس کی بو سے اس کی طبیعت بھی متلاتی تھی۔ اسی اذیت سے اس کے قلم پہ زندہ لاشیں کہانیاں بن کے اتر آتی تھیں۔

عورت اور اس کی بے چارگی اس کے دل کے اس قدر قریب تھی کہ اس پہ گزرنے والی ہر تلخی نے اس سے وہ سب لکھوا دیا جو اور کوئی ہمت نہ کر سکا۔

کیا سمجھیں ہم منٹو کو؟

دلال؟ جسے عورت کا جسم نہیں دکھتا، اس کے پیٹ کی بھوک تنگ کرتی ہے۔
مکھی؟ جو معاشرے کے پھیلائے تعفن پہ بیٹھتی ہے اور بار بار بیٹھ کے توجہ دلاتی ہے کہ جنہوں نے گند پھیلا رکھا ہے، انہیں برا سمجھا جائے۔ توجہ خواں؟ جو ان چلتی پھرتی ننگی حقیقتوں کو دیکھ کے صبر کا دامن ہاتھ سے کھو بیٹھتا ہے۔ مسخرا؟ جو سوسائٹی کی سنگ دلی دیکھ کے کبھی روتا ہے اور کبھی ہنستا ہے۔ بازی گر؟ جو تنے ہوئے رسے پہ دن رات اس امید پہ چلتا ہے کہ ہم اس کے فن کی داد تو دیں اور ساتھ میں خاموشی کا قفل بھی توڑ دیں۔ عاشق؟ جو عورت کے غم میں گھل گھل کے ہنسی خوشی موت کو گلے لگانا چاہتا ہے۔

زینب تو یاد ہی ہو گی جسے سگے باپ نے اپنی بیوی بناڈالا تھا۔ بھائی کی بیوی صغریٰ کو اللہ بخش کی گرسنہ نگاہوں سے بچانے کے لئے طلاق دلواتی زینب اپنی ذات پہ ہونے والے المیے سے پتھر کی ننگی مورت بن گئی۔

سمتری کیسے بھولیں جسے کندن لال نے مردہ بہن کی لاش پہ ماتم بھی نہ کرنے دیا۔ بیوی کے مرنے کی پریشانی کے باوجود اس نے سمتری کی ذات تار تار کرڈالی۔

کالی شلوار کی سلطانہ، جس کی زندگی مفلسی، بھوک اور کچھ ادھوری خواہشات کے گرد گھومتی ہے۔ اسے عام عورت کے برعکس مکان کا کرایہ، بجلی کا بل اور پیٹ کی آگ بجھانے کے مسائل کا سامنا ہے۔ دھندا کرنے کے بعد زندگی کی گاڑی بمشکل کھینچی جاتی ہے۔ گوشت پوست کی بنی ہوئی یہ عورت من رکھتی ہے جو معمولی ارمانوں پہ مچل جاتا ہے۔ جن میں سے ایک محرم کے لئے کالے کپڑوں کا اہتمام کرنا ہے۔

کم عمر شاداں لہولہان حالت میں گھر پہنچ کے بے ہوش اور ہسپتال پہنچنے کے بعد ایک لفظ خان بہادر کہنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سو جاتی ہے۔ مقدمہ چلا لیکن صفائی کے گواہ خان بہادر کے ڈاکٹر اور بیوی نے گواہی دی کہ خان بہادر تو کسی قابل ہی نہیں۔ ادھیڑ عمر خان بہادر رہا ہو کے گھر آئے تو زندگی کے کسی معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ایک صرف انہوں نے مسواک کا استعمال چھوڑ دیا۔

سوگندھی جو اپنی کھولی کی تنہائی میں چاروں طرف ہولناک سناٹا دیکھتی تھی جیسے مسافروں سے لدی ہوئی ریل گاڑی سب سٹیشنوں پہ مسافر اتار کر اب لوہے کے شیڈ میں

اکیلی ہو۔ یہ خلا سوگندھی کو تکلیف دیتا تھا۔ وہ ذہن میں ادھر ادھر کے خیال ٹھونسنے کی کوشش کرتی لیکن تھوڑی ہی دیر میں ذہن چھلنی بن کے خالی ہو جاتا۔ جب دل پر چانے کا کوئی طریقہ نہ ملا اس نے اپنے خارش زدہ کتے کو اٹھایا اور ساتھ لٹا کر سو گئی.....

انسانی بے چارگی کی اس سے بہتر تصویر کشی ہو سکتی ہے کیا؟

ہمیں منٹو سے محبت اس لئے ہے کہ وہ یہ پرواہ نہیں کرتا کہ زمانہ اسے کس پیمانے میں تولتا ہے۔ وہ سماج کو عورت کے متعلق چیلنج کرتا ہے،

" ویشیا کا مکان خود ایک جنازہ ہے جو سماج اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے وہ اسے جب تک کہیں دفن نہیں کرے گا، میں یہ باتیں کرتا رہوں گا۔ یہ لاش گلی سڑی، بدبودار سہی، متعفن سہی، گھناؤنی سہی، لیکن اس کا منہ دیکھنے میں کیا حرج ہے"

منٹو کو عورت کی بے کسی اور خاموشی کھلتی ہے۔ وہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے جب عورت اپنے آپ کو حالات کے دھارے کے سپرد کر دیتی ہے اور احتجاج نہیں کرتی،

" میرے پڑوس میں اگر کوئی عورت ہر روز خاوند سے مار کھاتی ہے اور پھر اس کے جوتے صاف کرتی ہے تو میرے دل میں اس کے لئے ذرہ برابر ہمدردی پیدا نہیں ہوتی"

منٹو معاشرے کی اس عورت کے ساتھ آنسو بہاتا ہے جسے وقت کا بہاؤ ایک ایسی منزل کی طرف بہائے جا رہا ہے جہاں پہنچنے کا خواب اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس عورت پہ گزرنے والی کیفیات منٹو اپنے پہ طاری کرتا ہے اور پھر اسی کی طرح لمحہ لمحہ جینا اور مرنا شروع کر دیتا ہے۔

"میری ہیروئن چکلے کی ایک ٹکھیائی رنڈی ہو سکتی ہے جو رات کو جاگتی ہے اور دن کو سوتے میں کبھی کبھی ڈراونا خواب دیکھ کر اٹھ بیٹھتی ہے کہ بڑھاپا اس کے دروازے پہ دستک دینے آ رہا ہے۔ اس کے بھاری بھاری پپوٹے جن پر برسوں کی اچٹی ہوئی نیندیں منجمد ہو گئی ہیں۔ اس کی غلاظت، اس کی بیماریاں، اس کا چڑچڑاپن، اس کی گالیاں یہ سب مجھے بھاتی ہیں... میں ان کے متعلق لکھتا ہوں"

پھر اس کی قلم کی دھار کسی زخم کھائے درندے کی طرح سماج کو چیر پھاڑ کے رکھ دیتی ہے۔ وہ چیخ چیخ کے کہتا ہے۔

" اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ زمانہ ناقابل برداشت ہے۔ مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں۔ میں تہذیب وتمدن اور سوسائٹی کی چولی کیا اتاروں گا، جو ہے ہی ننگی"

عام حالات میں بھی عورت کی کتھا منٹو خون جگر سے رقم کرتا تھا۔ لیکن بٹوارے میں عورت جب اپنوں کے ہاتھوں ریزہ ریزہ ہوئی، اس نے منٹو کے قلم میں آگ بھر دی۔

"مشرقی اور مغربی پنجاب میں قتل وغارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ ہٹے کٹے نوجوان لڑکوں کی ٹولیاں باہر نکلتی تھیں اور ادھر ادھر چھاپے مار کر ڈری دبکی اور سہمی ہوئی لڑکیاں اٹھا کر لے جاتی تھیں"

"سخت اندھیرا تھا گو کہ گاؤں والوں نے مشعلیں روشن کی ہوئی تھیں۔ اس نے اندھیرے میں کئی عورتوں کے سائے دوڑتے دیکھے مگر فیصلہ نہ کر سکا کہ ان میں سے کس پہ ہاتھ ڈالے"

ارد گرد اتنا درد تھا جس نے منٹو سے سکینہ سے کالا فانی کردار تخلیق کروا کے معاشرے کہ منہ پہ ایک ایسا تھپڑ رسید کیا جس کی گونج آج بھی سنائی دیتی ہے۔

سراج دین جو سترہ سالہ سکینہ کو مختلف کیمپوں میں ڈھونڈتا رہتا ہے جسے بلوائی اٹھا کے لے گئے تھے۔ سراج دین بازیابی کے لئے رضاکاروں کی منتیں کرتا ہے۔ وہ آٹھ رضاکار سکینہ کو تلاش کر لیتے ہیں لیکن وہ پھر بھی سراج دین تک نہیں پہنچ پاتی۔ کچھ دنوں بعد جب وہ نیم مردہ حالت میں ہسپتال پہنچتی ہے تو ایک ہی لفظ سمجھتی ہے "کھول دو"۔

فسادات میں لوٹ مار کرتا ٹھنڈے گوشت کا ایشر سنگھ جو آٹھ بندوں کو قتل کر کے ایک لوٹی ہوئی مردہ لڑکی کو جنسی ہوس کا نشانہ بناتا ہے۔ برف جیسی ٹھنڈی مردہ عورت کی کم نصیبی کا نوحہ آج بھی آنکھوں کو اشکبار کرتا ہے۔

منٹو اپنی انگلیاں تو پہلے ہی فگار کیے بیٹھا تھا۔ تقسیم میں عورت پہ کیے گئے ظلم نے اسے خون تھوکنے پہ مجبور کر دیا۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ معاشرے کے ناخداؤں نے ان پیپ زدہ زخموں کو دکھانے کے جرم میں اس پہ زندگی مزید تنگ کر دی۔ وِشیا کے لئے جنگ کرنے

والا، معصوم اور بے قصور عورت کے لئے اپنوں کے ہاتھوں روندا جانا، ارباب اختیار کی دیدہ و دانستہ چشم پوشی اور دوغلے پن کی تاب نہ لا سکا اور زندگی کا بوجھ اتار پھینکا۔

" میں مجسٹریٹ صاحب کو آداب عرض کر کے جانے ہی والا تھا کہ انہوں نے مجھ سے کہا، آپ کب واپس جا رہے ہیں؟"

میں نے جواب دیا، غالباً آج ہی چلا جاؤں گا،

انہوں نے کہا، نہیں۔ آج نہ جایئے۔ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔

مجھے بہت حیرت ہوئی، بہر حال میں نے آمادگی ظاہر کر دی۔

مجسٹریٹ صاحب شام کو کافی ہاؤس پہ ملے، رسمی گفتگو کے بعد انہوں نے بڑے پیار سے کہا، منٹو صاحب میں آپ کو اس دور کا بہت بڑا افسانہ نگار مانتا ہوں۔ ملنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ آپ یہ خیال لے کر نہ جائیں کہ میں آپ کا مداح نہیں،

میں سخت متحیر ہوا... آپ میرے مداح ہیں تو آپ نے مجھے جرمانہ کیوں کیا؟

اس سوال کا جواب ملنا ابھی باقی ہے۔

یہ تھی ہمارے معاشرے کی قلعی جو منٹو نے دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے کھول دی!

منٹو، تمہیں سالگرہ مبارک!

شوہر بد صورت ہو تو عورت زہر کھا لے؟

(اگر بیوی بد صورت ہو تو مرد قربت سے پہلے نشہ کر سکتا ہے: مراکش کے امام کا فتویٰ)

چلیں جی، ہماری بد صورتی کا بھی علاج ڈھونڈ لیا!

کیا ہی اعلیٰ خیال ہے اور کیا ہی بڑھیا فتویٰ!

مردوں کے دل لبھانے اور انہیں عرش پہ پہنچانے کی ایک اور کوشش!

مردوں کا جنگل ہے اور جس طرف نظر اٹھتی ہے، بس اٹھتی ہے اور جھک جاتی ہے، مزید دیکھنے کی تمنا نہیں رہتی۔

اللہ نے انسان کا بچہ بنا کے بھیجا اور بس صرف انسان کا بچہ۔ کچھ جمالی روپ بخشا یا نہیں، یہ مرد بچے کے لئے کون دیکھتا ہے۔ بس مرد ہونا کافی ہے۔

اس پہ مرد نے دنیا میں رہتے رہتے، یہاں کچھ پھول پھندنے اگائے، شکم کا حجم ایسے بڑھایا جیسے گنبد بے در، سر پہ چٹیل میدان، چہرہ مبارک پہ گنجان بالوں کا جنگل، جسم بھدا جیسے گوشت کا پہاڑ اور حلیہ انتہائی کریہہ۔ دلی اور جسمانی شقاوت اور بد صورتی کا شاہکار!

بس تھوڑی سی کسر رہ گئی ڈارون کے قرار دیے فرسٹ کزن تک پہنچنے کی۔

اس صورت حال کے ساتھ خواہش کی اڑان دیکھیے۔ طلب کس چیز کی، وہ کیا کہتے ہیں 'پہلوئے حور میں لنگور'

سو چاہیے کیا، گلاب کی پنکھڑی سے لب، رنگ مہتابی، چاند چہرہ، نین کنول، سرو قد، غزال سی چال اور کیا کچھ نہیں کہ حد تو نیلا آسمان ہے۔

اور اگر یہ سب نہیں میسر تو پھر تالیف قلب کے لئے سوٹا لگائیے، گھونٹ بھریئے اور مدہوش ہو جائیے۔ اب آپ کی پریوں کی رانی آپ کے سامنے ہو گی۔

سوال یہ ہے کہ مدہوشی اترنے کے بعد کیا ہو گا۔ سات آسمانوں کی پرواز کے بعد زمین پہ پاؤں رکھے گا کون؟

جواب یہ ہے کہ گھر میں چلتی پھرتی مخلوق کو دیکھتا کون ہے؟ دیکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے کہ مرد کا جی متلاتا ہے اپنے جیسی دیکھ کے اور رات گئی، بات گئی۔

مرد کو دن میں ایک خادمہ چاہئے تھی، سو وہ ہے۔ اس کی شکل اب ہوش میں آکر کیوں دیکھیں آخر۔ ایک پتلی تماشہ ہے اور پتلی آپ کے ہاتھوں کی ڈوری سے بندھی ناچ رہی ہے۔

اور یہ عورت جو دن میں آپ کے چشم ابرو کی جنبش پہ حرکت میں آنے والی اور رات میں آپ کے سرور میں پریوں کی رانی، کیا زندہ بھی ہے؟ کیا اس عورت کے اندر دل ہے، جذبات ہیں، خواہش ہے؟ کیا عورت صرف جسم ہے؟ یا صرف سانس کی ڈوری سے بندھی مخلوق ہے؟

کیا کبھی کسی نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ اسے بھی راہ حیات کا تھکا ہوا پھسڈی مرد تکلیف دیتا ہے۔

یہ کم رو، بھونڈا، بے حس، اپنی جھوٹی ایگو سے لبالب بھرا، خود غرض مرد اس کی حیات کو بھی تباہ کرتا ہے۔

یہ نرگسیت کا مارا، اپنے مدار میں گھومنے والا، اپنے آپ کو عقل کل سمجھنے والا لکیر کے دوسری طرف اسی حقارت کا مستحق سمجھا جا رہا ہے۔ کیا ہوا جو معاشرے نے زبان کو قفل پہنا رکھا ہے، روح تو نوحہ خواں ہے نا۔ پر یہ اندھے بہرے، نشے کے ولدادہ روح کی پکار کیا جانیں۔

ہم نے بہت سے ایسے جوڑے دیکھے جو آپس میں میل نہ کھاتے تھے، پر دونوں ایک دوسرے پہ فریفتہ۔ وہ راز پا چکے تھے کہ جب من و تو کا فرق مٹ جائے تب اندر کی آنکھ بیدار ہو جاتی ہے اور سامنے والے کے بھی اندر کا حال دیکھتی ہے۔ باقی سب مایا ہے!

وہ سب جو اس فتوے کو پڑھ کے اپنی نارسائیوں کا علاج ڈھونڈے جانے پہ خوش
ہو رہے ہوں گے، کیا ایک جام اپنی ماں کو دیکھتے ہوئے بھی پینا چاہیں گے؟
آخر وہ بھی تو عورت ہے اور بیوی بھی، ان کے باپ کی!
تو پھر تجویز کر دیجیے ان بے چاری حوا کی بیٹیوں کے لیے بھی ایک ڈوز!
شوہر بدصورت ہو تو عورت کیا زہر کھالے؟

میرے ابا جی، حقہ اور عورت کا مرتبہ!

ابا نے اپنا امتحان امتیاز سے پاس کیا، پورے نمبر لے کے، دس میں سے دس!

آپ نے جدید دنیا کا ایک فیشن 'شیشہ' تو دیکھ ہی رکھا ہو گا! کیا شیشہ پینے کا اتفاق بھی ہوا یا دیکھنے کی حد تک ہی شناسائی ہے؟ ماضی کی گلیوں میں جھانکتے ہوئے اگر کبھی ہم یہ کہہ بیٹھیں کہ ہم نے تو بچپن میں ہی شیشہ اصلی شکل میں برت لیا اور بھرنا بھی سیکھ لیا تو بچے آنکھیں پھاڑ کے کچھ ایسے تاثرات کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ گویا اماں کا دماغ چل گیا!

وہ نے منہ میں رکھ کے کش لگاتے، فضا میں تمباکو کی کڑوی مہک، دیسی گڑ کی مٹھاس میں گھل کے فضا میں پھیلتے ہوئے تحلیل ہوتی رہتی۔ حواس پہ چھا جانے والی یہ مہک ہر شام ہمارے گھر میں پھیل جاتی۔ ان کے بارے میں یہ واضح یادداشت ہماری ابتدائی یادوں کے خزانے میں سے ایک ہے۔

حقہ ہمارے ابا کی زندگی کا ایک ویسا ناگزیر حصہ تھا جیسا کہ ریڈیو، اور نماز! حقہ گاؤں سے شہر کی طرف ان کی ہجرت کا وہ ساتھی تھا جس نے تمام عمر ساتھ نبھایا۔ وہ دفتر میں سگریٹ پیتے اور جونہی گھر پہنچتے، حقہ تازہ ہونے کا اہتمام ہو جاتا۔

ہماری پر تجسس طبیعت، نت نئی باتیں سیکھنے کا شوق اور ابا سے محبت کا تقاضا وہی تھا جو ہم نے کیا۔ حقے کے پیندے میں پانی بدلنا، چلم میں گڑ اور تمباکو کی ایک خاص مقدار ڈالنا اور پھر سلگتے اپلوں سے ڈھک دینے کی ترکیب میں ہم مشاق ٹھہرے۔ آج بھی موقع ملے تو ہم اپنے ہنر کا مظاہرہ کر سکتے ہیں کہ ترکیب ورق دل پہ لکھی ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حقہ تازہ کرنے کے اس عمل میں ہم ارد گرد والوں سے نظر بچا کے وہ بانسری نما نے منہ میں ڈال کے ابا کی طرح گڑگڑانے کی کوشش کرتے۔ مایوسی کی انتہا ہو جاتی جب ایک بھدی سی آواز برامد ہوتی۔ ہم تو شاہد تھے کہ ابا نے منہ میں دباتے تو فضا میں خوشبو کے مرغولوں کے ساتھ سروں کا تال میل بھی بکھر جاتا۔

"نے نوازی" کا یہ تجربہ کرتے کبھی ایسا نہیں لگا کہ ہم کسی چوری کے مرتکب ہوئے ہیں۔ بھلا ابا کیوں برا مانتے کہ ان کا اپنی اکلوتی چھوٹی بہن کے ساتھ مل کے حقہ پینا ہمارے گھر کے درودیوار کے لئے اجنبی نہیں تھا۔

ہماری پھوپھی جب بھی آتیں، بھائی کے پاس پہروں بیٹھتیں۔ موضوع گفتگو تمباکو کی کاشت اور کڑواہٹ سے لے کر مزارعین کے مسائل اور زمین سے ہونے والی آمدنی سے ہوتا ہوا نہ جانے کہاں جا نکلتا۔ پس منظر میں مسلسل ریڈیو بجتا رہتا، اور حقے کا دور چلتا رہتا۔ بھائی دو چار کش لگانے کے بعد حقے کی نے بہن کی طرف بڑھا دیتا۔ جب بہن کش لگانے میں مصروف ہوتیں، بھائی محبت بھری نظروں سے بہن کو دیکھتے ہوئے کوئی اور کتھا شروع کر دیتا۔

یہ وہی لاڈلی بہن تھی جس کے لئے ابا نے اپنے والد سے ٹکر لی۔ شادی کے تین برس بعد ہی بیوہ ہو کے میکے آنے والی بہن کا دکھ انہوں نے نہ صرف محسوس کیا بلکہ یہ خیال بھی دماغ میں در آیا کہ پہاڑ سی زندگی اکیلے کیسے گزرے گی۔ زخموں پہ پھاہا رکھنے کی خاطر پہلے سکول داخل کرایا گیا اور بعد میں بہن کی مرضی جاننے کے بعد دوبارہ گھر بسانے کا ارادہ کیا گیا۔ دادا پرانی روایات کو سینے سے لگائے بیٹھے تھے جہاں بیوہ کو زندگی کی طرف لوٹنے کا حق حاصل نہیں تھا۔ ابا نے دادا کی ہر تاویل مسترد کرتے ہوئے دادا کی عدم شرکت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بہن کی دوسری شادی کروا کے دم لیا۔ ہماری پھوپھی نے ساری عمر بھائی کو جس نظر سے دیکھا اس سے محبت اور تشکر کی لہریں پھوٹتی تھیں۔

سچائی اور اصولوں کی خاطر والدین کے حکم کو ٹال دینے سے آخرت قطعی طور پہ خطرے میں نہیں پڑتی، ابا کی پوری زندگی اس یقین سے عبارت تھی۔ وہ نہ بہن کی خاطر روایات سے ٹکرائے بلکہ عزیز از جان شریک حیات کے لئے بھی یہی سوچ مد نظر ٹھہری۔

شادی کے پانچ برس تک آنگن ویران ہونے پہ ان کا اپنے والدین سے یہی کہنا تھا، اولاد نہ ہونے کی صورت میں اس کمی کو پورا کرنے کے لئے دوسری شادی کا خیال بھی انہیں قبول نہیں۔

ابا کی زندگی میں عورت مضبوطی کا ایک استعارہ تھی۔ شاہ جہاں نے عورت سے محبت کی تو تاج محل وجود میں آیا۔ ابا نے اپنے گرد موجود عورت سے محبت کی تو معاشرے کی بوسیدہ روایات کو رد کرتے ہوئے عورت کے قدموں کو مضبوطی عطا کر دی۔ اماں سہیلیوں کے ساتھ شام بتاتیں، ابا کے ماتھے پہ کبھی بل نہ آتے۔ اماں کے رشتے دار بلا تکلف مہمان بنتے، کبھی طبیعت میں ملال نہ آتا۔ اماں ابا کی تنخواہ جیسے چاہتیں، خرچ کرتیں، کبھی کوئی پوچھ کچھ نہ ہوتی۔ وہ سگریٹ خریدنے کے پیسے بھی اماں سے مانگتے۔

عورت کو پر اعتماد اور مالی طور پہ مضبوط دیکھنے کا خواب نہ جانے انہوں نے کب دیکھا اور ایمان کی طرح جزو ذات بنالیا۔ وہ برملا کہتے، عورت کی تعلیم لڑکے کی تعلیم سے زیادہ اہم ہے۔ عورت کو باپ بھائی کے سہاروں کی بیساکھی دینے کی بجائے اپنی زمین اور اپنے آسمان کا کھوج لگانے دو۔

ہماری آپا کی نوکری کا آغاز لارنس کالج مری سے ہوا اور ابا کے لئے یہ انتہائی افتخار کا لمحہ تھا۔ ہم نے زمانہ طالب علمی میں جو چاہا، کیا، ابا کے لئے سب قابل قبول تھا۔

ابا کو اوائل عمری سے جاننے والوں کے مطابق وہ باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ خوش لباس، کتابوں سے محبت، میوزک کے رسیا، شخصی آزادی کے قائل، اعلیٰ تعلیم کے داعی، شطرنج کھیلنے کے شوقین اور ساتھ میں مذہب کی پرتوں کو جاننے کے متلاشی۔

ہم ان کی شخصیت کی بہت سی جہتوں سے متعارف نہ ہو سکے کہ ہمارے دور میں وہ روحانیت کی منزلوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ کھوج کا یہ سفر انہیں انتہائی کم گو بنا چکا تھا۔ کبھی کبھی اس خاک میں موجود کسی چنگاری کی لو کچھ لمحوں کے لئے ان کی آنکھوں میں نظر آتی اور پھر چھپالی جاتی۔

آج یہ تاسف زندگی کا حصہ ہے کہ جب کہانی گو موجود تھا، ہمارا فہم اس قابل ہی نہیں تھا کہ ان موتیوں کو دامن میں سمیٹتے۔ زندگی کی کہانی کچھ سمجھ میں آنے لگی، سوالوں کے سپنولیے سر اٹھانے لگے تو چراغ کی لو ہی گل ہو گئی، محفل کی بساط ہی لپیٹ دی گئی۔

کاش، ستائیس برس قبل ابا کو فالج نہ ہوا ہوتا!

فرشتہ ہو یا زینب: یہ سب تمہاری حاکمیت کا تاوان ہے

یہ کھیل کبھی ختم نہیں ہو گا!
کیوں بلبلاتے ہو تم؟
کس چیز کا غم ہے؟
کس لیے اتنا شور مچا رکھا ہے؟
کچھ بھی تو نیا نہیں ہے۔
وہی تو ہوا ہے جو صدیوں سے ہو رہا ہے۔
وہی تو ہے جو منٹو نے برسوں پہلے کھول دیا۔
کیا انوکھی بات ہے آخر؟
ایک اور ننھی کلی مسلی گئی، ایک اور جانباز بازی لے گیا۔
جب دماغ پہ طاقت کا نشہ سوار ہو، جب معاشرہ ہر وقت سبق پڑھائے، مرد آقا ہے، ان داتا ہے، زمین اس کی ہے، آسمان اس کا ہے۔
جب ہر طرف تعلیم دی جائے کہ اللہ کی طرف سے مرد برتر ہے اور اس کی خدمت کے لیے ایک بے چاری مخلوق پیدا کی گئی ہے، جس کو مرد جب چاہے، جہاں چاہے روند سکتا ہے، مسل کے پتی پتی کر سکتا ہے، عمر، رنگ روپ کی کوئی قید نہیں
تو پھر چیخنے چلانے کی بھلا کیا ضرورت، اس سے بھلا کیا بدلے گا۔
کچھ دنوں کا شور اور پھر ایک اور کہانی!

اور آخر وہی تو ہوا ہے، جو تم میں سے ہر دوسرا کرتا ہے- کون ساجی دار ایسا ہے معاشرے میں جو ریپ نہیں کرتا!

اس حمام میں سب ننگے ہیں-

آؤ! میں بتاؤں تم کیا کیا ریپ کرتے ہو؟

جسم کا ریپ تو سب کو نظر آتا ہے، ہر کوئی آسمان سر پہ اٹھا لیتا ہے گرچہ وہ کچھ لمحوں کا کھیل ہے-

کیا کبھی غور کیا کہ اس پدرسری معاشرے میں ریپ کی بہت سی اقسام ہیں- ایسا ریپ جو زندگی بھر جاری رہتا ہے، نہ جینے دیتا ہے اور نہ مرنے۔

عورت صلیب پہ زندگی گزارتی ہے اور اپنے عورت ہونے کا خراج زندگی کے ہر پل میں ادا کرتی ہے، قبر میں اترنے تک!

ذہن کا ریپ کہ سوچنے کی آزادی نہیں، فیصلہ کر نہیں سکتی!

خیالات کا ریپ کہ اظہار کی اجازت نہیں، کیا چاہتی ہے، بتانا نا ممکن!

آزادی کا ریپ کہ باہر نکلنا تمہیں پسند نہیں، اسے صرف تمہارے گرد گھومنا ہے پروانہ بن کے اور پھر تمہاری آگ میں جل کے فنا ہونا ہے!

تمناؤں کا ریپ کہ تمہیں اڑتے پرندے اپنی دسترس سے باہر نظر آتے ہیں، اور تمہیں کٹھ پتلی کا ناچ پسند ہے۔

جذبات کا ریپ کہ تمہیں صرف گونگی عورت چاہئے، زبان ہو اور بات کر سکے، یہ تمہاری حکومت میں کیسے ممکن؟

مالی ریپ کہ عورت کما کے تو لائے مگر اس کا اکاونٹ تمہارے نام ہو، اے ٹی ایم کارڈ کے مالک تم بنو۔ ٹھیک ہے باڑے میں بندھی بھیڑ بکریاں کا فائدہ کیا ہے اور کیا نقصان، مالک ہی سمجھے گا نا! کھونٹے سے بندھی ہوئی کا کیا اختیار؟

تو اب سمجھ آیا کہ ریپ ہے کیا؟

ریسرچ بتاتی ہے اس کا جنس سے اور جنسی معاملات سے کوئی تعلق نہیں!

یہ اختیار کی بھوک ہے، طاقت کی شدید بھوک!

یہ کھیل ہے کمزور اور طاقتور کا، یہ کہانی ہے اپنے اس اندر مچلتی طاقت کی خواہش کو باہر نکالنے کی!

یہ مرد کے تشدد آمیز رجحان کا شاخسانہ ہے، یہ حکومت کرنے اور سامنے آنے والی ہر چیز کو ریزہ ریزہ کرنے کی شدید خواہش ہے۔

اور بد قسمتی سے سامنے آسانی سے شکار ہونے والی اور تمہاری طاقت کے نتیجے میں ٹوٹنے بکھرنے والی ایک مخلوق موجود ہے معاشرے میں، جسے معاشرہ تیار کرتا ہے اپنے ہاتھوں تمہارے قدموں میں بھینٹ چڑھنے کو۔

تو کیا غم ہے آخر؟

مجھے ہنسی آتی ہے تمہارے احتجاج پہ؟

کیوں کرتے ہو یہ سب ڈرامہ انصاف کا؟

ارے انصاف مانگنے والو، پہلے گریبان میں جھانکو اور یہ بتاؤ کہ کبھی عورت کی عزت کی ہے، کبھی یہ جانا ہے کہ وہ بھی تمہاری طرح گوشت پوست کی بنی ہے، دل دھڑکتا ہے، دماغ راستہ دکھاتا ہے۔ اس کا اس دنیا میں اتنا ہی حق ہے جتنا تمہارا، اسے بھی اسی طرح رنگ، روشنی، ہوا چاہیے جتنا کہ تمہیں۔ وہ بھی ویسے ہی پرواز کرنا چاہتی ہے جیسے کہ تم۔

اور معلوم ہے تمہیں، کیا کرو گے اس سارے احتجاج کے بعد؟

ایک بچی کی جنسی بے حرمتی پہ چیخ چیخ کے جب گھر لوٹو گے تو کیا کرو گے تم؟

تم گھر لوٹو گے اور ایک لونڈی نما بیوی، کنیز نما بہن اور بیٹی پہ جاتے ہی حکم چلاؤ گے، ان کی زندگی کے فیصلے کرو گے، ان پہ روشنی کے روزن مزید بند کرو گے، انہیں صرف جنسی استعمال کے قابل سمجھے جانے والی مخلوق سمجھ کے مزید دیواریں کھڑی کرو گے۔ زبان کاٹ دو گے اگر خواہش کا اظہار ہوا تو۔ زندہ رہنے کے لیے دو وقت کا کھانا اور دو جوڑی لباس چاہیے اور بس۔

تم ایسا کرتے رہو گے، جب تک تم اپنے بیٹوں کو یہ سبق پڑھاؤ گے۔

"مرد بن مرد"

"عورت کی کیا مجال کہ اپنی مرضی کا اظہار کرے"

"ارے سالی، زبان چلاتی ہے، دوں گا دو ہاتھ"

"خبردار اگر عورت کے پیچھے لگا"

اس وقت تک فرشتہ، زینب، عاتکہ اور عائشہ مرتی رہیں گی، آخر انہیں خراج بھی
تو دینا ہے نا تمہاری بالادستی کا، طاقت کے نشے کا۔

تو بند کرو اب احتجاج کا ڈرامہ!

نادان عورت کی مردنوازی(Himpathy)

دل باغ باغ ہے اور ایک فخر کا احساس بھی ہے کہ ہم گنہگاروں کے قبیلے میں کوئی تو پوتر نکلا!

کسی ہم جیسی نادان نے ہم سے بغاوت کرتے ہوئے، ہم مادر پدر آزاد عورتوں کا لحاظ نہ کرتے ہوئے معاشرے کے مظلوم مردوں کو ہماری اصلیت دکھائی!

یقیناً آج کہیں پہ شادیانے ہوں گے اور کہیں مٹھائیاں! اور مظلومین شاداں و فرحاں کہہ رہے ہوں گے کہ دیکھا مقابلہ کرنے چلی تھیں ہم سے، اپنوں کے ہاتھوں ہی ڈسی گئیں!

"دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف۔۔ اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی"

محترمہ کی عقل و دانش میں ہمیں کوئی شبہ نہیں اور دماغی صحت بھی ٹھیک ہی ہو گی تبھی تو علم و فضل کے دریا بہہ رہے ہیں۔

ویسے ایک موہوم سا شک ہے کہ کہیں نقاب کے پیچھے مظلوم کیمپ کی ہی شرارت تو نہیں۔ (کافی مظلوموں کو بھیس بدلنے کا شوق بھی ہوا کرتا ہے)۔

تبھی تو معاشرے کی پچاس فیصد عورتوں کو بیک جنبش قلم بے حیا، بے وفا اور فاحشہ قرار دیا گیا ہے۔

ہم بھرپور احتجاج کرتے ہیں جناب یا جنابہ!

ارے ٹھہریے! آپ کی داستان گوئی نے ہمیں متزلزل کر دیا۔ ہمیں کچھ شبہ سا ہو رہا ہے اپنی صنف پہ۔ ہو سکتا ہے بات کچھ ویسی ہی ہو، جیسی بیان کی گئی ہے۔ ہمارے پاس فاحشہ عورتوں کی بہت سی کہانیاں ہیں۔

چلئے محترمہ کی ظالم نگاہ سے دیکھتے ہیں!

جب عورت قرآن سے بیاہ دی جاتی ہے!

ارے نا سمجھو! آپ شکر کیوں نہیں ادا کرتے۔ اتنا بڑا مقام ملا، دنیا اور آخرت سنور گئی۔ اب کسی منحوس آدمی سے بھلا کیا ملتا بیاہ رچا کے!

جب عورت کاری کی جاتی ہے!

اب دیکھئے نا کسی بھولے بھالے کو بہلا پھسلا کر نئی منزلوں کو نکل جانا! کتنی بری بات ہے ماں کے لاڈلے کا یہ حال کرنا، تو پھر کچھ سزا تو بنتی ہی ہے نا!

جب عورت ونی کی جاتی ہے!

اب اپنے بھائی باپ کا کھا کے (جیسا کہ محترمہ کا کہنا ہے) ان کے نیک کاموں میں تھوڑا ساتھ دے دیا جائے تو کیا غم؟ آخر اسی دن کے لئے تو عورت کو چھت اور روٹی مہیا کی گئی تھی اور پھر لاوارث تھوڑی چھوڑا، ایک اور چھت اور روٹی کے انتظام کے ساتھ ایک اور سرپرست کے پاس ہی بھیجا نا! یہ بھی شکر کا مقام ہے!

جب عورت ریپ ہوتی ہے!

نا بی بی، اب ایسا بھی اندھیر نہ مچاؤ۔ کچھ نہ کچھ تو تمہاری بھی مرضی ہو گی نا۔ کچھ خطوط کا تبادلہ، کچھ نظروں کے پیام۔ اب وہ تھوڑا کھل کھیلا تو اس میں اس کا کیا دوش؟

جب عورت کے منہ پہ تیزاب پھینکا جاتا ہے!

اوہ بھائی، کئی فائدے ہیں اس میں۔ میک اپ کی ضرورت نہیں پڑے گی، آئینہ نہیں دیکھنا پڑے گا اور پھر گھر کے کاموں میں دل بھی لگا رہے گا۔ شوہر ویسے بھی چہرہ کہاں دیکھتے ہیں؟

جب عورت چولہا پھٹنے سے مر جاتی ہے!

اب عورت جہیز میں اپنا چولہا تو لائی نہیں اور اس پھوہڑ کو شوہر اور سسرال کے گھر کا قیمتی چولہا استعمال نہیں کرنا آیا اور جل گئی تو اس میں ان بے چاروں کا کیا قصور؟ ایسے ہی فضول میں معصوم شوہر پہ شک!

کمسن بچی کی شادی پچاس سالہ مرد سے!

لو اور سنو! بھئی اچھا ہے نا، بچی باپ کو یاد کر کے روئے گی نہیں، دن میں باپ کی شفقت اور رات میں... ایک ٹکٹ میں دو مزے!

لڑکی دن دہاڑے اغوا ہو جاتی ہے!

اب یہ لوٹھا کی لوٹھا باہر کد کڑے لگاتی پھریں گی تو سمجھانے کے لئے مظلوم مرد ہی آئیں گے نا! اور دیکھئے اچھی طرح تفصیل سے سمجھا بجھا کے آخر گھر تک بھی تو چھوڑ جاتے ہیں نا مظلوم مرد!

عورت کو سر عام ننگا گھمایا جاتا ہے!

اوہ، ویسے تو زمانہ قدیم کی بہت مثالیں دی جاتی ہیں اب اگر کسی نے اس زمانے کے فیشن سے (جب لباس کی سہولت میسر نہ تھی) کسی عورت کو متعارف کروا ہی دیا تو اس میں اتنا کیا واویلا!

عورت غیرت کے نام پہ مار دی جاتی ہے!

دیکھئے اب ایک چیز ہوتی ہے باپ اور بھائی کا شملہ! اب کیا عورت کو اچھا لگے گا کہ برادری میں شملہ نیچے ہو، اتنی قربانی تو بنتی ہے نا!

عورت کو کرنٹ لگا کے جنسی اذیت دی جاتی ہے!

اب عورت مرد کی ملکیت ہی تو ہے تو جیسے مرضی روندا جائے۔ ویسے کرنٹ تو کوئی بڑی بات نہیں، کپڑے استری کرتے ہوئے کئی دفعہ کرنٹ لگ جاتی ہے اب اس میں کیا اتنا شور مچانا!

عورت کو جائداد میں حصہ نہیں ملتا!

ارے پاگل عورت! کیا کرے گی ڈیڑھ اینٹ کی علیحدہ مسجد بنا کے؟ تجھے سر پہ چھت، تن پہ کپڑا (بوقت ضرورت) اور دو وقت کی روٹی ہی تو چاہیے وہ تو مظلوم مرد دیتا ہی ہے اپنی سلطنت نگری میں!

عورت کو حق مہر اور نان نفقہ نہیں ملتا!

اب عورت کو اتنا بھی مال پرست نہیں ہونا چاہئے۔ گھر کی ملکہ تو بنا دیتا ہے اور دو وقت کی روٹی بھی کھلا دیتا ہے چھوڑو یہ فضول کے نخرے!

لڑکی کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ملتی!

اب بات کچھ یوں ہے کہ ہمارے ملک کی دھوپ بہت تیز ہے۔ لڑکی باہر نکلے گی، رنگ روپ میلا ہو گا۔ پھر رشتہ بھی نہیں ملے گا اور فیر اینڈ لولی کا خرچہ علیحدہ! اور پھر لوگ نظر بھی تو لگا دیتے ہیں!

لڑکی کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں ہوتی!

خواہ مخواہ موٹی عینک لگوائی جائے کتابیں پڑھ پڑھ کے۔ خوبصورت آنکھوں پہ چشمہ لگ گیا تو ظلم تو ہو گا نا۔ آخر لوگ ہماری آنکھیں ہی تو دیکھتے ہیں!

اور وہ جو قبل اسلام بچیاں زندہ مٹی میں دفن کی جاتی تھیں!

ارے بھئی روتی بہت تھیں اور گھر کے مظلوم مردوں کی نیند میں خلل پڑتا تھا!

(ویسے آپس کی بات ہے۔ دفن تو آج بھی کی جاتی ہیں رسم ورواج کے ملبے تلے)

وہ تمام عورتیں جو روزانہ کی بنیاد پہ پٹتی ہیں!

اب جانے بھی دو! وہ تو ان کی طبیعت میں اضطرار پیدا کرنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ کچھ ان کو بھی شوق ہوتا ہے شوہر کی پیار بھری گالیاں سننے اور ضربیں کھانے کا!

دیکھا نہیں مار پیٹ کے بعد شوہر باہر قلفی کھلانے لے جاتا ہے۔ بالکل اس جانور کی طرح جو نکیل ڈالتے ہوئے شور کرے تو چھمک کی ضرب کے بعد چارہ بھی دیا جاتا ہے، آخر دودھ تو دوہنا ہی ہوتا ہے نا!

اب چونکہ ہم ڈاکٹر ہیں اور تشخیص کی عادت پڑ چکی ہے۔ سو عادت سے مجبور ہو کے سوچنا شروع کیا کہ آخر ماجرا کیا ہے؟

معلوم ہوا کہ یہ تحریر Himpathy کے رویے کی عکاسی کر رہی ہے۔

آپ sympathy اور empathy کے بارے میں تو جانتے ہی ہوں گے۔
sympathy ہمدردی کا نام ہے اور empathy وہ ہمدردی جو کسی دوسرے کے خیالات و جذبات کو اپنے پہ طاری کر کے محسوس کی جائے۔

لیکن اب کورنل یونیورسٹی کی فلاسفر پروفیسر کیٹ (Kate A. Manne) نے himpathy کی ٹرم متعارف کرائی ہے۔

"یہ وہ ناجائز اور بے حقیقت ہمدردی ہے جو مساجونسٹ (Misogynist) مردوں کو عورت پہ ہر طرح کا ظلم ڈھانے کے باوجود دی جاتی ہے "

پدرسری معاشرے کا بدصورت سچ جہاں مرد کسی بھی صورت حال سے بری الزمہ اور عورت ہر حال میں گھٹیا قصوروار اور مجرم!

جب بھی عورت اور مرد کا معاملہ ہو، بے شمار لوگ مرد کا قصور جاننے کے باوجود اسے بے چارہ قرار دیتے ہیں۔

"بس غلطی ہو گئی بے چارے سے"

"دیکھو کتنا شرمندہ ہے اب اور کیا کرے "

"اب مرد تو یہ کیا ہی کرتے ہیں"

"جوانی کا جوش ہے بھئی"

"مرد کو تو سات خون معاف ہیں"

"وہ بچوں سے دوری کا مستحق نہیں، اب اتنا بڑا قصور بھی نہیں اس کا"

عورت کی آواز تو تب ہی نقار خانے میں طوطی کی آواز بن جاتی ہے جب مرد کے مفادات پہ ضرب آنے لگتی ہے۔ اس سارے سسٹم میں عورت کے استحصال کے ذمہ دار مرد کے لئے صرف اتنی سزا کافی سمجھی جاتی ہے کہ اس کا چہرہ بے نقاب ہو گیا اور اس کی عزت پہ کچھ لوگوں کے درمیان حرف آیا۔ عورت کے ساتھ کیا گزری؟ Himpathy کے متوالے یہ جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور ان متوالوں میں عورتوں کی کوئی کمی نہیں۔

عورت کا پدر سری سسٹم سے جنگ کرنا جلتے انگاروں کے مترادف ہوا کرتا ہے اور یہ ایقان ہر عورت کے حصے میں نہیں آتا۔

معاشرے کی تھپکی لے کے خوش ہو جانے والیوں کو عافیت اسی میں نظر آتی ہے کہ طاقتور کی نظر کرم میں رہا جائے، اپنی ہی صنف پہ کیچڑ اچھال کے اچھی عورت ہونے کا میڈل حاصل کیا جائے۔ معاشرے میں مرد کی آشیر باد سے ملنے والی سوشل کرنسی سے اپنے آپ کو بھاری دکھایا جائے، چاہے اندر کی آواز سب زنجیریں توڑ دینے کا ہی کیوں نہ کہتی ہو۔

اپنے حق کے لئے آواز اٹھانے والی عورت سر پہ چھت اور دو وقت کی روٹی کے جھانسے میں نہیں آتی۔ پر کٹی چڑیا بن کے پنجرے میں چوری کھانے سے بہتر ہے اپنے پروں کی پرواز کو آزمایا جائے۔ دانے دنکے کا کیا فکر؟

آزادی صرف فحاشی اور آوارہ پن کا نام نہیں، کئی اور نام بھی ہیں آزادی کے۔

تعلیم حاصل کرنے کی آزادی، معاشی خوشحالی حاصل کرنے کی آزادی، اپنی مرضی سے شادی کرنے کی آزادی، بچے پیدا کرنے کی آزادی، ساس سسر کا محکوم نہ بننے کی آزادی، طلاق کے حق کی آزادی، جائیداد میں حصے کی آزادی، اپنی رائے کی آزادی اور اپنی زندگی پہ اپنے اختیار کی آزادی!

کیا اس آزادی میں ایسا کچھ ہے جو بنیادی انسانی تعلیمات اور اسلامی تعلیمات کے منافی ہو؟

1956 میں ایک فلم 'مائی فیئر لیڈی' میں ایک گیت شامل تھا۔ عورت تب بھی سر عام سنگسار کی جاتی تھی اور آج بھی پتھر پھینکنے والوں کی کمی نہیں۔ سو اس گیت کو Himpathy کا تمغہ پہننے والیوں کے نام سمجھیے!

Women are irrational

that's all there is to that

Their heads are full of cotton, hay, and rags

They're nothing but exasperating, irritating,

vacillating, calculating, agitating,

Maddening and infuriating

hags

ترجمہ:

(عورتوں میں عقل کہاں!

بات اتنی ہے کہ

ان کے کھوپڑی میں روئی، بھوسہ اور چیتھڑے ٹھنسے ہیں

مصیبت ہیں، ایک عذاب ہیں عورتیں

گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ

چلتر اور فسادی

لہو کھولتا ہے انہیں دیکھ کے

چڑیلیں ہیں یہ عورتیں)

یہ شامِ غریباں نہیں، شامِ زینب ہے!

شام آئی، ڈھلی اور تاریک ہو گئی!
سورج اپنی روشنی پھیلانے پہ شرمندہ ہوتے ہوئے ڈوب گیا!
چاند نہیں نکلا!
رات کی سیاہ تاریکی ہر طرف نگاہیں چراتے پھیلتی رہی!
رات جانتی تھی کہ وحشت و بربریت کا بازار گرم ہونے کو ہے!
جری مردوں کا ٹولہ اور سہتی عورتیں!
صحرا میں گڑے خیموں کو آگ لگا کے تماشا دیکھتے سرکش مرد اور جان بچاتی عورتیں اور بچے!
بچیوں کے منہ پہ طمانچے مارنے والے بہادر مرد اور کانوں سے کھینچی جانے والی بالیوں کے بعد بہتا خون!
چاروں طرف بکھرے لاشے اور چند تنہا عورتیں!
گھوڑے دوڑاتے، مسرت کے قہقہے لگاتے وحشی مرد!
یہ وہ منظر ہے جس پہ آج تک عرب کی سرزمین شرمندہ ہے!
کون تھیں یہ بہادر تن کے کھڑی ہونے والی عورتیں اور کون تھے یہ بدمست بزدل مرد!
یہ رسول کے گھر کی عورتیں ہیں، وہی رسول جس نے اسلام کی روشنی سے جہالت کے اندھیرے کو دور کیا مگر کیا واقعی جہالت کا اندھیرا چھٹا؟

اور یہ مرد کلمہ گو مرد ہیں، اسلام کی وحدانیت پہ ایمان لا چکے ہیں۔ کلمے میں رسول کی نبوت کی گواہی دینے والے مرد اور اسی رسول کی اولاد کا تماشا بنانے والے مرد!

اس شام کو شام غریباں پکارنے والے اس شام کے ساتھ انصاف کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ شام، شام زینب کہلائے جانے کی حقدار ہے، شام غریباں نہیں!

یہ شام اسلام بلکہ دنیا کی تاریخ کی بدترین دہشت گردی کی مثال ہے۔ جہاں جیت کے نشے میں چور، لشکر عمر سعد (صحابی رسول سعد بن ابی وقاص کا فرزند) نے نہتی عورتوں اور بچوں کی خیمہ گاہوں کو جلا کے صحرا میں چراغاں کیا۔

تاریخ کہتی ہے کہ جب بہتر افراد قتل کیے جا چکے، تب فیصلہ ہوا کہ بہتر لاشوں کے سر کاٹے جائیں کہ یزید کے دربار میں پیش کرنے ہیں اور باقی ماندہ لاشوں پہ گھوڑے دوڑا کے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے۔ نواسہ رسول اور جنت کا سردار زمین پہ کفن دفن کا حقدار بھی نہ ٹھہرا۔

نہیں معلوم ہم داعش اور طالبان کے سر کاٹنے کی بے حرمتی پہ اتنے حیران و پریشان کیوں تھے؟ اس کے بانی تو صدیوں پہلے یزید اور عمر سعد نکلے۔

سر کاٹ کے گنے گئے تو اکہتر نکلے۔ بہترواں سر کہاں تھا آخر؟ مشعلوں کی روشنی میں، زمین میں نیزے کی انیاں گاڑ کے آخر چھ ماہ کے علی اصغر کی لاش برآمد کر لی گئی اور بہترواں سر بھی گنتی میں شامل ہوا۔

اب گھوڑے دوڑے۔ ہزاروں سوار خوشی کے بدمست نعرے لگاتے اور لاشوں کو روندتے، ان کا قیمہ بناتے گئے۔ کیا چنگیز خان اور ہلاکو خان سے کسی بھی درجے میں کم تھے ہمارے کلمہ گو مسلمان!

میدان کارزار سے فراغت ہو گئی مگر دل میں بھڑکتی نفرت کی آگ ابھی کچھ اور مانگتی ہے۔ ابھی اس آگ کے شعلوں نے خیمے جلانے ہیں اور خیموں سے نکلتی رسالت کے گھر کی بیبیوں کا تماشا دیکھنا ہے۔

آگ لگی، ایک خیمے سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے اور پھر اور آگے۔
بیبیاں ایک خیمے سے دوسرے میں بھاگیں، دوسرے کو آگ لگی تو بچے سنبھالتی تیسرے میں منتقل ہوئیں اور پھر اور آگے اور آگے۔

اور وہ عمر رسیدہ عورت، جسے اپنے بیٹوں، بھائیوں، بھتیجوں اور صحابہ کا غم منانے کی فرصت بھی نہیں ملی۔ جس نے ابھی زمین و آسمان کے درمیان خون کی چادر تنی دیکھی ہے۔ پیاروں کے لاشے دیکھے ہیں، تین دن کی بھوک اور پیاس ہے، عرب کے صحرا کی پیاس۔

زینب علی اور فاطمہ کی بیٹی ہے۔ عرب کے بہادر ترین شخص کی بہادر بیٹی، اب باقی بچے ہوئے لوگوں کی محافظ ہے۔ سو فیصلہ کیا کہ خیموں سے باہر نکلنا ہے، جان بچانی ہے۔

آپ اور کچھ بھی نہیں سوچیے۔ صرف ایک عورت کے اعصاب کا امتحان کا اندازہ لگائیے کہ اس سخت گھڑی میں اپنے پاؤں پہ نہ صرف کھڑی ہے بلکہ سوچ رہی ہے، ہمت اور عزم سے مقابلہ کر رہی ہے کسی بھی طرح کی بے بسی اور بے کسی کے بغیر۔

بیبیوں نے خیمے چھوڑ دیئے، باہر خون میں بھیگی ریت پہ آ کر بیٹھ گئیں۔ رات ہے، تاریکی ہے، جلتے خیمے ہیں، بچھڑنے والوں کا درد ہے اور آنکھ میں آنسو ہیں۔

جیتنے والے ابھی بھی مطمئن نہیں، انہیں مزید تماشا چاہیے۔ انہیں بیبیوں کی چادریں کی چاہ ہے، بچوں کے منہ طمانچوں سے لال کرنے ہیں اور ان بہادر عورتوں نے اسے برداشت کرنا ہے۔ اپنی وقتی کمزوری کو عظمت میں بدلنا ہے اور ان تماشا کرنے والوں کو رہتی دنیا تک قابل مذمت بنانا ہے۔

بچپن سے شام غریباں سن رہی ہوں اور جب ناصر جہاں پڑھتے تھے،
"گھبرائے گی زینب"

میں ہمیشہ سوچتی تھی، کیسے گھبرا سکتی ہے وہ عورت جو اس رات بھی قائم ہوش و حواس کے ساتھ بہادری سے حفاظت کر رہی ہے، فیصلے کر رہی ہے۔ کیسے گھبرا سکتی ہے زینب، جو یزید کے دربار میں پہروں اپنے پاؤں پہ تن کے کھڑی رہ سکتی ہے اور یزید پوچھنے پہ مجبور ہو جاتا ہے،

"کون ہے یہ مغرور عورت"
کیسے گھبرا سکتی ہے دربار شام میں اپنے خطبے سے لرزہ پیدا کر دینے والی زینب!
یہ شام زینب ہے، یہ شام عورت ہے۔ یہ زینب کی بہادری اور جیت کی شام ہے۔
اسلام کی تاریخ کی بدنما شام لیکن ایک عورت کی اعلیٰ جرات و کردار کی شام۔
یہ شام رہتی دنیا تک ہر رنگ و نسل کی سب عورتوں کا سرمایہ اور فخر ہے۔
اے شام زینب، تیری عظمت کو سلام!

طاہرہ عبداللہ زندہ باد!

دل چاہتا ہے خوب کھلکھلا کر ہنسیں آج!

اپنی ہم نام (طاہرہ عبداللہ) کو آہنی لہجے میں بات کرتے سنا ہے ایک منمناتے اور جاہل مرد کے سامنے، جو عورت عورت نامی مخلوق سے جنم لے کے، لسانی اور دماغی صلاحیتیں اسی عورت کے توسط سے پا کے، انہی صلاحیتوں کے بل بوتے پہ قلم سے عورت کی بے وفائی کے نوحے لکھتا ہے اور زبان زہر اگلتی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ یہ فراموش کر دیتا ہے کہ اس کے وجود کا پور پور عورت کے احسانوں کا مرہون منت ہے۔

ہم نے طاہرہ عبداللہ اور خلیل الرحمن قمر کا مکالمہ سنا ہے۔ جس میں موصوف زہر آلود لہجے میں فرمارہے ہیں کہ عورت اور مرد کے حقوق بالکل مختلف ہیں کیونکہ دونوں کے پاس مختلف چیزیں ہیں۔ کاش قمر صاحب انگریزی فلموں سے خیال سرقہ کرنے کے علاوہ کچھ بنیادی سائنسی نکات سے بھی آگاہی حاصل کر لیتے تو اچھا ہوتا۔

عورت کا وجود چھیالیس کروموسومز کی بنت ہے اور مرد کا بھی، یہاں تک دونوں کی جنس کا تعین نہیں ہوا۔ اب ان چھیالیس میں سے دو XX کروموسومز نے عورت کو عورت بنایا اور مرد کے حصے میں دو XY آئے۔

آگے کا قصہ اب کچھ یوں ہے کہ تمام کروموسومز میں سے X سب سے زور آور کروموسوم سمجھا جاتا ہے کہ تمام تر ذہانت، علمی قابلیت اور کامیابیاں X کی بدولت ہیں۔ عورت کے پاس قدرت کی طرف سے دو X اسے مضبوط تر بناتے ہیں۔ اسی لئے عورت لمبی

عمر پاتی ہے، تمام سرد و گرم سہتی ہے اور خلیل جیسے مرد کی لن ترانیاں سن کے بھی مسکراتی ہے۔

مرد کے پاس XY میں موجود واحد X ماں کی طرف سے آتا ہے، سو جو تھوڑی سی عقل پائی جاتی ہے وہ بھی ماں کی دی ہوئی خیرات ہے۔ Y کروموسوم جو باپ سے ملتا ہے، وہ نامکمل کروموسوم ہے، ساکت (Inert)، جامد (stagnant) اور لولا لنگڑا (جس کا چوتھا Strand غائب ہے) اس لیے کروموسوم کا عقل، سوچ اور دانش سے دور دور تک تعلق نہیں۔

تو کن مختلف چیزوں کی بات کرتے ہو تم خلیل الرحمن قمر! یہ کس چیز کا گھمنڈ ہے؟ تمہارا سامان عورت سے کم ہی نکلے گا جیسے بھی حساب کرو!

مزید گل فشانی کرتے ہوئے موصوف فرماتے ہیں، عورت مرد کے حقوق میں سے حصہ مانگتی ہے جو نہیں دیا جا سکتا۔ اتنی عقل سے پیدل بات یقیناً خلیل جیسا ڈرامہ باز ہی کہہ سکتا ہے۔ عورت کی ذات میں حصہ بٹانے والے! کیا تمہیں علم ہے کہ زندگی شروع کہاں سے ہوتی ہے اور کیسے ہوتی ہے؟

چلیے ایک سفر کی منظر کشی کرتے ہیں، لاموجود سے وجود تک کا سفر!

رحم مادر میں نطفہ ٹھہر چکا ہے۔ اس نطفے کو انسان بننے کے لوازمات کے ساتھ نو ماہ کا عرصہ درکار ہے۔ سانس کے لئے آکسیجن چاہیے، بڑھوتری کے لئے خوراک چاہیے، محفوظ ٹھکانہ اور غذا چاہیے، حفاظت چاہیے، محبت چاہیے، جو قدرت ماں کے ذریعے اس نطفے کو بغیر اس کی جنس معلوم کیے دیتی ہے، اور یہ ہیں وہ حقوق جن کا آغاز زندگی ٹھہرنے کے ساتھ ہو جاتا ہے، مرد و عورت کی تخصیص کیے بنا۔

ہمیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ ہم اس نطفے کو رحم مادر میں انسان کے روپ میں ڈھلتے دیکھتے ہیں۔ ایک ایک دن، لمحہ بہ لمحہ، قدم بہ قدم۔ وہی دماغ، ایک سے ہاتھ پیر، ایک ہی طرح دھڑکتا قلب، ایک سی آنکھیں، ناک، منہ، کان۔ نہ بننے کے عمل میں کوئی فرق ہوا، نہ پیدائش میں۔ ایک ہی راستہ ہے جس سے دونوں کا دنیا میں ظہور ہوتا ہے۔

لیجئے پیدائش ہو چکی، اب پوچھنا یہ ہے خلیل الرحمن سے کون سی تمہاری چیزیں ہم سے مختلف ٹھہریں کہ تمہارے اور ہمارے حقوق مختلف ٹھہرے، تم اعلی اور ہم ارزاں قرار دیے گئے۔

فرض کیجئے کہ ایک دن رب کائنات یہ سوچ لے کہ چلیے جھگڑا ہی ختم کرتے ہیں، خلیل الرحمن قمر کے مختلف سامان کے غرور کا۔ سو اب سے تمام بچے جو ایک لڑکا لڑکی ہونے کی معمولی نشانی کے ساتھ جنم لیتے تھے، وہ پندرہ برس کی عمر میں ظاہر کی جائے گی۔

لیجیے نہ رہا بانس اور بانسری بھی گئی بھاڑ میں۔ لڈو پیڑے، مبارکبادیاں، غرور، فخر، اور مختلف ہونے کی اکڑ، کس بات پہ بھائی اب؟

بچہ آیا ہے دنیا میں اور انسان کا بچہ ہے، ہنستا بھی ہے، کھاتا پیتا بھی ہے بولتا بھی ہے اور سوچتا بھی ہے۔ بس یہ نہیں معلوم کہ جنسی تقسیم میں کہاں کھڑا ہے؟ پڑ گئے نا سوچ میں کہ کیسے پالیں اب؟ کہاں مختلف ٹھہرائیں؟

اب تعلیم بھی برابر، غذا بھی برابر، لباس بھی ایک جیسا، الفت و شفقت میں بھی فرق نہیں، زندگی میں آگے بڑھنے کے مواقع بھی یکساں، اعتماد کی آبیاری بھی ایک سی، جیون ساتھی چننے کی آزادی بھی، معاشرے میں ایک جیسے حقوق کی آگہی اور شعور بھی۔ اور پھر جب قدرت سن شباب پہ جنسی پہچان دے، تب معاشرے میں ایسے مرد و عورت ہوں جنہیں نہ اپنی مصنوعی بالادستی کا زعم ہو اور نہ ہی دوسرے کے کمزور اور مختلف ہونے کا شائبہ کہ پیدا ہونے سے شباب تک کی عمر کی اٹھان ایک سی بنیاد پہ اٹھائی گئی ہے۔

ہمارا دل چاہتا ہے کہ سمون دی بوائر کا وہ جملہ دہرا دیا جائے جس نے پچھلے بہتر برس میں کروڑوں انسانوں کے دماغ صنفی مساوات کی تفہیم سے روشن کیے ہیں اور جو غالباً خلیل الرحمن قمر نے نہیں پڑھا اور اگر پڑھا تو یقیناً نہیں سمجھا

"One is not born, but rather becomes, a woman"

سو ثابت ہوا خلیل الرحمن قمر کہ یہ جو مختلف چیزوں کا رونا تم نے رویا ہے، ان کا کہیں وجود نہیں۔ یہ جو مختلف سلوک ہے عورت سے، یہ سب تم جیسے مردوں کی کرشمہ سازی ہے، دماغ کا فتور ہے۔ یہ جو تم اپنے حقوق پہاڑ کی چوٹی پہ لئے بیٹھے ہو یہ تم جیسوں کی اختراع

ہیں جو پدر سری نظام کو بر قرار رکھنے کے لئے عورت کو جذباتی ڈائیلاگ والے ڈراموں میں مقید رکھتے ہیں۔

تمہیں عورت کی آواز پھنکار لگتی ہے، تم اس پھنکار سے چڑتے ہو، یہی کہا نا تم نے!

ایک کمزور مرد کے پاس ہے ہی کیا سوائے عورت کے لئے نت نئے القابات کے۔

تمہارے پاس جب بات کا جواب نہ ہو تو تمہیں عورت فاترالعقل نظر آنا شروع ہو جاتی ہے۔

تم اپنے آپ کو ایک شکاری باز کے روپ میں دیکھتے ہو اور تمہیں عورت چڑیا کی شکل میں چاہیئے تاکہ جہاں چاہو، جیسے چاہو، شکار کر سکو۔

مرد کے جال میں نہ پھنسنے والی کو، سر بلند کر کے اپنے غصب شدہ حقوق کی بات کرنے والی کو تم حقارت سے فیمینسٹ پکارتے ہو۔ تمہاری ننھی منی سی عقل جو کہ تم نے اپنی ماں سے ہی مستعار لی، تمہیں یہ بات سمجھانے سے قاصر ہے کہ عورت، عورت بعد میں ہے، پہلے وہ انسان ہے تمہارے جیسی انسان، بلکہ تم سے بہتر انسان۔

اس کا بھی آسمان کی وسعتوں، ارض زمین کی دل کشیوں، پرواز کرتے پنچھیوں، قوس قزح کے رنگوں، رم جھم کی برساتوں کے ساتھ ساتھ حصول علم، روزگار کے مواقع، معاشی آزادی رفیق سفر کے چناؤ اور اپنی زندگی پہ اپنے اختیار کا اتنا ہی حق ہے جتنا تمہارا۔

یہ حق رحم مادر میں نطفے کی شکل میں سفر کا آغاز کرتے ہوئے خالق کی طرف سے تمہیں بھی ملا اور ہمیں بھی، اور اسے تم نہ چھین سکتے ہو نہ اس پہ قابض ہو سکتے ہو فرق صرف یہ کہ تم نے کسی خمار آلود لمحے میں یہ مغالطہ پال لیا کہ تم پر ادب اترتا ہے، نازل ہوتا ہے، دراصل تم جہالت کے نزلے میں مبتلا ہو۔ ادب انسانی شعور کی اعلیٰ ترین سطح پر تخلیق کیا جاتا ہے، اترتا تو موتیا ہے ان آنکھوں میں جو عورت اور مرد کی مساوات سے کھلنے والے امکانات دیکھنے سے قاصر ہیں!

کیا سمجھے، خلیل الرحمن قمر!

ہیرامنڈی، طوائف اور لیڈی ڈاکٹر

دو پیشے، ایک انتہائی معزز، دوسرا معاشرے کا ناسور!

لیکن ہے ایک قدر مشترک اور وہ ہے عورت!

ایک عورت شرافت کے سنگھاسن پہ براجمان ہوتی ہے اور دوسری پاتال میں اتر جاتی ہے، یہ تقدیر کا وہ کھیل ہے جو آج تک کوئی سمجھ نہیں سکا۔ کائنات کے اسرار میں زمان و مکان کا فیصلہ کس کے لئے کیا ہے اس پہ نہ ہم قادر ہیں نہ آپ۔

کل رات وفاقی مشیر اطلاعات لیڈی ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان کا ایک پرانا کلپ دیکھنے کو ملا جس میں وہ طیش کے عالم میں بازو ہلا ہلا کے فرما رہی تھیں کہ ان کا کیریئر کسی ہیرا منڈی کی طوائف جیسا شروع نہیں ہوا۔

مذکورہ بیان اور بیان داغنے والی میں پھر ایک قدر مشترک تھی، عورت!

ان کی خوش گفتاری اور جوش کے تو ہم ان دنوں سے مداح ہیں جب وہ میڈیکل کالج میں ہماری جونیئر ہوا کرتی تھیں اور تب بھی انسانیت کی خدمت کی بجائے سیاسی قلابازیوں پہ زیادہ یقین رکھتی تھیں۔ بس یہ سمجھ نہیں آیا کہ انہیں کیریئر کی مثال کے لئے ہیرامنڈی کا انتخاب کیوں کرنا پڑا؟

گستاخ اکھیاں کتھے جا لڑیاں!

ہیرامنڈی ہمارے معاشرے کی ایک ایسی مسخ تصویر جسے کوئی بھی دن کی روشنی میں کھلی آنکھوں نہیں دیکھنا چاہتا۔ منٹو نے وہاں کی عورت کے بارے میں جو نشتر زنی کی ہے وہ آج بھی دل چیرتی ہے۔

طوائف، ایک ایسی عورت جس سے بیک وقت محبت بھی کی جاتی ہے اور نفرت بھی۔ ضرورت کے لحاظ میں وہ سر کا تاج ہے اور ضرورت نکلنے پر پاؤں کی جوتی۔ اس کی مثال اس ٹشو پیپر سی ہے جو آپ کے گندگی میں لتھڑے ہاتھوں کو صاف تو کرتا ہے پر خود کوڑے کے ڈھیر میں فنا ہو جاتا ہے۔

طوائف ایک جیتی جاگتی عورت ہے، میرے اور آپ جیسی، احساسات، جذبات اور خیالات سے بھرپور۔

وقت کی تفریق اور گردش میں عورت کے اس کردار اور مقام کا تعین کون کرتا ہے؟ معاشی ناہمواری، زمانے کا استحصال، مرد کا جبر یا ازلی جنسی بھوک؟

کون ہے آخر جو عورت کی مجبوریوں کو نیلام کرنے وہاں بساتا ہے؟ کون مالک بھی بنتا ہے اور خریدار بھی؟ کون ہے جو دن کی روشنی میں اس پہ ٹھٹھے لگاتا ہے اور رات کے اندھیرے میں اس کی آغوش میں پناہ لیتا ہے۔

فلم دیکھنے کا اور کتاب پڑھنے کا شوق ہو تو معاشرے کے اس ناسور سے آپ کا تعارف بچپن میں ہی ہو جاتا ہے لیکن ساتھ میں ایک تنبیہہ بھی کہ اس موضوع پہ کوئی سوال نہیں، کوئی ذکر نہیں۔

ہم بھی معاشرے کے اس رویے کے ساتھ پل بڑھ کے بڑے ہوئے۔ پڑھائی کی خاطر لاہور پہنچے۔ تجسس اور ایک پروجیکٹ کی خاطر ہم نے اس بازار سے گزرنے کی ہمت کی مگر دن کی روشنی میں۔

تنگ گلیاں، سنسان چوبارے، مرجھائے ہوئے پھول، آوارہ کتے، عطر پھول بیچنے والے چرسی اور اکا دکا بالکنی میں کھڑی عورتیں، میک اپ کی تہوں کے بغیر مدقوق چہرے جو حالات کے ستم کی تحریر کردہ لکیریں دور سے بھی دکھاتے تھے۔ اپنے آپ سے بے نیاز، گہری سوچوں میں گم، جانے گزری رات کا غم تھا، یا آنے والی شب کی فکر۔ یہ عورتیں نہیں تھیں، کہانیاں تھیں، ننگی کہانیاں۔ جن سے ہم جیسے شریف گھروں میں پیدا ہونے والے لوگ منہ چھپا کے گزر گئے۔ ہمت ہی نہ ہوئی کہ معاشرے کی اس مکروہ اور بدصورت شکل سے پردہ اٹھایا جائے اور مجبور کہانیوں کی کہانیاں کہی جائیں۔

وقت گزرا، ان خواتین کو بھی کیریئر اچھا کرنے کا شوق چرایا کچھ قدردان بھی یہی چاہتے تھے سو ہیرامنڈی کے یہ ہیرے بستیوں میں آبسے اور ہیرامنڈی معاشرے کے اشرافیہ کے لئے سیاحتی جگہ بن گئی۔

گزشتہ سرما جب امی کی عیادت کے لئے پاکستان گئی تو پتہ چلا کہ سامنے والے گھر میں کچھ ایسے کرایہ دار آئے ہیں جن کا تعلق ہیرامنڈی سے معلوم ہوتا ہے۔ شام ڈھلے بڑی بڑی گاڑیاں آرکتی ہیں اور موسیقی کی تانیں بکھرنا شروع ہو جاتی ہیں۔ حیرانی کا مقام تھا پر معاشرے کا چلن دیکھ کے اب حیران ہونے کی بھی ہمت نہیں رہی۔ دو ہی دن بعد نئے سال کی رات تھی۔ سارا دن امی کی حالت دیکھ کے بے حال تو تھی ہی، سر بھی شدید درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ بستر پہ لیٹ کے ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ ایک عجیب سے شور سے گھبرا کے اٹھ بیٹھی، مردانہ وزنانہ چیخیں، بہت اونچا میوزک، بے ہودہ گانے۔

یہ ہنگام بدتمیزی صبح صادق تک جاری رہا، بہت دفعہ دل چاہا کہ جا کے دستک دوں اور ہمسائیوں پہ گزرنے والی قیامت کا بتاؤں لیکن گھر والوں نے کسی انہونی کے ڈر سے روک دیا۔

کچھ دنوں بعد امی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ سوئم کا ختم تھا، سیپارے اور یسین پڑھی جا رہی تھی۔ ایک خاتون داخل ہوئیں، دراز قد، خوش شکل، سمارٹ، باوقار۔ تعارف سے معلوم ہوا کہ سامنے والے گھر سے آئیں ہیں۔ مجھے ان سے دو تین دفعہ پوچھنا پڑا کہ کیا واقعی سامنے والے گھر سے؟

انہوں نے سیپارہ پڑھا، دعائیہ ختم میں حصہ لیا، رخصت ہوئیں اور ہمارے پاس بہت سے سوال چھوڑ گئیں۔

منٹو کے مطابق کوئی وقت ایسا بھی ضرور آتا ہو گا جب طوائف اپنے پیشے کا لباس اتار کے صرف عورت رہ جاتی ہو اور یہ شاید ایسا ہی وقت تھا۔

ہم محترمہ وزیر صاحبہ کو بتانا چاہتے ہیں کہ دنیا کے بازار میں جسم کے علاوہ بھی بہت کچھ بکتا ہے، خیالات، نظریات حب الوطنی، وابستگی اور وفاداری!

حدیقہ کیانی نے زندگی کو برسوں میں ناپنا نہیں سیکھا

میری پچاسویں سالگرہ تھی اور میں بہت خوش تھی۔

زندگی کے سٹیج پہ پچاس سال گزار دینا اور پدرسری معاشرے میں اپنے دل، روح اور شگفتگی کو قائم رکھنا ایک کمال ہی تو ہے۔

ہمارے بچوں کا خیال تھا کہ اماں کی پچاسویں سالگرہ خوب دھوم دھام سے منائی جائے ہم بھی راضی تھے۔ سودعوت نامے بھیجنے کی دیر تھی کہ حیرانی بھرے فون آنے لگے،

"کیا واقعی پچاس سال؟"

"مگر ضرورت کیا تھی، پچاس سال لکھنے کی؟"

"تم پچاس کی دکھتی نہیں ہو"

"یار! اب تمہارے ساتھ ساتھ ہماری عمر کا بھی اندازہ ہو جائے گا"

"بندے کو اتنا بھی بولڈ نہیں ہونا چاہیے"

یہ اور ایسے بہت سے مکالمے ہم نے سنے اپنے دوستوں سے۔ ہم چپ رہے، ہم ہنس دیئے۔

پاکستانی عورت کو عمر میں چھوٹا بننے اور چھوٹا نظر آنے کا جنون ہے اور اس شوق کے ہاتھوں تقریباً ہر دوسری عورت اپنے سے ذرا سی بڑی عورت کو آنٹی پکارتی ہے۔

حال میں ہی حدیقہ کیانی پہ کسا جانے والا فقرہ اس کا ثبوت ہے، حالانکہ اگر حدیقہ جیسی سمارٹ، خوش شکل اور باوقار خاتون، دنیا سے ریٹائر ہو جانے والی آنٹی ہے تو پھر بہت سی نوجوان اور جوان لڑکیوں کو چلو بھر پانی تلاش کرنا چاہیے۔

حدیقہ کو ہم بچپن کے ان دنوں سے جانتے ہیں جب وہ اپنی بڑی بہن عارفہ اور بھائی عرفان کے ساتھ لیاقت میموریل ہال راولپنڈی میں موسیقی کے مقابلوں میں حصہ لیا کرتی تھیں۔ ہم تقریری مقابلوں کے شیر ہوا کرتے تھے۔ ان دنوں بھی ان کی آواز کا سوز نشاندہی کرتا تھا کہ ان کی منزل بہت آگے ہے۔ ان کا دوسرا پڑاؤ لاہور ٹی وی تھا اور پھر اتفاق دیکھیے کہ ہم موسیقی کے اس پروگرام کے میزبان تھے جہاں سے ان کے سفر کا آغاز ہوا۔ حدیقہ نے زینہ بہ زینہ شہرت کی کامیابیاں سمیٹیں اور آج اس کے دامن میں اتنا کچھ ہے کہ انہیں کسی بھی نام سے پکارا جائے، گلاب گلاب ہی رہے گا۔

شاید ان صاحب کو معلوم نہیں، جنہوں نے نہ جانے کس زعم میں یہ پھبتی کسی ہے کہ ہر کامیاب اور دنیا فتح کر لینے والی عورت کے چہرے پہ نظر آنے والی ہر شکن، جلد پہ چمکنے والے تمام نشان، سر میں جھلکتی چاندی تو ایک افتخار ہوا کرتا ہے ایک ایسی زندگی کا، جس کے ہر ورق پر تجربات، احساسات اور کامیابیوں کی کہکشاں دوسروں کی آنکھیں چندھیاتی ہیں۔

اور چلیے مان لیا، پچاس کے ہو گئے - آنٹی کہلانے کے حقدار بھی ہو گئے تو کیا اپنا گلا گھونٹ لیں یا دنیا تیاگ دیں کہ رنگ، روشنی، ہوا، خوشبو، لہریں، برسات کی رم جھم اور چاندنی، غرض دنیا کی تمام خوبصورتیاں آنٹیوں کے لئے حرام قرار دی گئی ہیں۔

پاکستانی معاشرے کا یہ نظریہ کہ بڑھتی عمر کے ساتھ عورت پہ زندگی کی ہماہمی کے دروازے بند ہونے چاہئیں اور اسے صرف قبر میں پہنچنے کی تیاری کرنی چاہیے، انتہائی پامال سوچ کا عکس ہے۔ زندگی کو خانوں میں تقسیم کرنا اور اس سے ذرا سا بھی باہر جھانکنے سے فتوی لگا دینا معاشرے کا چلن سا ہو چلا ہے اور عورت بھی نادانستگی میں اس کا حصہ بن رہی ہے - غریب کو علم ہی نہیں کہ اپنی مرضی سے آسمان کی وسعتوں میں اپنے پر کھول کے پرواز کرنے کی لذت کیا ہے؟ سر اٹھا کے جینا اور اپنی زندگی پہ اختیار آپ کے اندر کیسے کیسے پھول کھلاتا ہے -

ہم پیرس میں ایک ریسٹورینٹ میں کھانا کھا رہے تھے ہماری ساتھ والی میز پہ دس عورتوں کا گروپ بیٹھا تھا جن کی عمریں ستر اور اسی سال کے درمیان تھیں۔ خوش رنگ کپڑے، میک اپ سے چمکتے چہرے، باتیں، قہقہے۔ یوں لگتا تھا کہ زندگی اپنی تمام بشاشت و

رنگینی کے ساتھ موجود ہے۔ جب وہ اٹھ کے چلنے لگیں تو ہر دوسری خاتون چھڑی کے سہارے چل رہی تھی۔

ہماری صاحبزادی بولیں،

"اماں آپ نے غور کیا؟ یہ تقریباً نانی کی عمر کی عورتیں ہیں۔ کیا آپ نے پاکستان میں اس عمر کی عورت کو مصلے، تسبیح، درس اور عبادات کے علاوہ کہیں دیکھا ہے؟ انہیں دیکھئے، یہ عورتیں زندہ ہیں۔ ان کے لیے زندگی میں ابھی کئی مفہوم باقی ہیں، یہ بستر پہ لیٹ کے اللہ اللہ کرتے موت کا انتظار کرنے کی بجائے چلتے پھرتے اللہ کی بخشی ہوئی زندگی کا مزہ اٹھا رہی ہیں"۔

کیا اپنے ہاں کوئی تصور کر سکتا ہے کہ آپ کی نانی سہیلیوں کے ساتھ کافی پینے جا رہی ہوں۔ اور اگر جا ہی رہی ہوں اور زندگی سے بھرپور بھی نظر آ رہی ہوں تو بڈھی گھوڑی لال لگام کا آوازہ کسنا تو کہیں نہیں گیا۔

نانی تو چھوڑیے، بہت بڑی ہو گئیں، اپنے ہاں تو شادی کے فوراً بعد شوہر اور سسرال کا فرمان جاری ہوتا ہے۔ "یہ سہیلیوں وغیرہ کے چونچلے اب بھول جاؤ، میاں اور بچوں میں دل لگاؤ"۔ حتیٰ کہ میاں کی موجودگی میں کسی کا فون سننے پہ بھی پابندی لگ جاتی ہے۔

ہمیں یاد ہے ہم نے جب بھی کسی دوست سے شام کے وقت باہر چل کے سنیما دیکھنے یا کافی پینے کا کہا تو ہر کسی کا جواب تھا "شام! نہیں شام کو تو وہ گھر ہوتے ہیں، اور برا مانیں گے اگر میں باہر نکل گئی"۔

ٹی ایس ایلیٹ نے شاید ایسے ہی لوگوں کے بارے میں لکھا تھا،

I have measured out my life with coffee spoons

یہاں مسئلہ کچھ اور نہیں پھر وہی پدرسری معاشرے کی تقسیم کا ہے، جہاں صنف کی بنیاد پہ آپ کے مقام کا تعین کیا جاتا ہے۔ اور نظام کی بقا اس میں ہے کہ عورت کا سر نہ اٹھ سکے، اسے باور کرایا جائے کہ اس کی عظمت مرد کے پیچھے چلنے میں ہے۔ کیوں کہ مرد کو تو سات خون بھی معاف، لیکن عورت کو گویا ہاتھی کو سوئی کے ناکے سے گزارنا ہے۔ وہ مرد جو اپنے دوستوں کے ساتھ وقت بغیر کسی سوچ یا پابندی کے گزارتا ہے، اسی مرد کی بیوی کبھی کوئی شام اپنی سہیلیوں کے ساتھ گزارے یہ برداشت نہیں۔

"بچوں کا کیا ہو گا"

"ابا تمہارے ہاتھ کا کھانا کھاتے ہیں "

"اماں ناراض ہوں گی"

"مناسب نہیں لگتا "

"شریف عورتوں کے یہ لچھن نہیں ہوتے "

"ہمارے گھر کی عورتیں سنیما نہیں جاتیں "

"میں کیا اکیلا بیٹھا رہوں "

"میرے ساتھ چلنا "

"چھوڑو نا، یہ سب کنوارپنے کے شوق"

"یہ کون تمہیں پٹیاں پڑھا رہا ہے "

سو کہانی وہی ہے کہ لامحدود اختیارات کے مالک کی مرضی نہیں کہ عورت کو کچھ لمحوں کی بھی رہائی ملے۔ وہ عورت کے جسم و جان کا مالک تو ہے ہی، اس کی لرزتی روح کو کچھ لمحے رہائی کے ملیں، یہ کیسے ممکن ہے؟

اس سے بھی بڑا المیہ یہ ہے کہ جسے غم ہونا چاہیے اپنی حق تلفیوں پہ، وہ اس پدر سری مقام کو قبول کرتی ہے، اور اس کی ترویج کے لئے مرد کے رنگ میں رنگی جاتی ہے۔ اس محترمہ کی حدیقہ کہانی پہ پھبتی اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

مرد عورت کے ذہن کو اس قدر مفلوج کر دیتا ہے کہ پھر عورت کی ہر بولی میں درپردہ مرد بولتا ہے،

اک پرندہ میرے کاندھے پہ اتر آتا ہے!

قفس میں کسی اور کی مرضی سے سانس لیتے اور کسی اور کی زبان بولتی اس مجبور مخلوق کو کیا علم کہ جب زمین کے ساتھ آسمان بھی اپنا ہو تو ایسی زندگی میں گزرنے والے سب عدد کم پڑ جاتے ہیں۔

سلامت رہو حدیقہ، تم نے زندگی کو برسوں میں ناپنا نہیں سیکھا۔

بچہ جننے پر اختیار کا مالک کون؟

جنگلوں سے ہجرت ہوئی، بستیاں آباد ہوئیں۔ حضرت انسان نے وحشی پن کم کیا، شکار کرنا باقی تو رہا پر زمین سے رزق اگانا بھی سیکھا۔ زندگی کی بقا کی دوڑ میں گھر ایک اکائی بنا اور گھریلو لوازمات وجود میں آئے۔

کھیتی باڑی، زراعت، گھریلو ضروریات نے مویشی پالنا سکھایا۔ اپنی جان کے ساتھ ساتھ جانوروں کی بقا بھی مقدم ٹھہری کہ وقت کی ضرورت تھی۔ کچھ جانوروں سے ریوڑ کیسے بنتا ہے، یہ بھی جان لیا۔ فطرت، وقت، زندگی اور حالات کی ضرورت کے تحت افزائش نسل شروع ہوئی، گھر کے اندر بھی اور باہر مویشی باڑے میں بھی۔

ساتھ ہی ساتھ ملکیت کا تصور ابھرا، گھر کے اندر بھی اور باہر بھی۔ باڑے میں بھیڑ، بکریاں، گائیں، بھینسیں اور گھر میں رہنے والی عورتیں بیویاں، بیٹیاں اور بہنیں۔

سو مزاج کچھ یوں بنا کہ کس گائے نے بچہ کب دینا ہے، کس بھینس کا حمل کب ٹھہرنا ہے، کس اونٹنی کا دودھ کب چھڑوانا ہے، بکریوں سے کب تک بچے پیدا کروانے ہیں اور کب ذبح کرنا ہے۔

اور گھر کے اندر بیوی نے سال بہ سال حاملہ ہونا ہے۔ بیٹیوں اور بہنوں کو کب اگلے مرد کے حوالے کرنا ہے۔ زبان والیوں کو بے زبان ہی رکھنا ہے۔ یہ سب اختیار مرد نے زندگی کی دوڑ میں سیکھا اور اختیار کر لیا۔

گھر کے باہر بے زبان مخلوق تھی جس کو کائنات میں عقل اور اختیار کے بغیر اتارا گیا تھا اور اس کا مقصد کائنات کی نمو تھا۔ گھر کے اندر والی مخلوق کے پاس عقل بھی تھی، اور

زبان بھی، اور رب کی طرف سے اختیار بھی۔ مگر نیرنگیٔ وقت دیکھیے کہ زبان سلب کر لی گئی، عقل اور اختیار کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا کہ طاقت کا محور مرد تھا۔

میں 25 سال سے حاملہ خواتین دیکھ رہی ہوں۔ زرد مدقوق جھلسے چہرے، کمزور جسم، لڑکھڑاتے قدم، بڑھتی عمر، بے روح آنکھیں۔ جسم میں خون کی بوند نہیں کہ گھر میں کھانے کو نہیں۔

پانچواں، چھٹا، ساتواں یا آٹھواں حمل، اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پیچیدگیاں، ذیابیطس، بلڈ پریشر، خون کی کمی، ہارٹ پرابلمز اور زچگی کے دوران زیادہ خون بہہ جانے سے موت۔

"بی بی! آپ کو اس بچے کی ضرورت ہے "

"نہیں جی "

"خاوند کیا کرتا ہے"

"مزدوری جی "

"پچھلے بچے کیا کرتے ہیں "

"کچھ نہیں جی"

"پڑھتے ہیں "

"تو بی بی! بچے بند کیوں نہیں کرواتیں "

"وہ جی میرا خاوند نہیں مانتا"

کچھ سال پہلے تک جب مولویوں نے پاکستانی معاشرے کو یرغمال نہیں بنایا تھا، مرد کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ وجہ صاف ظاہر تھی کہ احساس ملکیت اتنا قوی تھا کہ اس فیصلے میں عورت کی گرتی صحت کا خیال کرنا، معاشی زبوں حالی کا ادراک کرنا اور عورت کو اس فیصلے میں شریک کرنا اپنی مردانگی پہ چوٹ اور مالک کے مقام کے منافی تھا۔ سو ڈاکٹروں کے سوالوں کے جواب میں آئیں بائیں شائیں کرتے مرد تھے۔

اللہ بھلا کرے مولوی حضرات کا، جنہوں نے معاشرے کے مردوں کے دماغ میں ایسی چندھیا دینے والی روشنی پہنچائی اور خاص طور پہ وہ مقام جہاں مردوں کے پر جلتے تھے۔

طاقت کا نشہ بھی تو ہے کہ زیردست، بےچارگی سے آپ کی طرف دیکھے اور آپ فیصلے کی طنابیں اپنے ہاتھ میں رکھیں۔

کبھی کبھی یہ معلوم ہوتے ہوئے بھی کہ شوہر کا جواب کیا ہو گا۔ دل چاہتا ہے کہ حجت تمام کی جائے اور خاوند کو بلا کر اس سے پوچھا جائے

"آپ کیا کام کرتے ہو "

"مزدوری جی"

"کتنا کما لیتے ہو"

"کچھ زیادہ نہیں "

"اچھا! اب اتنے بہت سے بچے تو ہو گئے اور تمہاری بیوی کی صحت بھی بہت خراب ہے تو حمل ہونا بند کیوں نہیں کروا لیتے"

یہ سنتے ہی شوہر اچھلتا ہے، منہ لال کر کے ہمیں گھورتا ہے، دل ہی دل میں خبیث عورت سمجھتے ہوئے چار گالیاں سناتا ہے اور ہمیں کافر جانتے ہوئے گویا ہوتا ہے

"نہیں جی نہیں، یہ خلاف اسلام ہے، گناہ ہے "

ہم ایک کوشش اور کرتے ہیں

"سنو! حمل گرانا منع ہے لیکن حمل سے بچنا گناہ نہیں ہے اور پھر پہلے ہی اتنی غربت ہے "

"نہیں جی نہیں! رزق تو اللہ کا وعدہ ہے، ہر پیدا ہونے والا اپنا رزق خود لائے گا "

اب تک ہم پیچ و تاب کھا چکے ہوتے ہیں۔

یہ ہے وہ صورت حال جو ستر سے اسی فیصد عورتوں کو درپیش ہے۔

اللہ کا وعدہ، رزق، حرام و حلال سب عورت کے نصیب کی باتیں۔

اللہ نے سوچنے کا کہا ہے اس سے ہمیں کیا مطلب۔ اللہ نے علم حاصل کرنا فرض کیا تو وہ ذرا مشکل کام ہے۔ اللہ نے کائنات تسخیر کرنے کا کہا تو وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ جھوٹ بولنا گناہ کبیرہ ہے وہ تو اوڑھنا بچھونا ٹھہرا۔ نصف ایمان تو ویسے ہی گنوا بیٹھے ہیں کہ صفائی سے کوئی تعلق نہیں۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سب مذہب سے محبت نہیں، مذہب کی آڑ میں صدیوں سے کھیلا جانے والا وہی کھیل ہے جس میں طاقت کا حصول اصل ضرورت ہے، کہ طاقت نشہ ہے، سرور ہے، اختیار ہے مردانگی کا۔

اور چوپال میں بیٹھ کے مردانگی ثابت کرنے کا بہترین طریقہ یہی تو ہے کہ ہر سال مونچھوں پہ تاؤ دیتے ہوئے اعلان کیا جائے کہ اب کے برس پھر اللہ نے کرم کیا ہے، بس ماں کی جان چلی گئی۔ اللہ کی چیز تھی، اللہ نے واپس لے لی۔ کیا کریں، اوپر والے پہ کوئی زور تو ہے نہیں۔

اور میرا ہر حاملہ عورت دیکھ کے دل چاہتا ہے، چیخ چیخ کے کہوں

ارے مردودو، رحم کر دو، کہ اس جاں بلب میں اب اپنا وزن اٹھانے کی سکت نہیں۔ اب کے تمہاری ایک اور کمزور، مصنوعی مردانگی اسے لے ڈوبے گی۔

موسم گرما، جذبات کی گرمی اور بچوں کا سونامی

کیا کمال خبر ہے؟

پڑھ کے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آرہا کہ ہم کیسے کیسے ہیرا محقق اور دانشور اپنے ہاں چھپائے بیٹھے ہیں اور ہماری یونیورسٹیاں، جو انٹرنیشنل رینکنگ میں آنے کا تو تکلف گوارا نہیں کرتیں، کیوں مستفید نہیں ہو رہیں ایسے ایسے نابغہ روزگار مقامی ماہرین سے۔

پنجاب اور سندھ بورڈ کی کتاب ہے مطالعہ پاکستان اور موضوع ہے موسم گرما۔ لکھا یہ گیا ہے کہ موسم گرما کی سختیاں میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات پہ یوں اثرانداز ہوتی ہیں کہ وہ بھی گرمی کھا جاتے ہیں اور نتیجہ نکلتا ہے، ڈھیروں بچے، کم وقفہ اور گرمی سے بے حال ماں باپ بلکہ پورا پاکستان۔

اب یہ موشگافی کس نے کی ہے، کوئی واقف حال یا بہت بڑے علامہ ہی روشنی ڈال سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ مصنف اس دشت کی کٹھنائیوں سے گزرے ہوں اور موسم گرما کی وجہ سے کثرت اولاد کے متاثرین میں شامل ہوں۔ سو اب مطالعہ پاکستان کی کتاب میں موسم گرما کے مضمرات پر روشنی ڈال کے پاکستان کی آنے والی نسلوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے منحوس سائے سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، اور خاندانی منصوبہ بندی کے خواہش مندوں کے لئے گرما میں ٹھنڈے مقامات پہ وقت گزارنے کی رہنمائی بھی۔

ہمیں اپنے آپ پہ بہت افسوس ہے اتنے سالوں کی پریکٹس میں بانجھ جوڑوں کا علاج بھی کیا اور ان کا بھی جو مزید بچے نہیں چاہتے تھے۔ انٹرنیشنل کانفرنسوں میں شرکت کر

لی۔ نئی نئی ریسرچ باقاعدگی سے پڑھ لی اور ہم پھر بھی نکمے ہی رہے کہ ہمیں پتہ ہی نہ چل سکا کہ وطن عزیز میں کیسی کیسی دریافتیں ہو رہی ہیں۔

ہمارا خیال تھا، جس پہ اب ہم بہت شرمندہ ہیں کہ وطن عزیز کا موسم گرما، جہاں بجلی کی لوڈشیڈنگ کمال، لوگ باگ شدید گرمی کے ہاتھوں بے حال، پسینے میں شرابور، مچھروں کی یلغار کے زیر سایہ کچھ بیزار ہی رہتے ہوں گے، رومانس کا خیال کم ہی آتا ہو گا۔ پر یہ پاکستانی قوم ہے سخت جان، سخت کوش، ہر گھڑی تیار کامران۔ سو دریافت یہ ہوا کہ موسم گرما ان کی طبیعت میں جولانی پیدا کرتا ہے۔

ہم انتہائی سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں کہ ہم ٹیکسٹ بک بورڈ سے رابطہ کریں اور دست بستہ عرض کریں کہ ہم ان علامہ کی شاگردی اختیار کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے یہ تھیوری پیش کی ہے، ایک اور فیلوشپ ہی سہی۔

اس تھیوری کا میڈیکل کی کتابوں میں شامل کیا جانا انتہائی ضروری ہے، کہ سدباب کیا جائے ماں باپ کی گرمی اور بچوں کے سونامی کا جو ہر طرف ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے محکمے کی ہنگامی بنیادوں پر تربیت کی ضرورت ہے تاکہ ان کی اب تک کی سب بے کار کوششوں کو کامیابی کا سرا مل سکے۔

دوسری بات جس کے لیے ہم زیادہ پرجوش ہیں کہ ہم اس تھیوری کو مغرب کے ان تمام تحقیق دانوں کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں جو ہمیں کسی خاطر میں نہیں لاتے اور دن رات اپنے ریسرچ پیپر ہمارے سر پہ تھوپتے رہتے ہیں۔ ہم ان کو دکھانا چاہتے ہیں کہ ہم ایسے بھی گئے گزرے نہیں، ہمارے یہاں بھی نادر روزگار لوگ ہیں جو اپنی دانش سے دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ مغرب کو پتہ ہونا چاہئے کیسے کیسے گدڑی کے لعل ہم چھپائے بیٹھے ہیں۔

ان تمام ماہرین کو جو مغرب میں گھٹتی آبادی پہ فکرمند ہیں، آگاہ کرنا چاہئے کہ یہ ٹھنڈا موسم ہی ہے جو نہ لوگوں کو گرم ہونے دیتا ہے اور نہ ہی آبادی میں اضافہ۔ سو اب انہیں اپنے لوگوں کو موسم گرما میں پاکستان کی سیر ضرور کروانی چاہیے۔ ہماری وزارت سیاحت کا بھی بھلا ہو گا۔

اس تھیوری سے ان تمام جوڑوں کو بھی فائدہ اٹھانا چاہیے جو اولاد نہ ہونے کے مسائل سے دوچار ہیں۔ انہیں چاہئے کہ کچھ عرصے کے لئے سبی یا جیکب آباد منتقل ہو جائیں، مفت کا علاج ہے۔ ویسے ہمیں یہ معلوم نہیں کہ ہر دو علاقوں کے رہائشی اتنی گرمی کھا کے اب کن حالوں میں ہیں۔

ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ موسم گرما میں پیدا ہونے والے تو نو ماہ قبل ماں کے پیٹ میں تشریف لاتے ہیں یعنی کہ موسم خزاں یا شروع جاڑے میں، تو کہیں ایسا تو نہیں کہ کہنے والے موسم سرما کے گیت گانا چاہتے تھے۔ اب اگر ایسا ہے تو ہمیں سرما میں والدین کی گرمی کے اسباب دریافت کرنے پڑیں گے۔ ویسے مونگ پھلی اور مچھلی سے تعلق نکل سکتا ہے، گرانٹ مل جائے تو اس پہ کوئی ریسرچ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

ہم سائنس اور طب کی پاکستان میں ترویج پہ اتنے خوش ہیں کہ والدین کا احتجاج کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ لگتا ہے وہ آج بھی بچوں کو وہی کہانی سنا رہے ہیں جب بچہ ماں باپ سے سوال کرتا تھا کہ راتوں رات گھر میں بچہ کہاں سے آ گیا تو آسمانوں سے اترنے والے فرشتے کی کہانی سنائی جاتی تھی۔

وہ واقعہ تو آپ نے سنا ہو گا جس میں بچہ نئے آنے والے کے نزول کی داستان سن کے باقی افراد خانہ کے بارے میں بھی پوچھتا ہے اور جواب میں جب سب کا نزول فرشتے، پرندے، پری اور جادوئی چھڑی کے ذریعے ہوتا ہے تو بچہ کچھ پریشان ہو کے ماں سے کہتا ہے ' آپ کا مطلب ہے کہ ہمارے گھرانے میں کوئی بھی قدرتی طریقے سے نہیں پیدا ہوا '

ویسے موسم گرما کی آمد آمد ہے، کیا خیال ہے آپ کا؟

رسم دنیا بھی ہے، موقع بھی اور دستور بھی ہے

قندیل بلوچ کے گاہک اور بیوپاری

آج چودہ جولائی ہے!
ایک اور سال بیت گیا!
قندیل بلوچ کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔
کون تھی قندیل بلوچ؟

ایک سر پھری عورت، جو چلی تھی اپنے معاشرے کے ان دیوتاؤں کو للکارنے، جو عورت کے آشنا صرف رات کی تاریکیوں میں بنتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہوئے چلی تھی کہ روک سکو تو روک لو!

اور روک لیا گیا، اس کی آتشیں زبان ہمیشہ کے لئے چپ کروادی گئی۔ وہ سر کش عورت، وہ کام سر عام کرنے چلی تھی جو عورتوں سے بند دروازوں کے پیچھے کروایا جاتا ہے۔

قندیل نے ان تمام مردوں کو، اور ان کی رات کے اندھیرے میں نمودار ہونے والی خرمستیوں کا پردہ چاک کیا۔ وہ خود بھی تماشا بنی اور مرد کیا چاہتا ہے اور جنس مرد کے حواسوں پہ کیسے سوار ہے، یہ بھی دکھادیا۔

سوشل میڈیا پہ ہر نئی وڈیو کے لئے لاکھوں لوگوں کی پسندیدگی کے کلکس اور بے چینی سے اگلی وڈیو کا انتظار، یہ معاشرے کے شوقین مزاجوں کے بنا کہاں ممکن تھا۔ دن میں پتھر پھینکنے والے خریداروں نے ہی رات میں اتنے پھول بھیجے کہ وہ بے خوف ہو کے سوشل میڈیا کے بازار میں آ بیٹھی۔

اس نے ثابت کیا کہ مرد چاہے مولوی ہو اور مذہب کا عمامہ پہن کے معاشرے کا اور خاص طور پہ عورتوں کا ٹھیکے دار بنا ہو، رہتا وہی معمولی مرد ہے۔ اپنے جبلی تقاضوں اور اپنی ہوس کے نشے کے ساتھ۔ اس وقت مرد کو یاد نہیں رہتا کہ مذہب، معاشرے اور اخلاقیات کے سامنے وہ بھی اتنا ہی جواب دہ ہے جتنی کہ عورت۔ گناہ اور ثواب کا فلسفہ اس پہ بھی اتنا ہی لاگو ہے جتنا کہ عورت پہ۔

عورت اکیلی تو کوئی کوٹھا نہیں چلا سکتی اور عورت وہاں تماشبین بھی نہیں ہو سکتی۔ یہ مرد ہی ہے جو اسے اور اس کی مجبوری کو وہاں بیچتا بھی ہے اور خریدتا بھی۔ عورت سوشل میڈیا پہ اکیلی بے حیائی بھی نہیں کر سکتی کہ بے پناہ شوق سے دیکھنے والا بھی مرد ہے۔ اور کسی مولوی کی خلوت میں اس کی مرضی کے بغیر نہیں پہنچ سکتی۔ مولوی کی رال گرنا بہت ضروری ہے۔

ہمارے معاشرے میں مرد اور وہ بھی مولوی، کیسے کریلا اور نیم چڑھا!

مذہب کا تڑکا لگا کے جنونی معاشرے کی باگ ڈور بھی ہاتھ آجائے تو آپ کے پاؤں زمین پہ کیوں ٹکیں گے۔ طاقت کا نشہ تو بڑے بڑوں کے سر پہ چڑھ کے بولتا ہے۔

اب کون یاد رکھے کہ وہ سورہ نسا جو عورتوں کو بار بار یاد کرائی جاتی ہے۔ وہ عورت سے پہلے مرد کو حکم دے رہی ہے کہ خبردار دیکھنا نہیں، نگاہ پہ پردے ڈال لو، یہ شہوت کا راستہ ہے۔ اس شیطانی رہ گزر کو نظر کے دروازے سے بند کر دو۔

قران کا یہ سبق اول تو یاد نہیں رہتا۔ اگر کوئی یاد کروانے کی جسارت کر لے تو ڈھٹائی سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اگر زیبائش سر عام ہو گی، عورت ڈھانپے گی نہیں تو ہم تو نظر کو جھکا نہیں سکتے یعنی مجبور ہیں اف اللہ!

قندیل نے جب مردوں کی بے قابو شہوت کو چوک کے بل بورڈ پہ رسوا کر دیا تو کچھ جیالے ڈھونڈنے لگے کہ کہاں سے آئی ہے یہ من چلی، شیر کی کچھار میں گھس کے اس کا شکار کرنے۔

آخر ایک جری صحافی نے کھوج ہی لیا کہ اس کا تعلق معاشرے کے اس پس ماندہ طبقے سے ہے جہاں عورت سانس بھی مرد کی اجازت کے بغیر نہیں لے سکتی۔ اب ہنسی اڑانے

کی باری تھی۔ نشیبی بستیوں کی باسی اور اٹھان دیکھو، چلی ہیں نام وحلیہ بدل کے مردوں کی دل لگیوں کو بے نقاب کرنے۔

سزا دینے کا فیصلہ ہوا۔ یہ منہ زور عورت جو سوشل میڈیا پہ مرد کے پہلے سے بے قابو جذبات کو مزید بے قابو کر رہی ہے، کیوں نہ اس کی اصلیت اس کے اپنوں کو دکھائی جائے۔ اس کے گھر کے مردوں کو غیرت دلائی جائے کہ کیوں کھلا چھوڑ دیا اس آگ بھری کو، کیسے مرد ہو تم، ایک عورت نہیں سنبھالی جاتی۔

چلیے جی! ایک صاحب نے بیک گراؤنڈ من وعن چھاپ دیا۔ ایک اور عقل کل صاحب، جنہیں دادا گیری خوب بھاتی ہے، نے اپنا پرائم ٹائم شو چٹپٹا بنانے کی سوچی۔ مولوی اور قندیل کو آمنے سامنے بٹھا دیا، اور قندیل نے مولوی کی خلوت بے نقاب کر دی۔ وہ تو پہلے ہی بدنام تھی، اسے شعلہ بن کے آگ لگانے میں کچھ مانع نہ تھا۔ سو اس نے وہی کیا جو محترم اینکر نے سوچا تھا۔ شو کی ریٹنگ تو بڑھ گئی مگر مولوی کی پگڑی اچھل گئی۔ لوگ ہاگ ٹھٹھا لگانے لگے کہ مولوی کے کرتوتوں کا علم تو تھا ہی، مگر میڈیا پہ یوں آمنے سامنے۔

قندیل کو یوں پیچنے میں کسی کو خیال نہ آیا کہ وہ مردوں کے اس جنگل میں کس قدر غیر محفوظ کر دی گئی ہے۔ نچلے طبقے کی عورت، اور اتنی جرات۔ خود کو بھرے بازار میں بیچنا تو سمجھ میں آتا ہے اور معاشرے کو قبول بھی ہے بلکہ بہت مرغوب بھی۔ لیکن خریداروں کے نام پتے کون چوک کے بل بورڈ پہ لکھتا ہے؟

قندیل کی زبان کاٹنی ضروری تھی۔ اسے سبق سکھانے کے لئے سولی چڑھایا جانا تھا۔ مرد وزن کا یہ کھیل تو صدیوں سے جاری ہے مگر اب عورت کی ہمت کہ تماشبین کے کمزور لمحوں کو بے نقاب کرے اور اس کی بے تابیوں کی ہنسی اڑائے۔ یہ معاشرے کے رواج میں نہ تھا اور نہ ہونے دیا جائے گا۔

سو قندیل بلوچ کی زبان خاموش کروا کے عورت کو یہ پیغام دے دیا گیا کہ ہماری خلوت کا ساتھی بننا ہے تو خامشی سے۔ ہمیں ضرورت تو ہے تمہاری، اپنی بے چین شہوتوں کے لئے مگر خبردار اندر کی بات اندر ہی رہے باہر نہ نکلے۔

بازار میں بیٹھو ضرور کہ ہماری آرزو بھی ہے اور ضرورت بھی، مگر اشتہار نہ لگنے پائے۔

تمہیں شمع محفل بننے پر سزا نہیں دی جا رہی۔ تمہاری لو ہمارے اختیار سے باہر ہو چلی تھی۔ اسے بجھانا ضروری ہو گیا تھا۔ جیسا کہ ہوتا آیا ہے، تمہاری جگہ خالی نہیں رہے گی۔ نام اور چہرہ تبدیل ہو گا، اختیار کی ترتیب وہی رہے گی۔

ہم تمہارے خریدار تھے اور رہیں گے!

حجاب سے ہے رگِ ملا میں پیہم اضطراب

تعلیمی اداروں میں بچیوں کے لئے حجاب اور عبایا کے ضمن میں خیبر پختون خوا کی صوبائی حکومت نے ایک نوٹیفیکیشن جاری کیا اور پھر واپس لے لیا۔ ملائے مکتب کی صفوں میں مگر اس سے وہ طوفان اٹھا کہ تھمنے میں نہیں آرہا۔ کالم پر کالم ارزاں کیا جارہا ہے۔ بیان پر بیان چلا آرہا ہے۔ ایک نوٹیفیکیشن پر ایسی قیامت اٹھا دی گویا بھارت نے مقبوضہ کشمیر میں آرٹیکل 370 منسوخ کر کے جو ظلم کیا ہے، خیبر پختون خوا حکومت نے گویا اس زمین میں صنعت مستزاد کا مظاہرہ کر دیا ہے۔ ایسا طوفان جیسے بطن گیتی روز ازل سے اس نوٹیفیکیشن ہی کے انتظار میں تھا۔

"ہم سب" میں بھی دھڑا دھڑ لکھا جارہا ہے۔ پروفیسر عاصم حفیظ کے کالم نے لیکن اس زمین میں کلام خاتم کا بیڑا اٹھایا!

محترم کالم نگار اسلامی تہذیب کا ڈنکا پیٹ پیٹ کے لبرل طبقے کو کوسنے میں مصروف ہیں۔ یوں محسوس ہوا کہ موصوف کو اسلام کا ایک ہی رنگ نظر آیا اور وہ ہے عورت کا حجاب اور عبایہ!

شاید اس لئے کہ بے حجاب عورت پہ جب نظر اٹھتی ہے تو پھر جھکنا بھول جاتی ہے۔ جب تک نفس غیر مطمئنہ عورت کے نشیب و فراز کا تفصیلی جائزہ لے کے مطمئن نہ ہو جائے۔ آخر نظر کا قرض ہے، دل کی تسکین کے تقاضے ہیں، اپنی نظر پہ قابو رکھنا مشکل ہے تو فریق ثانی ہی کا جینا حرام کیا جائے۔

کاش محترم پروفیسر صاحب، عرب میں رائج اسلامی تہذیب کے دیگر نمونوں پر بھی نظر کرتے اور ان کی کم فہمی اور کم علمی کو دور کرنے کا بیڑا ہمیں نہ اٹھانا پڑتا۔ دل چاہتا ہے کہ ان اسلام کے ٹھیکے داروں کو کچھ اسلامی تاریخ یاد کرواؤں، جو ان متوالوں کو یاد رکھنے میں ذرا مشکل پیش آتی ہے۔

تاریخ اسلام کی پہلی خاتون، اسلام سے پہلے بھی معزز سمجھی جانے والی کامیاب بزنس وومن، چالیس برس کی بیوہ خدیجہ اپنے سے پندرہ سال چھوٹے خوبرو نا کتخدا کو پسند کر کے شادی کا پیغام دیتی ہیں اور سرور کائنات اثبات میں جواب دیتے ہیں۔ یہ ہے ایک عورت کا آسمان اور لامحدود پرواز، جہاں تک آج چودہ سو سال بعد بھی ہمارا قیاس پہنچ نہیں سکتا۔ عرب میں آج بھی کسی بھی عمر اور رتبے کی عورت کسی بھی عمر کے مرد سے شادی کر سکتی ہے۔ اپنی پسند اور اپنی مرضی کا نعرہ چودہ سو سال سے موجود ہے۔ نہ تو والدین کی عزت کو ٹھیس پہنچتی ہے اور نہ ہی برادری کی عزت پر حرف آتا ہے عورت کو موت کے گھاٹ اتارنے پہ جس غیرت کا نعرہ لگایا جاتا ہے اس کا اسلامی تہذیب میں دور دور تک تصور نہیں۔ بی بی عائشہ پہ بہتان لگایا جاتا ہے، تو کوئی باپ، بھائی یا شوہر گردن تن سے جدا نہیں کرتے۔

کیا خیال ہے پروفیسر صاحب، اس پہلو پر بھی ایک کالم ہو جائے تا کہ اس شاندار اسلامی تہذیب وورثے کی روایت پر ہم عورتیں بھی عمل کر سکیں۔

عورت کے جذبات واحساسات کس قدر اہم ہیں، ان کا بھی اسلامی تہذیب کے اس واقعے سے لگا لیجیے۔ جب ایک خاتون نے پیغمبر سے کہا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنے سے قاصر ہیں کہ اس کی شکل وحلیے سے وہ کراہت محسوس کرتی ہیں۔ نبوت کے داعی نے ڈانٹ پھٹکار کرنے کی بجائے ان کی بات سن کے طلاق لینے کی اجازت دی۔ ذرا سوچیے آج کل مردوں کی بے ہنگم داڑھیوں اور گنبد بے در نما شکم سے زچ ہو کے اگر عورتیں علیحدگی اختیار کرنا چاہیں گی تو ہمارے محترم پروفیسر کیا پھر بھی اسلامی تہذیب کی دہائی دیں گے؟

جہیز میں ڈھیروں ڈھیر اشیا نہ لانے پہ معصوم لڑکیوں کے جسم راکھ ہوتے تو دیکھے ہی ہیں نا آپ نے۔ اسلامی تہذیب اور تاریخ جہیز نامی کسی ہندوانہ بدصورتی سے واقف نہیں۔ دولہا کی مالی حیثیت چاہے کلرک کی ہو یا کسی اور معمولی ملازمت کی، اس کو شادی سے

پہلے گھر اور ضروریات زندگی کا انتظام کرنا ہی ہوتا ہے اور دلہن رخصت ہو کے اسی گھر میں اترتی ہے۔ ساس کی شعلہ بار آنکھوں اور نندوں کی بد نما سیاست کے بنا زندگی کا آغاز کیا جاتا ہے اور کسی بھی مشکل کی صورت میں دونوں ساتھی ایک دوسرے کا مداوا کرتے ہیں۔ دولہا میاں اپنے خاندان کے ساتھ مل کے اپنی ہم سفر کو آگ کے حوالے نہیں کرتے۔ کیا حجاب کی مالا جپنے والے ہمارے دانشور اس موضوع پہ بات کریں گے؟

ایک اور منظر دیکھیئے۔ بارات آچکی ہے اور دولہا والوں کی تیوریاں چڑھ چکی ہیں۔ گرما گرم بحث ہے اور بارات واپس لے جانے کی دھمکی ہے۔ معاملہ عورت کے حق مہر کا ہے، سو دل کیسے مانے۔ اکیسویں صدی میں رہ رہے ہیں اور حق مہر چودہ سو برس پہلے والا کہ اسلامی تہذیب سے محبت بہت ہے۔ اور اس محبت کا تقاضا یہ ہے کہ حصول عورت کے لئے جیب پہ بوجھ نہ پڑے۔ حجاب کا معاملہ تو مختلف ہے، زبان کو تھوڑی سی تکلیف دے کے تقریر ہی تو کرنا ہے۔

آیئے آپ کو بتائیں کہ دنیائے عرب، اسلامی تہذیب کے وارثوں کے ہاں حق مہر کا کیا رواج ہے، یہاں حق مہر شادی سے پہلے ادا کرنا لازمی ہے۔ ہم جب ساتھی خواتین سے سنتے ہیں کہ ان کے ہونے والے شوہر شادی سے پہلے ہی بیس سے چالیس لاکھ حق مہر ادا کر چکے تو ہماری حالت غیر ہو جاتی ہے کہ کبھی کوئی ہمارا حق مہر نہ پوچھ لے، جو عین اسلامی روایات کے مطابق مبلغ پانچ سو روپے ٹھہرایا گیا تھا اور ہمارے ہاتھ میں تھما بھی دیا گیا تھا۔

یاد رہے کہ کسی کی کم حیثیت حق مہر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ ہر لڑکا ملازمت میں آتے ہی روپیہ جمع کرنا شروع کر دیتا ہے کہ حق مہر اور علیحدہ گھر کے بنا شادی ناممکن ہے۔ اب تو پروفیسر صاحب یقیناً چاہیں گے کہ ہمارے معاشرے کی غیر اسلامی روایات کا خاتمہ کیا جائے۔ نہ معصوم لڑکیاں آگ میں راکھ ہوں گی، نہ ساس نند زندگی اجیرن کریں گی اور نہ ہی لوگ بیٹی کے پیدا ہونے پہ رنجیدہ نظر آئیں گے۔

ارے بھیا! قرآن کے وراثت کے اصول تو آپ نے پڑھ ہی رکھے ہوں گے اور امید کرتی ہوں کہ آپ ان احکامات کی پابندی کرتے ہوئے معاشرے میں تلقین شاہ بھی بنتے ہوں گے۔ خدائے بزرگ و برتر نے وراثت کے قانون پہ عمل نہ کرنے والوں پہ بے حد و

بے حساب لعنت فرمائی ہے۔ اس حساب سے تو اس حمام میں تقریباً سب ننگے ٹھہرے کہ زیادہ تر کا یہ کہنا ہے اللہ کا کہنا برحق مگر فی الحال زندگی مشکل ہے اور جائداد بانٹ کے اسے مزید مشکل کیوں بنایا جائے۔

ہمارے ماموں اس سلسلے میں دور کی کوڑی لائے۔ اماں سے جائیداد اپنے حق میں لکھوا بھی لی اور مزید محفوظ رہنے کے لئے ایک ایسی دستاویز پہ دستخط لے لئے جس کے مطابق ہماری اماں نے اپنا حصہ بیچ دیا تھا۔

پروفیسر صاحب! آپ کہہ رہے ہیں نا کہ کتاب میں واضح احکامات حجاب کے بارے میں ہیں۔ کتاب میں تو حجاب سے کہیں زیادہ واضح احکامات کم تولنے، ملاوٹ، جھوٹ، غیبت، انصاف اور صلہ رحمی کے بارے میں موجود ہیں۔ جان سکتی ہوں کہ آپ نے معاشرے میں تبدیلی لانے کے لئے کتنی تقریریں کیں یا کتنے آرٹیکل لکھے؟

رات کی تاریکی میں پورن فلمیں دیکھنے والے، زینب اور فرشتہ کو درندگی کا نشانہ بنانے والوں کو اپنی بے قابو وحشتوں کا علاج ایک ہی نظر آتا ہے۔ اور اسلامی تہذیب کی بھی ایک ہی شاندار مثال نظر آتی ہے اور وہ ہے حجاب اور عبایہ!

آپس کی بات ہے! بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں بے چارے نفس کے مارے! مشکل اپنے نفس میں ہے اور نشانے پہ ہے بے چاری مجبور مخلوق عورت۔ اصل میں انہیں عورت تھری ان ون کے پیکج میں چاہیے۔ اپنی اور اپنے گھر والوں کی خدمت کے لئے ہندوانہ داسی، اپنی وحشت کو قابو میں رکھنے کے لیے اسلامی باندی اور رات کی تاریکی کو رنگین بنانے کے لئے زن بازاری۔

اب تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ دین حقانیت اتارا ہی اس لئے گیا تھا کہ عورت نامی مخلوق کو سدھارنا مقصود تھا۔ اس وقت نوزائیدہ مٹی میں زندہ دفن ہو رہی تھی۔ آج عمر کے کچھ سال گزار کے زندہ دفن ہو رہی ہے، فتووں میں، مرد کی نفسانی کمزوریوں میں، لعن طعن میں، چار دیواری میں، بنیادی انسانی حقوق سے محرومی میں۔

مبارک ہو آپ سب کو، آپ نے اسلام کی روشنی کو عورت کی قبر تک نہیں پہنچنے دیا۔ جایئے! جنت کی حوریں آپ کی راہ تک رہی ہیں، کیا خبر آپ کا کچھ علاج انہی کے ہاتھوں ہو جائے۔ ویسے اس جہاں مین بھی اس سوچ کا مآل حضرت اقبال نے لکھ رکھا ہے

مَیں بھی حاضر تھا وہاں، ضبطِ سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرتِ مُلّا کو مِلا حکمِ بہشت
عرض کی مَیں نے، الٰہی! مری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حُور و شراب و لبِ کِشت
نہیں فردوس مقامِ جَدل و قال و اقوال
بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرِشت
ہے بد آموزیِ اقوام و مِلل کام اس کا
اور جنّت میں نہ مسجد، نہ کلیسا، نہ کُنِشت!

اگر صفیہ اور زبیدہ، رینا اور روینا بن جائیں

اخبار میں چھپنے والی تصویر جگر چیرتی ہے۔ دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ جی چاہ رہا ہے کہ منہ نوچ لوں مگر کس کا؟

بارہ اور چودہ برس کی دو بچیاں، سہمی سہائی، نہ صرف اپنا مذہب تبدیل کرنے کا اعلان کر رہی ہیں بلکہ دو مجہول سے مردوں کے ساتھ ازدواجی زندگی بھی شروع کر رہی ہیں۔

عورت ہوں، گائناکولوجسٹ بھی، ہماری سمجھ کے مطابق بارہ اور چودہ برس کا سن، بچپن اور لڑکپن کا دور، گڑیوں سے کھیلنے کی لاابالی سی عمر، اہم باتوں کی ناسمجھی اور اپنی پہچان نہ ہونے کی عمر ہے- جہاں زندگی کیا ہے، کیوں ہے، کیسے ہے، کا فہم اور بلوغت کے مسائل، جسمانی تبدیلیوں اور بدلتے ہارمونز کی خبر نہیں۔ سو ہماری عقل قاصر ہے کہ کیسے، کس طرح ان بچیوں نے شعور کی منزلیں طے کر لیں کہ گھر سے نکلیں، مذہب کے ساتھ ساتھ سب کچھ چھوڑنے کا فیصلہ کیا، شادی رچائی اور اب مسرور و شاداں بیٹھی ہیں۔

ساتھ میں دو انتہائی ناخواندہ شکلوں والے مرد دیکھے جا سکتے ہیں جو دنیا میں تو ابھی تک کچھ کر نہیں سکے، لیکن دین کی اس خدمت کے عوض میں جنت کے حقدار ہو جانے کی خوشخبری پہ مسرور بیٹھے ہیں۔

وڈیو میں اسلام کے نام نہاد ٹھیکیدار، انتہائی فخر سے ہاتھ لہرا لہرا کے اعلان فرما رہے ہیں کہ یہ بچیاں عرصے سے اسلام کی تعلیمات سے متاثر تھیں اور اپنی مرضی سے، جی اپنی مرضی سے گھر سے نکلیں، درگاہ پہنچیں اور مسلمان ہو گئیں۔

مطلب یہ کہ گھوٹکی کی رہنے والی، کسی محلے میں پرورش پانے والی، غریب ماں باپ کی اولاد کا شعور اتنا ترقی کر چکا تھا کہ انہیں اپنی زندگی کو اس ڈگر پہ ڈالنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ بارہ اور چودہ برس کا سن تو اب لگا مگر وہ کافی عرصے سے اس راستے کی مقلد تھیں۔ چلیں فرض کر لیتے ہیں کہ انہیں یہ کشف دو تین سال پہلے ہوا ہو گا جب وہ علی الترتیب نو اور گیارہ سال کی ہوں گی۔

میرا دل چاہتا ہے کہ میں بچیوں کی دانش مندی پہ قربان ہو جاؤں اور اگر ہو سکے تو آئی کیو چیک کروا ڈالوں اور کچھ نہیں تو ان گدڑی کے لعلوں کو اپنے بچوں کے لئے ذرا ضرب المثل ہی بنا دوں کہ سب سہولیات کے میسر ہوتے ہوئے، پڑھے لکھے ماں باپ کی زیر سرپرستی، بہترین سکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہوئے، اور عالم یہ کہ اس عمر میں کوئی عام سمجھ کی بات بھی سمجھ نہیں آتی۔ تف ہے ہماری اولاد پہ۔

اور ایک یہ بچیاں ہیں کہ ماں کی گود سے ہی تقابل ادیان شروع کر دیا اور کتنی با اعتماد اور اپنے حقوق سے آشنا کہ اپنی مرضی سے بھی واقفیت ہو گئی اور پھر تبدیلیٔ مذہب کا فیصلہ بھی کر ڈالا۔ بھئی میں تو بہت متاثر ہوئی۔

دو بچیوں کی ماں ہوں اور دونوں اتنی چھوٹی بھی نہیں جیسے کہ رینا اور روینا، لوٹھا کی لوٹھا ہیں اور ان کو ابھی بھی میری آغوش چاہیے۔ وہ ابھی بھی مجھ سے ایسے ہی لپٹتی ہیں جیسے ننھی بچیاں۔ امتحان اچھا نہ ہو، پڑھائی کا سٹریس ہو، نوکری کا انٹرویو ہو، رات کے پچھلے پہر میرے بستر میں گھس کے ماں کی گرمی محسوس کرنا اب بھی اچھا لگتا ہے- ماتھے پہ میرا بوسہ لے کے وہ پر یقین ہو جاتی ہیں کہ اب کوئی آفت ان کی طرف نہیں آئے گی۔

میں اٹھارہ برس کی عمر میں گھر سے نکلی کہ میڈیکل کالج میں داخلہ ہوا تھا اور اب ہمیں ہوسٹل میں رہنا تھا۔ ہوسٹل میں ہر شہر کی لڑکیاں، اور ہر کسی کے چہرے پہ ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں نمی۔ ماں باپ کے رخصت ہونے کے بعد کسی کے آنسو تھے اور کسی کی سسکیاں۔ ہوسٹل کی پہلی شام آج تک حافظے میں محفوظ ہے جب لوگ ننھے بچوں کی طرح گھر یاد کر کے باجماعت روئے اور سینیئرز نے آ کے آنسو پونچھے۔

ویک اینڈ پہ گھر جانے کی اور ماں کے گلے لگنے کی ہڑک اب تک نہیں بھولی۔ جس دن میں نے گھر پہنچنا ہوتا، میں نے اپنی ماں کو پہلے سے پابند کیا ہوتا کہ میں گھر داخل ہوتے ہی انہیں دیکھنا چاہتی ہوں اور پڑھائی کے تمام برسوں یہی حال رہا۔

اور یہ بارہ اور چودہ برس کا سن، شعور کے اتنے اعلی درجے پہ کہ ماں باپ، گھر، بہن بھائی، سہلیاں، رشتے دار، خاندان، سکول، محلہ، کسی بھی چیز چھوٹنے کا کوئی غم نہیں۔ ماں سے لپٹنے کی، اپنی ضد منوانے کی، بابا کے ساتھ میلہ جانے کی، بھیا کے ساتھ قلفی کھانے کی، گھر کے آنگن میں کھیلنے کی، رات کو بہن بھائیوں کے ساتھ چھت پہ لیٹ کے تارے گننے کی، کوئی آرزو نہیں، کوئی خواہش نہیں۔ اس ننھی عمر میں مذہب کی اتنی سمجھ کہ سب کچھ قربان۔ اپنے باپ کا لمس، ماں کی آغوش، بہن بھائیوں کا ساتھ سب خداحافظ۔

ازدواجی زندگی ہوتی کیا ہے، کس بھاؤ بکتی ہے، شروع کرنے کے لئے ایک دم تیار۔ بھئی رینااور روینا تم نے تو پیدائشی مسلمان لڑکیوں کو چت کر دیا۔

معلوم نہیں ان مولوی صاحب کی کوئی بیٹی ہے کہ نہیں اور نہ جانے انہوں نے اپنی بیٹی کے لمس کو محسوس کیا ہے کہ نہیں۔ یہ بھی خبر کہ انہیں لڑکیوں کی کم عمری کے اس بھاری فیصلے اور نئی زندگی شروع کرنے کی دشواریوں کا اندازہ بھی ہے کہ نہیں۔ مولوی صاحب کامیابی کے نشے میں اس قدر دھت ہیں اور اسلام کی خدمت کا جذبہ اس قدر ہے کہ وہ ظالم ماں باپ سے ان بچیوں کو بچانے کی اپیل کر رہے ہیں۔

وہی ماں جس نے کوکھ سے جنم دیا ہے اب وہی خالی جھولی کے ساتھ دشمن ٹھہری۔ وہی باپ جس نے اپنے خون پسینے سے سینچ کے اب تک پالا ہے وہی اجڑی آنکھوں کے ساتھ اجنبی ٹھہرا۔ بچیوں نے حق کا راستہ اختیار کیا ہے تو قربانی تو جائز ہے ناماں باپ کی آخر انہوں نے تو جہنم کی آگ ہی بننا تھا۔ تو کیا یہ خوب نہیں کہ مولوی صاحب نے دوناخواندہ اور کھیل کود کی عمر کی بچیوں کو بچا کے جنت کے راستے پہ لگا دیا۔ ویسے معلوم نہیں کہ اتنی چھوٹی عمر کی لڑکیوں کا اپنے ولی کی مرضی کے بغیر اتنے بڑے بڑے فیصلے کرنے کے بارے میں ہمارا مذہب کیا کہتا ہے۔

چلیے منظر بدل دیتے ہیں۔ چشم تصور سے دیکھتی ہوں کہ رینا اور روینا کی جگہ، صفیہ اور زبیدہ ہیں اور مولوی صاحب کی جگہ پادری صاحب اور وہ یہی الفاظ دہرا رہے ہیں کہ یہ مسلمان بچیاں بہت متاثر تھیں اپنے ارد گرد والے مسیحی خاندانوں سے۔ تو اور گیارہ سال کی عمر سے اس راہ پہ چلنے کی مشتاق تھیں۔ اب موقع پاتے ہی چرچ پہنچ گئیں۔ ہم نے ان کا بپتسمہ کیا۔ موقعے پہ موجود، جارج اور جوزف نے اپنی خدمات پیش کیں تو ہم نے دو بول بھی پڑھوا دیے۔ اب بیوقوف ماں باپ شور کر رہے ہیں تو ان کی حفاظت کی جائے۔

کیا کرتے آپ؟

منہ نہ نوچ لیتے پادری کا اور سب کے سب پرُ جم مولوی، حلوے کے زور پہ کراری آوازوں میں پادری کا فتوی قتل دے کے، ریاست سے تقاضا کر رہے ہوتے کہ چرچ کا نام ونشان ہی صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔

اور آخری بات، ہمیں لوگوں کو اسلام کے حلقے میں شامل کرنے کا شوق اس قدر کیوں ہے؟ اگر خالق کائنات کو ہر کسی کو مسلمان بنانا اتنا ہی مرغوب تھا تو "کن فیکون" کہہ کے کیوں نہ پھیر دیے دل، نہ رہتا بانس نہ بجتی بانسری۔ کیوں نہ ساری مخلوق پیدائشی مسلمان بنا دی کہ پھر کسی رینا اور روینا کو اس امتحان سے ہی نہ گزرنا پڑتا۔

کیا ہی اچھا ہوتا کہ مولوی صاحب نے رینا اور روینا کو کہا ہوتا،

"جاؤ بیٹا! پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو، یونیورسٹی جاؤ، میں تمہارے اخراجات پورے کروں گا۔ جب چوبیس پچیس سال کی ہو جاؤ تب آنا، اس موضوع پہ بات کریں گے"

مولوی صاحب کو اتنا انتظار کرنے اور کشٹ اٹھانے کی کیا ضرورت۔ انہوں نے
لوگوں کو مشرف بہ اسلام کرنے کی اپنی گنتی پوری کرنی ہے، میڈل کا حقدار بننا ہے اور جنت کا
ٹکٹ کنفرم کرنا ہے۔

جاہلوں کی دعا... خدا بیٹی کے نصیب اچھے کرے

بچوں کی شادی کیسے اور کیونکر؟ طے کرتے ہوئے کیا دیکھا جائے؟ کیا نظر انداز کیا جائے؟

ہم اور ہمارے دوست اس عمر میں ہیں کہ بچوں کی تعلیم کے مرحلے ختم ہو چکے یا ہونے کو ہیں اور اب ان کے رفیق سفر کے انتخاب کا مرحلہ ہے۔ کچھ دوست اس مقام سے گزر چکے، کچھ ابھی سوچ وبچار کی کیفیت میں ہیں۔ سو ہوتا کچھ یوں ہے کہ جب بھی مل بیٹھتے ہیں یہی ایک موضوع زیر گفتگو ہوتا ہے۔ ایسی ہی ایک محفل میں گرما گرم بحث تھی کہ شریک حیات کیسا ہو؟

اگر داماد چاہیے تو لڑکا سمارٹ اور ہینڈسم ہو، خوش شکل ہو، خاندان اچھا اور مختصر ہو، تعلیم یافتہ ہو، ذات پات مناسب ہو اور پھر ایک آواز آئی

"ارے دفع کرو ان سب باتوں کو، بس کماتا اچھا ہو، کافی ہے"

اور اگر بہو چاہیے تو لڑکی حسین ہو، کم عمر ہو، تعلیم یافتہ ہو، سارے گن جانتی ہو، پڑھے لکھے ماں باپ ہوں، روپے پیسے والے ہوں، لمبا چوڑا خاندان نہ ہو۔ پھر کسی نے لقمہ دیا،

"دیکھ لینا زبان کی لمبی نہ ہو، تمہیں برداشت نہیں کرے گی"

ہم ایک گوشے میں دبکے یہ سب سنتے رہے اور اپنے آپ سے پوچھا کیے،

اس سارے قصے میں کیا کہیں ذہنی مطابقت کا بھی کوئی ذکر ہے؟

بچے کیسا جیون ساتھی چاہتے ہیں؟ اس بارے میں کوئی غور وفکر؟

بچوں کی زندگی گزارنے کی کیا خواہشات ہیں، کوئی سوچ اس بارے میں؟

اپنے بچوں کی شخصیت کا کوئی دھیان اور زندگی ساتھ میں بتانے والے ساتھی کی طبعیت کی ہم آہنگی؟

ہمارے معاشرے میں مشکل یہ ہے کہ لوگ باگ آج کے دور میں بھی ذہن اور اس کی احتیاجات کو اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں۔ زیادہ تر نگاہیں چند ھیا دینے والی چکا چوند پہ مر مٹتے ہیں۔ ہر دو افراد کی ظاہری خصوصیات پہ نظر رکھے ہوئے جانچ پڑتال کی جارہی ہوتی ہے اور وہ خزانہ جو ذات کے نہاں خانوں میں پوشیدہ رہتا ہے، کے متعلق کوئی سوچنا پسند ہی نہیں فرماتا۔

بیشتر دوست آج بھی اس بات پہ یقین رکھتے ہیں کہ اگر دو اجنبی افراد کو زندگی گزارنے کے لئے جوڑ دیا جائے تو گزر ہی جائے گی، بھلے کیسی بھی گزرے۔ اس زنگ آلود زندگی کا مفہوم سمجھنے سے ہم قاصر ہیں۔

پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ کسی بھی جوڑے میں کوئی بھی سو فیصد برا نہیں ہوتا۔ کوئی ایک شیطان نہیں اور دوسرا فرشتہ نہیں ہوتا۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے نہیں بنے ہوتے، ان کا آسمان ایک نہیں ہوتا۔

شادی کے رشتے میں ظالم اور مظلوم ٹھہرنے اور ٹھہرانے کی جو بحث ہے وہ لایعنی ٹھہرتی ہے، اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہمارے معاشرے میں شادی طے کرنے کا نظام انتہائی فرسودہ ہے۔ اس بوسیدہ نظام پہ ہندو معاشرے کی شدید چھاپ بھی پائی جاتی ہے، جہاں دنیاوی لین دین کے بعد دو جسموں کو سات پھیروں میں باندھا جاتا تھا اور جدا ہونے کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ معاشرے میں اسلام کی آمد کے ساتھ پھیرے نکاح میں بدل گئے لیکن شریک حیات کے انتخاب کا طریقہ کار اور ترجیحات وہی رہیں۔

عقل یہ کہتی ہے، دو اجنبی اور مختلف گھرانوں کے پروردہ لوگ تبھی زندگی کا سفر اکھٹے گزار سکتے ہیں جب وہ ایک جیسے خواب دیکھ سکیں، جب آسمانوں کی وسعتوں میں پرواز کی خواہش ایک جیسی ہو، جب دنیا فتح کرنا دونوں کا نصب العین ہو،

جب آرزوؤں کی تتلیاں دونوں طرف دلِ وحشی کو بدمست کرتی ہوں، جب دل باتیں کریں اور ان کہی سمجھی جائے، جب دونوں طرف ساز پہ ایک ہی سر اور ایک ہی تال بجے۔

جان لیجیے اگر ایسا ہو جائے تو کس کی صورت و شکل کیسی ہے؟ کس کے پاس دولت کتنی ہے؟ کس کا خاندان کیا ہے؟ کس کے پاس کیا رتبہ ہے؟ سب بے معنی ہو جاتا ہے۔ زندگی کے طویل، صبر آزما اور کٹھنائیوں سے بھرے سفر میں کون اعلیٰ ہے اور کون ادنیٰ، اس کا خیال کس کو رہتا ہے۔

شادی بچانے اور قائم رکھنے کے لئے روٹی کس نے سینکنی ہے اور زبان کس نے بند رکھنی ہے کا موقع ہی نہیں آپاتا۔ کس نے کس کی خدمت کرنی ہے؟ اور گھر میں آقا کون ہے؟ سب پیچھے رہ جاتا ہے۔ گھر میں مرد بالا دست ہونا چاہئے یا عورت؟ کی احمقانہ بحث دیوانے کی بڑ لگتی ہے۔

ذہنی مطابقت اور ایک دوجے کی عزت اور احساس وہ پھول کھلاتا ہے جو دنیا کے کسی عہدے، دولت، شہرت اور زباں بندی سے نہیں خریدے جا سکتے۔ ایک دوسرے کو جاننے، سمجھنے اور عزت کا عمل گھر کے آنگن میں وہ پھول کھلاتا ہے جن کی خوشبو چاروانگ پھیلتی ہے۔ ماں باپ کی ایک دوجے سے محبت دنیا کو جینئیس لوگوں کا تحفہ دیا کرتی ہے، اعتماد سے عاری بونے نہیں۔

ناخوشی ایک ایسا زہر ہے جو ہولے ہولے رگوں میں سرایت کرتا ہے اور جب جان لبِ دم آ پہنچے تب آنکھ کھلتی ہے اور سرمایہ زندگی کے زیاں کا احساس جاگتا ہے۔

اگر آپ کو ہماری باتیں بھا جائیں اور آپ دنیا کو متاثر کرنے اور سود و زیاں کے اندیشوں سے آزاد ہو سکیں تو خدارا بچوں کو اپنی روحوں کے ساتھی منتخب کرنے میں مدد دیجیے، جسموں کے نہیں۔ یقین جانیے اپنے بچوں کی خوشگوار، کھلکھلاتی زندگی آپ کی زندگی بھی گل و گلزار بنا دے گی۔

امرتا پریتم: ایک صدی تمام ہوئی

میں تینوں فیر ملاں گی
کتھے؟ کس طراں؟ پتہ نئیں
(میں تمھیں پھر ملوں گی، کہاں؟ کیسے؟ پتہ نہیں)
شاید تیرے تخیل دی چھنک بن کے
تیرے کینوس تے اتراں گی
(شاید تمہاری یادوں کا حصہ بن کے تمہارے کینوس پہ اتر آؤں گی)
یا خورے تیرے کینوس تے
اک رہسمئی لکیر بن کے
خاموش تینوں تکدی رہواں گی
(یا پھر ایک خاموش پر اسراریت میں لپٹی تمھیں دیکھتی رہوں گی)
یا خورے سورج دی لو بن کے
تیرے رنگاں وچ گھلاں گی
(یا شاید سورج کی روشنی بن کے تمہارے رنگوں میں گھل جاؤں گی)
یا رنگاں دیاں بانہواں وچ بہ کے
تیرے کینوس نوں ولاں گی
(یا شاید رنگوں کے ساتھ تمہارے کینوس کا طواف کروں گی)
پتہ نئیں کس طرح؟ کتھے؟
پر تینوں ضرور ملاں گی

(یہ معلوم نہیں کس طرح اور کیسے، لیکن یہ یقین ہے کہ میں تمہیں ضرور ملوں گی)

گوجرانوالہ، پہلوانوں کا شہر!

لیکن ہماری انسیت کی وجہ یہ ٹھہری کہ ہمارے ابا نے گوجرانوالہ میں جنم لیا اور پرورش پائی۔ ابا جب بھی اپنے شہر کا ذکر کرتے، ان کی آنکھوں میں کوندا چمک جاتا۔ غم روزگار کی وجہ سے عمر پنڈی میں بتائی، لیکن واپس جانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ گنواتے حتی کہ وصیت میں بھی گوجرانوالہ دفن ہونے کی خواہش کی۔

ہمیں گوجرانوالہ سے یا تو بچپن میں پالا پڑا جب گرمیوں کی چھٹیوں میں آبائی گھر جاتے۔ لیکن اس دور کی یادیں مبہم ہیں۔ ہماری دوسری یاد کینٹ میں رہنے کی ٹھہری جب صاحب کی گوجرانوالہ میں پوسٹنگ ہوئی۔ اس قیام میں ہمارے چھوٹے دونوں بچوں کی پیدائش ہوئی اور صفحہ دل یادوں سے بھرتا چلا گیا۔

یہ سب تو انسیت کے قصے ٹھہرے، لیکن ہمیں گوجرانوالہ سے محبت ہوگئی جب معلوم ہوا کہ بیسویں صدی کی خوبصورت الفاظ کی مالک خوبصورت شاعرہ کا جنم دیس بھی گوجرانوالہ ہے۔

"اج آکھاں وارث شاہ نوں" لکھ کے امر ہو جانے والی، امرتا پریتم!

اور آج امرتا پریتم کا جنم دن ہے، سوواں جنم دن! (اکتیس اگست انیس سو انیس)

پنجابی معاشرے میں پیدا ہو کے اپنی آواز اور اپنے جذبات کو چھپانے کی بجائے الفاظ کا روپ پہنانے والی بہادر عورت!

امرتا کور کا بچپن گوجرانوالہ میں گزرا۔ چھوٹی عمر میں ماں کی وفات نے زندگی پہ گہرا اثر ڈالا۔ امرتا کے ابا بھی شاعر تھے اور شاید اسی رنگ کے تحت امرتا نے اپنی تنہائی کا حل شاعری میں ڈھونڈا۔ سولہ سال کی عمر میں پہلا پنجابی مجموعہ "امرت لہراں" چھپا اور اسی سال زندگی نے شادی کی صورت میں ایک اور موڑ لیا۔ وہ شادی کے بعد امرتا پریتم کہلائیں۔ امرتا لکھاری ہونے کا جو سفر شروع کر چکی تھیں وہ اس پہ گامزن رہیں۔

امرتا نے رومانوی شاعری سے نام کمایا لیکن حساس دل ہونے کی وجہ سے معاشرے کے رستے زخموں سے بے خبر نہیں رہ سکیں۔ انیس سو تینتالیس میں بنگال میں ہونے والا خونی قحط ان کی آنکھ سے لہو بن کے ٹپکا اور صفحات رنگین کر گیا۔ اور پھر سینتالیس کے فسادات نے نہ صرف جنم دیس چھوڑنے پہ مجبور کیا بلکہ لکیر کے دونوں طرف دس لاکھ بے گناہوں کے خون نے دل کی حالت ہی بدل دی اور وہ چیخ اٹھیں،

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتوں قبراں وچوں بول

تے اج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقہ پھول

(آج وارث شاہ سے پوچھتی ہوں کہ وہ قبر میں خاموش کیوں ہے۔ عشق کی داستان سے آگے کی کہانی کیوں نہیں لکھ رہا)

اک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وین

اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن

(پنجاب کی ایک بیٹی کے رونے پہ تو نے اتنے بین کئے تھے اور آج لاکھوں بیٹیاں رو رہی ہیں)

اٹھ دردمنداں دیا دردیا تک اپنا دیس پنجاب

اج بیلے لاشاں وچھیاں تے لہو دی بھری چناب

(اٹھو اور اپنا دیس پنجاب دیکھو، جہاں چناب لہو بھرا ہے)

کسے نے پنجاں پانیاں وچ اج دتی زہر رلا

تے اوہناں پانیاں نوں دتا دھرت نوں لا

(کسی نے پانی میں زہر ملا دیا ہے اور دھرتی زہر ملے پانی سے سیراب ہو رہی ہے)

امرتا کی تخلیق میں محبت رچی بسی تھی سو دھرتی سے بھی کی اور اپنے خوابوں سے بھی۔ امرتا اور ساحر لدھیانوی کی محبت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، دونوں شاعروں نے اپنے اپنے دل کا حال سیاہ و سفید میں کھول کے رکھ دیا۔ دونوں ریل کی دو پٹڑیوں کی طرح ساتھ ساتھ چلے لیکن ایک نہ ہو سکے۔ شاید محبت کی ہر داستان کا انجام یہی ہوا کرتا ہے۔

امرتا کے لفظ، لفظ نہیں ہیں، درد بھرے نوحے ہیں جو جگر چیر دیتے ہیں۔ یہ وہ سسکیاں ہیں جو اندھیری تنہا راتوں نے سنی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی جاں بلب پیاس کی شدت سے تڑپ رہا ہے۔ پانی کا پیالہ پاس ہے لیکن لبوں میں جان نہیں۔

"تیرا ملنا ایسا ہوتا ہے جیسے کوئی ہتھیلی پہ ایک وقت کی روٹی رکھ دے"

"میں نے اپنی زندگی کی کڑواہٹ پی لی کیونکہ اس میں تمہارے عشق کی ایک بوند ملی تھی"

"چنگا ہویا توں پرائی ہو گئیوں، مک گئی چنتا تینوں اپنان دی"

(اچھا ہوا، تم غیر کی ہو گئیں، تمہیں اپنانے کی فکر سے جان چھوٹی)

"اک درد تھا جو سگریٹ کی طرح میں نے چپ چاپ پیا ہے صرف کچھ نظمیں تھیں جو سگریٹ سے میں نے راکھ کی طرح جھاڑی ہیں"

امرتا نے شاعری اور نثر میں تقریباً سو کتابیں لکھیں، دونوں ملکوں میں بے تحاشا عزت کمائی۔ انڈیا میں بہت ایوارڈ پائے لیکن لاشعوری طور پہ انتظار کیا کہ شاید جنم دیس والے بھی یاد کریں۔ وہ عمر کے آخری حصے میں تھیں، جب پنجابی اکیڈمی نے انہیں ایوارڈ دینے کا اعلان کیا اور وہ بے ساختہ کہہ اٹھیں

"بڑے دنوں بعد میرے میکے کو میری یاد آئی"

اور آج ہمیں امرتا سے یہ کہنا ہے کہ آپ کے جنم دیس کی ہوائیں آج بھی آپ کو یاد کرتی ہیں۔ وہ بے رونق دن، وہ اداس لمحے، وہ دکھ بھرا وقت، وہ ڈھلتی شام، سب آج بھی وہیں کھڑے ہیں، جب آپ ان میں جیتی تھیں اور اداس آنکھوں سے تنہائی بھری راتوں میں خواب بنتی تھیں۔

وہ مٹی آپ کو نہیں بھولی!

سالگرہ مبارک، امرتا پریتم!

حریم شاہ کے پہلو میں مفتی قوی۔۔۔ خدا خیر کرے

کبھی جانا آپ نے، کیسے کوئی بنتا ہے اسفل السافلین!

آنکھ سے لہو رستا ہے، دل ہے کہ تھم تھم کے چلتا ہے۔ ہم نے ایک مرد کی ہرزہ سرائی سنی اور دیکھی ہے، جھوٹی انا، غرور اور اپنے آپ کو ہر جزا اور سزا سے مبرا سمجھنے والے مرد کے الفاظ نے کانوں میں سیسہ انڈیل دیا ہے۔

کیا کوئی قوت بصارت رکھنے والا اس قدر اس قدر نادان ہو سکتا ہے کہ اسے اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہ آئے؟ یہ کس طرح کا مولوی ہے جو سر عام فلرٹ اور معنی خیز باتیں کرتا ہے؟ یہ کیسا بے حس ہے جس کے کردار پہ پچھلے دھبے دھلے نہیں اور یہ پھر نکل کھڑا ہوا اپنا جھوٹا وعظ لے کر؟ کس طرح کی حیا کی تلقین کرتا ہے جو صرف عورت کے گرد گھیرا تنگ کرتی ہے؟

موصوف نہی عن المنکر، امر بالمعروف کی چلتی پھرتی تصویر بنے پہلے ایک جہنمی عورت کو کیفر کردار تک پہنچا چکے، کوئی مائی کا لال، بال تک بیکا نہ کر سکا۔ اب اگلے شکار کی تیاری پہ کمر کس کے پیغام بھیجا جا چکا کہ تم ان راہوں پہ چل کے معاشرے کے جن اشراف کا اصل چہرہ دکھانے چلی ہو، وہ ناگوار خاطر تو ہے لیکن پھر بھی میں آگاہ ہوں کہ تمہارے دل میں کلمۂ طیبہ رچا بسا ہوا ہے۔

"بس ذرا آ کے اک ملاقات تو کر لو"

یہ ہیں مفتی قوی المعروف قندیل بلوچ فیم جن کا حالیہ وڈیو کلپ زبان زد عام ہے۔ موصوف دست شفقت حریم شاہ کے سر پہ رکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں، گویا حریم شاہ کو بھی موت کا ٹکٹ الاٹ کر کے، بخشش کی نوید سنا کے، جنت کی حور بنانے کا ارادہ ہے۔

اب کے بھی موصوف کا طریقہ واردات بھی وہی ہے اور انداز بھی۔ چونکہ قندیل بلوچ کو ٹوپی پہنانے کے بعد ملنے والی شہرت سے دستار اچھل گئی تھی، سو اس دفعہ جگ ہنسائی سے بچنے کے لئے سوچ کی پرواز ذرا مختلف رنگ لئے ہوئے ہے۔ گرگ باراں دیدہ کے ناخواندہ مرید قندیل بلوچ کی ٹوپی پہنے ماڈرن انداز کی سیلفی سے برافروختہ ہوئے تھے سو ان کے جذبہ ایمانی کی تسکین کے لئے حریم شاہ کو دوپٹہ پہنا کے سیلفی بنوانے کا ارادہ کیا گیا ہے۔

وڈیو کلپ میں موصوف نوجوان کمپیر سے اٹھکیلیاں کرتے نظر آتے ہیں اور کسی جملے میں لفظ چاند کہہ کے خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ افسوس ہمیں کمپیرنگ کی سعادت حاصل نہ ہو سکی ورنہ سیدھے سبھاؤ پوچھ ہی لیتے کہ درون خانہ بھاری چلمن کی اوٹ میں کتنے چاند ان کے سائے میں پل رہے ہیں اور کیا ان سے بات کرتے ہوئے بھی زبان و بیان میں شیرینی اور حلاوت اسی طرح گھلتی ہے؟

موصوف بڑی ڈھٹائی سے اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ شیخ رشید ذرا ڈرپوک ہیں، سو جلدی دل چھوڑ چھاڑ کے خانہ خدا کی زیارت کو نکل جاتے ہیں۔ البتہ مفتی صاحب اپنے آپ کو ان وارداتوں کا گھاگ، ماہر فن سمجھتے ہیں سو وہ کھل کھیلنے کے شوقین بھی ہیں، عادی بھی اور بے خوف بھی۔

مفتی صاحب، مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا کے مصداق اپنی عمر اٹھائیس برس پہ ٹھہرانا پسند فرماتے ہیں۔ ان کی قیمتی رائے میں اس عمر کا مرد بہت تجربہ کار ہو چکا ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں شکاری چارہ ڈالنے اور گھیرا تنگ کرنے میں کماحقہ کمال حاصل کر لیتا ہے۔ شکار کو کتنی ڈھیل دینی ہے؟ کب پھندا کس لینا ہے؟ کس کے ہاتھ میں پھندا دے کے بلا شیری دینی ہے؟ یہ سب ترکیبیں ازبر ہو جاتی ہیں۔

مفتی قوی کا گناہ گار عورتوں کو اپنے حلقہ ارادت میں شامل کرنے کا شوق عروج پہ نظر آتا ہے۔ کوئی اچنبھے کی بات نہیں، ہمارے معاشرے کے مردوں کی اکثریت اسی

مالیخولیا میں مبتلا ہے۔ مذہب کا چولا اوڑھ کے تلقین شاہ بننے کا شوقین، سوشل میڈیا میں ہمہ وقت رہنے کی فکر، گزری جوانی کو روکنے کے حربے، تو عمر اور ناپختہ خواتین کی طرف دیکھ کے معنی خیز جملے، آنکھ میں بوالہوسی، اور پھر یہ سمجھنا کہ مجھے ہے حکم اذاں!

ہمارے ہاں کا مرد اپنی رنگین جوانی بتا کے، خدا کے ہاں حاضری سے پہلے اپنے نامہ اعمال میں بھٹکی ہوئی عورت کو رہ راست پہ لانے کا لاحقہ سجانا فرض منصبی سمجھتا ہے۔ عورت کو ہمہ وقت شیر کی آنکھ سے دیکھنا جیسے بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ ایک چرواہا مسلسل قطار سے نکلنے والیوں کو چھڑی سے ہنکاتا پھرتا ہے۔ گلے سے منہ موڑنے والیوں کو نہ صرف چھمک کا حقدار سمجھا جاتا ہے بلکہ مقتل گاہ میں قربانی بھی جائز قرار دی جاتی ہے۔

منافقت کی حد دیکھیے کہ یہ وہی مرد ہے جس کی نظر میں وہ خود اسلام، اخلاق اور تمام معاشرتی حدود وقیود سے بالاتر ہے۔ سو تبلیغ اپنی جگہ مگر یہ ماننے میں تامل نہیں کہ وجود زن کا ساتھ چاہیے سو دن عید اور رات شب برات بنانے کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ وہ عورت کی ہمراہی کی تمنا تو رکھتا ہے لیکن کھڑکیوں پہ دبیز پردے کی تہیں بھی چاہتا ہے تاکہ جھوٹی پارسائی کا پردہ چاک نہ ہو، مصنوعی بھرم نہ ٹوٹے، پگڑی اونچی رہے۔

ہمیں ہنسی آتی ہے ان سب کی سادہ لوحی دیکھ کے، آئینوں کے شہر میں، جس حمام میں سب ایک جیسے ہیں، وہاں آرزو ہے کہ پس پردہ ناز و انداز کا کاروبار چلے۔

ہمیں نہ ہی قندیل بلوچ سے کچھ لینا دینا تھا اور نہ ہی ہم حریم شاہ کے مداحوں میں شامل ہیں۔ ہماری آرزو تو صرف اتنی ہے کہ گدھ بننے والے مردوں سے یہ عرضی گزاری جائے کہ کبھی تو، کہیں تو منہ سے گرتی ہوئی رال اور آنکھ سے ٹپکتی ہوئی ہوس پہ کچھ بند باندھنے کا خیال کیا جائے۔

دوسروں کو دوزخ کی آگ سے ڈرانے والے کیا امیدیں باندھے کھڑے ہیں آخر؟

سیدہ زینب سلام اللہ علیہا سے سیکھنے کی ضرورت

طویل بازار، کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔

قدیم زمانہ، بازار کے دونوں طرف شائقین کا ہجوم، آس پاس والی چھتیں مرد وزن سے کھچا کھچ بھری، تماشا دیکھنے کا شوق، اور بازار کے بیچوں بیچ اونٹوں کا قافلہ!

اونٹوں کی قطار بغیر کسی محمل اور پالکی کے، ننگی پشت پر سوار بچے اور عورتیں!

سالار قافلہ! اپنے اونٹ پہ تن کے بیٹھی ہوئی ایک عورت!

مقامی رواج کے برعکس ننگے سر، دونوں ہاتھ بندھے ہوئے، منہ پہ متانت، آنکھوں میں اطمینان، پشت تنی ہوئی!

لوگوں کا شور کہ الاماں!

کسی کے ہاتھ میں پتھر، کسی کے ہاتھ میں کنکر، ہر ہاتھ اٹھنے کو تیار!

شنید تھی کہ ریاست کے خلاف آواز اٹھی ہے، زبان کاٹ دی گئی ہے، سر قلم ہو چکا۔ اب اہل خانہ ہیں جنہیں بادشاہ وقت نے مشکیں کس کے، برہنہ سر، اونٹ کی ننگی پشت پہ سوار کرا کے ایک لمبے سفر کے بعد اپنے حضور بلوایا ہے۔

عوام کو یہ جاننے کی خواہش تھی کہ وہ کون لوگ تھے جو بغاوت کے جرم میں قتل کر دیئے گئے تھے اور کیا وہ باغی یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے بعد بچ جانے والے کمزوروں کا حاکم وقت کیا حال کیا کرتا ہے۔

اور آج سب جمع تھے تماشائی بنے اور باغیوں کا ٹھٹھا اڑانے کہ ریاست سے وفاداری کا یہی تقاضا ہوا کرتا ہے۔

لیکن ایک بات سب کو حیران کیے دیتی تھی۔ سب قیدی یا عورتیں تھیں یا بچے، سوائے ایک جوان کے جو مضمحل اور بیمار نظر آتا تھا۔

سب عورتیں گو کہ وقت اور زمانے کے لحاظ سے بے حرمتی کے عالم میں تھیں کہ لباس ناکافی تھا پر سب کی سب اپنے اونٹ پہ تن کے بیٹھی تھیں۔ سر اونچے تھے چہرے پہ کچھ کھو جانے کا ملال تو تھا لیکن ایک مطمئن کیفیت بھی تھی۔

یہ ایک انوکھا جلوس تھا جس میں عورتوں کو وقت کے زبردستوں نے تماشا بنایا تھا۔

بازار اور تماشائیوں نے حسب حثیت تضحیک کی لیکن ان عورتوں کے چہرے کے تاثرات نہ بدلے۔ عزم و استقلال میں کوئی کمی نہ آئی اور اب وقت تھا حاکم کے حضور، کھڑے ہونے کا!

عالیشان دربار، مغرور اور رعونت زدہ حکمران، مودب درباری اور زنجیروں میں جکڑی قیدی عورتیں!

دربار ہو، اختیار ہو، طاقت ہو اور جی حضوری کا مجمع ہو اور قیدی!

پر ان قیدیوں کی سالار، نہ سر جھکائے، نہ آنکھ جھکائے، گردن تان کے کھڑی ہو، انداز میں چیلنج ہو اور ہو عورت!

برداشت نہیں ہو سکتا بھئی!

"کون ہے یہ مغرور عورت" بادشاہ کی آواز بلند ہوئی

"ان سے کیا پوچھتے ہو؟ مجھ سے پوچھو میں کون ہوں" عورت کی رعب آمیز آواز آئی

دربار چونک گیا، درباری سیدھے ہو بیٹھے۔ مکروفریب اور ظلم کی دنیا، جہاں آنکھ کی جنبش پہ بڑے سے بڑے سورما کا سر اتر جاتا ہے وہاں ایک جنگ کے نتیجے میں سب مردوں کے قتل کیے جانے کے بعد قیدی ہو کے آنے والی ادھیڑ عمر عورت اور یہ جرات رندانہ!

عورت بات کرتی ہے

"اے یزید اگر چہ حادثات زمانہ نے ہمیں اس موڑ پر لا کھڑا کیا ہے اور مجھے قیدی بنایا گیا ہے لیکن جان لے میرے نزدیک تیری طاقت کچھ بھی نہیں ہے۔ خدا کی قسم، خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتی اس کے سوا کسی اور سے گلہ و شکوہ بھی نہیں کروں گی۔ اے یزید مکر و حیلے کے ذریعہ تو ہم لوگوں سے جتنی دشمنی کر سکتا ہے کر لے۔ ہم اہل بیت پیغمبر (ص) سے دشمنی کے لیے تو جتنی بھی سازشیں کر سکتا ہے کر لے لیکن خدا کی قسم تو ہمارے نام کو لوگوں کے دل و ذہن اور تاریخ سے نہیں مٹا سکتا اور چراغ وحی کو نہیں بجھا سکتا تو ہماری حیات اور ہمارے افتخارات کو نہیں مٹا سکتا اور اسی طرح تو اپنے دامن پر لگے ننگ و عار کے بدنما داغ کو بھی نہیں دھو سکتا، خدا کی نفرین و لعنت ہو ظالموں اور ستمگروں پر۔"

یہ ہے اسلام کی تاریخ کی پہلی جی دار، دلیر، بادشاہ وقت کے سامنے ننگے سر تن کے کھڑے ہونے والی عورت، حق اور سچ کی خاطر نہ جھکنے والی عورت، انتہائی بلند کردار عورت!

شہر اور گھر کا آرام چھوڑ کے میدان جنگ میں اترنے والی، بھائی کی اذیت محسوس کرنے والی، اپنے دو بیٹوں کے سر کٹتے دیکھنے والی، سب مردوں کے قتل ہو جانے کے بعد سب عورتوں اور بچوں کو خیموں کی آگ سے بچانے والی۔

قیدی بھی بنی، تشدد بھی سہا، سفر کی صعوبتیں بھی برداشت کیں، حاکم دربار کے سامنے پہروں کھڑی رہی لیکن رہتی دنیا تک ایک سبق سکھا دیا کہ حق اور سچ کی قیمت چکانی پڑ تی ہے چاہے آپ کا تعلق خانوادہ رسول سے کیوں نہ ہو.

یہ تھیں سیدہ زینب، فاطمہ کی بیٹی اور ہمارے رسول کی نواسی، وہی رسول جن کے نام پہ ہماری آنکھیں آبدیدہ ہو جاتی ہیں لیکن ان کے خانوادے کے افراد کے ذکر سے آنکھیں چرا لیتے ہیں کہ ہمارے پاس بہت سے سوالوں کے جواب نہیں۔

آج معاشرے میں عورت کا جو مقام ہے اور جس کو اسلام پسند صحیح قرار دے کے مسلط رکھنا چاہتے ہیں، سیدہ زینب کا کردار اس سے میل نہیں کھاتا۔

آج چودہ سو سال بعد عورت کو تجویز کیا جاتا ہے وہ گھر کی زینت ہے، اس کی تخلیق کا مقصد فقط آبادی بڑھانا اور خاندان کو جوڑنا ہے۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ گھر سے باہر کے

معاملات میں اس کا کوئی حصہ نہیں، اس کو آواز بلند کرنے کا کوئی حق نہیں، اس کے کردار کی طاقت پہ کسی کو یقین نہیں۔

ملک، قوم، آئیڈیالوجی، کردار سازی، کسی بھی ہاری ہوئی جنگ کے بعد اپنے موقف پہ قائم رہنا، اپنے حق کے لئے لڑنا، دوسروں کے حق کے حصول میں ان کے ساتھ چلنا، سچ کی صلیب اٹھانا چاہے ہاتھ کٹ جائیں، یہ آج کی عورت کو نہ سکھایا جاتا ہے، نہ سمجھایا اور نہ ہی بتایا جاتا ہے اور اگر کوئی نادان پھر بھی سر پہ کفن باندھ لے تو اس کے گوش گزار کیا جاتا ہے کہ کیوں کانٹوں بھرے رستوں کا انتخاب کیا ہے، یہ کس دلدل پہ چل رہی ہو، زبان کی قیمت لو اور ہونٹ سی لو۔

آج کی عورت کو سیدہ زینب کے کردار سے متعارف کروانا، جو کلمہ حق کے لئے نہ جھکے نہ بکے، کس قدر اہم ہے یہ وہی لوگ جانیں گے جو اس راہ کے مسافر ہیں۔ عورت کسی بھی معاشرے قوم اور آنے والی نسلوں کا کلیدی کردار ہوتی ہے، یہ صرف نظریاتی لوگ جانتے ہیں جو معاشرے میں ریڑھ کی ہڈی بھی ہوتے ہیں۔

جب ہر طرف قانون کی بے بسی ہو، جبر کے پنجے ہر طرف گڑے ہوں اور سچائی کا علم بلند کرنا ہو تو تاریخ کی مد دلے کے آہنی اعصاب والی عورتوں کو اپنا آئیڈیل ماننا اور ان کے نقش قدم پہ چلنا تربیت کا وہ حصہ ہے جسے آج کی ہر عورت کو سیکھنا ہے اور اپنی بیٹی کو سکھانا ہے۔

اگر عورت معاشرے کی آنکھ میں آنکھ نہیں ڈال سکتی، اگر اپنی عزت روندنے والوں کا منہ نہیں نوچ سکتی، انصاف کے لیے عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹا سکتی، سب کچھ لٹانے کے بعد بھی اونچی آواز میں نہیں بول سکتی تو پھر وہی ہو گا جو ہو رہا ہے۔

تاریخ کے اوراق میں صدیوں کے سفر کا سب حال رہ جاتا ہے اور تاریخ کا فیصلہ بھی سامنے آجاتا ہے کہ ایک وقت کے ہارے ہوئے اصل میں ہیرو تھے اور وقتی جیت والے تاریخ کے تاریک کردار تھے۔

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے، وقت کا پہیہ بار بار وہی کردار سامنے لاتا ہے سو ضرورت صرف سبق سیکھنے کی ہے عورت کے لئے، کہ اسی میں عظمت ہے۔

اور اگر واقعہ کچھ یوں ہے کہ پر توکٹ ہی چکے ہیں، لیکن اٹھنے اور اڑنے کی تمنا بھی نہیں تو خواتین، چلئے آپ کپڑوں کی نمائش میں جایئے، قیدی جسم کی تزئین کا اہتمام کیجیے اور ہم صبر کے گھونٹ پیتے ہیں کہ سقراط والا زہر کا پیالہ نہ میسر ہے اور نہ ہی ہمت!

(راولپنڈی کی اس مظلوم خاتون کے نام جس نے پہلے پولیس اہل کاروں پر درندگی کا الزام لگایا اور پھر نامعلوم وجوہ کی بنا پر عدالت سے اپنا بیان واپس لینے کی درخواست کی۔)

ایک عورت کی گھونگھٹ کی اوٹ سے نصیحتیں!

میں بہت اداس ہوں!

غم، رنج اور دل گرفتگی کے پنجے گاڑے اداسی روح میں سرایت کر رہی ہے!

اور ہمیں تامل ہے یقین کرنے میں کہ یہ لولوئے گلفام ہماری ہی ہم صنف کے زریں خیالات ہیں۔ پھر اقبال یاد آتے ہیں۔ اگرچہ مسز خان جیسی روایت میں گڑی بلکہ دیوار میں چنی ہوئی مستورہ کے لئے شوہر کی اجازت کے بغیر ایک نامحرم کا شعر پڑھنے یا سننے میں تامل ہو سکتا ہے لیکن شاید یہ سوچ کر باب الجیل کا کوئی در وا ہو کہ اقبال کچھ نہیں تو مسز خان اور ان کے شوہر نامدار کے والدین کی نسل کے بھی باوا جان ہی ٹھہریں گے۔ اقبال نے ضرب کلیم میں خواجگی کا مآل بیان کرتے ہوئے لکھا تھا

خواجگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی

پختہ ہو جاتے ہیں جب خوئے غلامی میں غلام

ہم جب بھی صنف مخالف کا لکھا ہوا پڑھتے ہیں تو یا ہنسی آتی ہے یا غصہ کہ بونے آدمیوں نے پھر قد بلند کرنے کی کوشش کی ایک عورت کو پاؤں میں مسل کے!

لیکن مسز خان پہ نہ ہنسی آئی اور نہ ہی غصہ! رنج ضرور ہوا، بے انتہا اور بے حساب!

میڈیا پہ بیٹھ کے چیختی آواز میں نصیحتیں کرنا بہت آسان ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو دیکھنا اور ان کے لئے آواز اٹھانا صرف احساس اور درد مند لوگوں کا خاصہ ہے اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ مسز خان نے زندگی کو اپنے چھپر کھٹ کی اوٹ سے دیکھا ہے، گھونگھٹ کے پلو سے جھانکا ہے، انہیں جنوبی ایشیا میں بسنے والی عورت کی اس زندگی کا براہ راست تجربہ نہیں

جس میں عورت صرف چکی کے دو پاٹوں میں نہیں پستی بلکہ سل پر رگڑ کھاتے بٹے تلے مسلسل مسلی بھی جاتی ہے۔

طب کے پیشے میں اپنے روبرو عورت کی کہانیاں سنتے برسوں بیت گئے۔ اس ریاضت میں دل بارہا پاؤں تلے آیا اور روح زخم زخم ہوئی۔ تب کہیں جاکر اپنی آواز تحریر کے ذریعے معصوم پریوں، نازک احساسات رکھنے والی لڑکیوں تک پہنچانے کی مشق شروع کی ہے، انہیں زنداں کے باہر کی دنیا دکھانے کی کوشش کی ہے، انہیں بتایا ہے وہ بغیر کسی سہارے کے پرواز کر سکتی ہیں۔

معلوم ہے مسز خان! مجھے کتنے پیغام ملتے ہیں دن میں؟ کتنی بچیاں بن دیکھے بیٹی کا رشتہ قائم کر چکی ہیں؟ میں ان کی آنکھوں میں خواب جگاتی ہوں، انہوں زندہ رہنے کی امنگ سکھاتی ہوں، انہیں کس لئے مالک نے زندگی کا تحفہ دیا ہے، یہ سمجھاتی ہوں۔ رنگوں، خوشبوؤں اور آرزوؤں پہ عورت کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کسی مرد کا۔

آپ نے اپنی زبان کے ایک ہی وار سے کتنی کلیاں روند ڈالیں، لہجے کی تیز دھار سے ارمانوں کے قتلے کر دیے، اور اپنی رعونت بھری انکھوں سے برستے شعلوں میں کیا کچھ راکھ کر دیا، اور آپ نے یہ سب اپنی یعنی عورت کی زبان سے کیا، اسی زبان سے جو آپ چاہتی ہیں کہ یہ معصوم لڑکیاں بند رکھیں۔

مولا علی نے فرمایا تھا ہر آنے والی نسل کا وقت مختلف ہو گا، اس لئے اسے اس زمانے کے مطابق زندگی بسر کرنا سکھاؤ۔

اکیسویں صدی میں کیا برصغیر کا صدیوں پرانا قانون دہرایا جا رہا ہے، جس کے مطابق شوہر نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اگر مر جائے تو یا اس کی چتا میں زندہ جل مرو، اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو زندگی کے رنگوں، خوشیوں، ارمانوں، خواہشات کی تتلیوں پہ عورت کا حصہ اور حق ختم۔

ہم نے اپنے ارد گرد بہت سے ایسی زندہ لاشیں دیکھی ہیں۔

اور صدیوں پیچھے چلے جائیں، عرب کے ان وقتوں میں، جب ننھی بچی کی آواز برداشت سے بھی باہر تھی، تب بھی اس آواز کو زندہ منوں مٹی تلے گاڑا جاتا تھا۔ زندہ دفن ہونا، سوچتے ہی جسم پہ منوں مٹی پڑی محسوس ہوتی ہے!

بٹی کا معصوم گلبدن، سانس لیتا ہوا جسم، روشنی دیکھتی آنکھیں، آواز سنتے کان، سب مٹی سے بھر دیے جاتے تھے، موت اس جسم پہ آہستہ آہستہ اترتی تھی اور گڑھا پاٹ دیا جاتا تھا۔ کیا کبھی کسی نے سوچا رگ جاں سے زندگی کیسے پھسلتی ہو گی؟

وقت بہت بدل چکا ہے۔ یا شاید مسز خان آپ جیسے لوگوں کے لئے نہیں بدلا، بالکل بھی نہیں بدلا!

مسز خان شاید ان زمانوں میں سانس لیتی ہیں جب عورت باندی کے روپ میں بازار میں بکنے والی جنس تھی۔ خوب چھان پھٹک کے یہ لونڈی گھر لائی جاتی تھی۔ دن میں گھریلو خدمت اور رات میں جنسی لذت، اور شرط ایک ہی تھی، زبان نہیں کھولنا۔ مالک سے وفاداری شرط ہے، اس کے بدلے میں دو وقت کی روٹی، تن ڈھانپنے کو لباس اور سر چھپانے کے لئے چھت۔

یہی ہے نا آج کے دور میں اس خرید و فروخت کا دوسرا نام... شادی! جس میں مالک محبت، عزت، احساس، درد غرض کہ ہر پہلو سے بری الزمہ! شادی قائم رکھنا صرف لونڈی نما عورت کا کام ہے زبان بندی کے ساتھ۔ اس حکم میں انحراف کی گنجائش نہیں، اور اگر ایسی کوشش کی تو یا چولہا پھٹ جائے گا، یا بچے چھین کے سڑک پہ کھڑا کر دیا جائے گا، یا جسم پر نیل اور روح پر خراشیں ہوں گی جو یاد دلائیں گی کہ مالک کیا چاہتا ہے؟ گرم روٹی، بند زبان، وحشت، ہوس اور شہوت کو ٹھنڈا کرنے کی ایک مشین۔

مسز خان! آپ آخر اتنی برہم کیوں ہیں، آپ کو بٹی کی زبان سے خوف کیوں آتا ہے؟ معافی چاہتی ہوں، مجھے ایک لحظے کے لئے ایسا لگا کہ آپ شاید بٹی جیسی نعمت سے محروم ہیں ورنہ یوں اپنی بٹی برابر بچیوں کو مرد کی نظر سے کیوں دیکھتیں؟

آیئے! میں بتاؤں کہ آپ طاقت کے اس کھیل میں کس کی آلہ کار ہیں اور کیسے اس میں شامل ہوئی ہیں۔

مردانہ بالادستی کا نظام صدیوں اور زمانوں سے رائج ہے اور اس نظام کو چلانے والے مردوں کو بھی مددگاروں، کارندوں اور سٹھیائی ہوئی نائیکاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو عورت اس بھیڑ واگیری میں شامل ہونے کی بجائے اپنے قدموں پر کھڑی ہو کے اور آنکھ میں آنکھ ڈال کے اپنے حق کی بات کرے، وہ راندہ درگاہ ٹھہرتی ہے اور طاقت کے اس کھیل میں ہمیشہ کے لیے معتوب ٹھہرتی ہے۔

طاقت حاصل کرنے کا آسان نسخہ یہ ہے کہ آپ اپنی ہی جنس سے منہ پھیر کے، اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ کے طاقتور کے ساتھ کھڑے ہو جائیں۔ آپ کو ہر طرف سے شاباش ملے گی، مقام بھی بلند ہو گا، داد کے ڈونگرے برسائے جائیں گی آپ کی حمیت کی لوتھ پر، تالیاں پیٹی جائیں گی اور آپ کی طاقت حاصل کرنے کی وہ بھوک مٹے گی جو آپ کو اپنے زمانے میں نصیب نہیں ہوئی۔

کیا ہوا اگر کچھ اور چڑیا جیسی لڑکیاں زخمی ہوں گی۔

کیا ہوا اگر کچھ اور تتلیوں کے پر کاٹے جائیں گے۔

کیا ہوا اگر روزن دیوار سے آنے والا تازہ ہوا کا جھونکا اور روشنی روک دی جائے گی۔

کیا ہوا اگر کچھ اور کنیزیں دیوار میں چنوائی جائیں گی۔

کیا ہوا اگر بے جان مجسمے جیسی زندگی گزارنی پڑے گی۔

کیا ہوا اگر وقت سے پہلے ہی لڑکیاں ستی ہو جائیں گی۔

کیا ہوا اگر مردہ دل روحیں معاشرے کا حصہ بنیں گی جن کے بطن سے مزید لونڈیاں جنم لیں گی۔

مبارک ہو مسز خان، طاقتور گروہ میں شامل ہونے پہ مبارک! اور عورت کو ایک بے روح گوشت کے ٹکڑے کا درجہ تفویض کرنے پہ صد ہزار تبریک!

رانی لونا کی محبت گہری تھی یا پورن بھگت کا کنواں؟

لونا، سیالکوٹ کے راجہ کی ملکہ، تاریخ کے اوراق میں ایک ظالم عورت!
مگر کیا تاریخ سچ بولتی ہے!
تاریخ لکھنے والے تو بادشاہ وقت کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور وہ لکھتے ہیں جو انہیں زیرِ لب بتایا اور سمجھایا جاتا ہے۔
لونا کہتی ہے

ایرا
توں وی سچ سنایا
توں وی لوناں دے زخماں تے
متاں دا بس لون ہے لایا
دھرمی بابل پاپ کمایا
لڑ لایا تیرے پھل کمایا
جس دا اچھراں روپ ہنڈایا
(پگلی! میرے زخموں پہ اپنی نصیحتوں کا نمک نہ چھڑک، پاپ تو میرے باپ نے کیا ہے ایک ایسے مرد سے بیاہ کے جس کی جوانی اچھراں کے ساتھ بسر ہو چکی تھی)
میں پورن دی ماں
میں پورن دے ہان دی
میں اس توں اک چمن وڈی

پر میں کیکن ماں اوہدی لگدی
(میں پورن کی ہم عمر ہوں۔ کیا میں اس کی ماں لگتی ہوں؟)
پتا ہے دھی داروپ ہنڈاوے
تاں لوکاں نوں لاج نہ آوے
جے لوناں پتر نوں چاہوے
چتر ہین کہے کیوں
جیبھ جہان دی؟
(باپ جیسا شخص بیٹی جیسی لونا کی جوانی کا مالک بن جاتا ہے اس وقت لوگ چپ رہتے ہیں اور جب لونا بیٹے کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے تو زمانے کی زبان اسے آوارہ بولتی ہے۔)

لوناں ہووے تاں اپرادھن
جیکر اندر رہووے سہاگن

(لونا تب گناہ گار ہوتی اگر سہاگن ہوتی)
اوس اگن چھن میں روندی ہاں
اوس اگن چھن میں ہسدی ہاں
اپنے ہی پرچھانویں کولوں
دور دراڈے پئی نسدی ہاں
گربھ وان سپنی دے وانگن
اپنا آپا ہی ڈسدی ہاں
(کیسی آگ ہے جو کبھی رلاتی ہے تو کبھی ہنساتی ہے۔ میں اپنے ہی سائے سے دور بھاگ رہی ہوں اور میں سانپ بن کے اپنے آپ کو ڈس رہی ہوں)

لگتا ہے یہ لفظ نہیں ہیں، کسی بھسم ہوتی، جاں بلب عورت کی کراہیں اور سسکیاں ہیں۔ اس عورت کو تاریخ نے ایک ہوس کی پجارن کے طور پہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔

رانی لونا!

کہانی کچھ یوں ہے کہ دوسری صدی عیسوی میں سیالکوٹ کے راجہ سالوان کا ہلوں کی دو بیویاں تھیں۔ پہلی ہم عمر رانی اچھراں اور دوسری نو عمر رانی لونا۔

پہلی بیوی رانی اچھراں کا سیالکوٹ کے نواحی علاقے اگوکی سے تعلق تھا۔ خوبصورت رانی، بادشاہ کی منظور نظر۔ راجہ کے بنوائے ہوئے شاندار محل کی مکین اور یقیناً دل کی بھی۔

رانی اچھراں کے بطن سے لڑکا جنم لیتا ہے۔ سیالکوٹ میں خوب خوشیاں منائی جاتی ہیں، لیکن اس وقت خوشی ماند پڑ جاتی ہے جب جوتشی بادشاہ کو آگاہ کرتے ہیں کہ لڑکا بادشاہ کے ساتھ نہیں رہ سکتا کہ ستارے زندگی کو خطرہ بتاتے ہیں۔ بادشاہ دل پہ پتھر رکھ کے بچے کو اپنے سے دور پرورش کے لئے بھیج دیتا ہے۔

اور یہ بچہ پورن تھا، پورن بھگت!

پورن ماں باپ سے دور پل رہا ہے اور سیالکوٹ میں راجہ سالوان دوسری شادی کر لیتا ہے۔ مرتبے میں کم مگر کم عمر حسین و جمیل لونا، اپنے سوتیلے بیٹے کی ہم عمر رانی لونا!

بڑے ہونے پہ پورن گھر واپس لوٹتا ہے۔ اچھراں اور راجہ سالوان کی خوشی کی انتہا نہیں، لیکن کوئی اور بھی خوش اور پرجوش ہے، اپنا ہم عمر دیکھ کے اور وہ ہے رانی لونا!

رانی لونا جو راجہ کے ساتھ انتہائی ناخوش زندگی گزار رہی ہے، پورن کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔ پورن کی چاہت آگ بن کے رگ رگ میں دوڑ رہی ہے اور اس چاہت کی تکمیل چاہتی ہے۔ سماج کی بندشیں راہ میں حائل ہیں۔ پورن یہ محبت ٹھکرا رہا ہے اور لونا زخمی شیرنی بن چکی ہے۔ اب پورن کو سامنا ہے دراز دستی کے الزام کا جو نو عمر سوتیلی ماں کی ٹھکرائی ہوئی عزت نفس کا بدلہ ہے۔

راجہ کے حضور معاملہ پہنچتا ہے، عورت کی محبت اکلوتی اولاد کی محبت پہ غالب آتی ہے اور پورن کے ہاتھ پاؤں کاٹ کے کنویں میں پھنکوا دیا جاتا ہے اور پورن بارہ سال کنویں میں گزارتا ہے۔

اتفاق سے وہاں سے مہاجوگی گرو گورکھ ناتھ کا گزر ہوتا ہے وہ پورن کو نکالتے ہیں، اپنی روحانی طاقت سے اس کے کٹے بازو ٹھیک کرتے ہیں اور اپنا جوگی بنا لیتے ہیں۔ یہی گرو گورکھ ناتھ ہیں جو گورکھا اور ناتھ قبیلے کے بانی جانے جاتے ہیں اور کھاریاں کے نزدیک ٹلہ جوگیاں ان کے نام سے منسوب ہے۔

وقت گزرتا ہے روحانیت کے مدارج طے ہوتے ہیں۔ کل کا شہزادہ پورن، پورن بھگت بن کے ابھرتا ہے، خلق خدا کی خدمت پہ کمر باندھتا ہے، اسی کنویں کے پاس کٹیا بنا کے رہنا شروع کر دیتا ہے۔ جوگی کے آستانے کی دور دور شہرت ہے۔

راجہ جو اب بوڑھا ہو چکا ہے، خدمت میں حاضری دیتا ہے۔ باپ بیٹے کا سامنا ہوتا ہے، پہچان در آتی ہے۔

آگے کی کہانی یہ کہتی ہے کہ راجہ معافی کا خواستگار ہوتا ہے۔ پورن بھگت لونا سے اعتراف جرم چاہتا ہے۔ راجہ کے سامنے لونا کو سچ بولنا پڑتا ہے۔ پورن بھگت راجہ کو ایک اور بیٹے کی دعا دیتا ہے جو راجہ رسالو کی صورت میں پورا ہوتا ہے۔ پورن بھگت اسی طرح زندگی گزار دیتا ہے۔

صدیاں گزریں، پورن بھگت کا کنواں سیالکوٹ کے نواح میں موجود ہے جہاں آج بھی اولاد کے لئے منتیں مانی جاتی ہیں۔ پورن کو ماننے والا جنڈیال قبیلہ موجود ہے۔ کہانی موجود ہے، کہانی بننے والے کرداروں کا نام اور ترتیب موجود ہے، خدا جانے تاریخ کے اوراق سے گزرتی کتنی سچ اور کتنی جھوٹ۔

بنیادی سوچ تو آج بھی وہی ہے!

عورت کو صرف جسم سمجھ کے تصرف رکھنے والا مسوجنسٹ راجہ سالوان، اس کے ہاتھ مضبوط کرنے والی اچھراں، اپنے دائرے سے باہر نکل کے خواہش کا اظہار کرنے والی لونا اور پدر سری معاشرہ، عورت کو سزا سنانے میں ہر وقت تیار۔

اس کہانی میں کچھ سوال ہیں جن کے بارے میں مجھے رائے نہیں دینا۔ آپ فیصلہ کریں کہ:

رانی لونا غلط تھی یا سماج؟

رانی اچھراں کے بارے میں داستان خاموش کیوں ہے؟ اس کا جرم کیا تھا کہ اسے جوانی دان کر کے سوتن بھگتنا پڑی؟

راجہ سالوان کردار کا لو بھی تھا یا کانوں کا کچا تھا؟

پورن بھگت ظالم تھا یا مظلوم؟

بلاول بیٹا۔۔۔اپنی ماں کو شرمندہ مت کرو

کیا جملہ بول دیا تم نے!

لڑنا ہے تو مردوں سے لڑو۔۔۔۔یہی کہا نا تم نے؟

مغرب میں تعلیم پانے والے ایک مرد نے، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کئی محاذوں پہ مردوں سے ہار نہ ماننے والی عورت کے اکلوتے سپوت نے!

یہ تصویر دیکھو، تمہاری ماں نے مجھے تمغہ اعزاز پہنا کر میدان عمل میں اتارا تھا۔

بے نظیر! آپ کی محنت سب اکارت گئی اور قوم کی سب عورتیں بلاول کا لب ولہجہ سن کر بہت مایوس اور اداس ہوئیں!

ہم کیسے بھولیں اس لڑکی کو جو ڈکٹیٹر کے شب خون کے بعد نہتے ہاتھ سڑکوں پہ نکل آئی تھی۔ جو دن میں اپنے بدن پہ پولیس کی لاٹھیاں کھاتی تھی اور شام میں جیلوں کے دھکے کھاتی تھی۔ جو اس ابتلا کے دور میں بھی سب مردوں کو للکار کے بات کرتی تھی۔ جو باپ کی آئیڈیالوجی کا پرچم لیے استقامت سے کھڑی رہی۔

وہ عورت جس نے اپنی زندگی کے ابتدائی پچیس سال نازو نعم میں گزارے اور پھر وہ زندگی پیچھے چھوڑنے کا فیصلہ کرتے ہوئے ڈٹ گئی۔ اسے ملک میں چھائی شب سیاہ قبول نہیں تھی۔ اسے اپنے باپ کی پشت پہ کیا جانے والا وار اور پھر قتل کبھی قبول نہ ہوا۔

ایک طویل جدوجہد کے بعد اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی مگر پھر انہی مردوں کے ہاتھوں ڈسی گئی۔ ایک دفعہ نہیں، دو دفعہ حکومت سے محروم ہوئی۔ مریم کے والد بزرگوار کی طرف سے بے شمار تہمتیں برداشت کیں، کردار کشی کو ہنس کے سہا۔

اور پھر اسی رہ آزمائش پہ جان بھی دے دی۔

لیکن یہ کبھی نہیں کہا "لڑنا ہے تو مردوں سے لڑو، مجھ نہتی نے تمہارا کیا بگاڑا ہے"

بلاول کا یہ جملہ معاشرے کی اس تصویر کو واضح کرتا ہے جہاں عورت کی کارکردگی ایک مختلف درجے پہ ناپی جاتی ہے۔ جہاں یہ خود ہی سمجھ لیا جاتا ہے کہ جسمانی قوت میں سبقت رکھنے والے مردوں کو ہر میدان میں ہی فوقیت حاصل ہے۔

مجھے بہت ہنسی آتی ہے ایسی کم فہمی پہ اور معاشرے کے مردوں کی خود ساختہ طور پہ پھلائی ہوئی انا پہ۔

کسی بھی گائناکولوجسٹ سے پوچھ لیجیے، اسقاط حمل کس جنس میں زیادہ پایا جاتا ہے؟ زچگی کے دوران کونسے بچے سخت جان ہوتے ہوئے زندگی کی بازی نہیں ہارتے۔ کون سی مخلوق شدید جذباتی استحصال برداشت کرتے ہوئے بھی زندگی گزار جاتی ہے۔

یہ تو آپ مجھے بتایئے کہ آپ کے ارد گرد ماں، خالہ، تائی، چچی اور پھوپھی زیادہ عمر جیتی ہیں یا ابا، چچا، خالو، پھوپھا، اور تایا۔

مرد کو اگر جسمانی طور پہ مضبوط ہڈی پسلی بخشی گئی ہے تو عورت کو دو انتہائی طاقتور کروموسوم۔ مرد کے پاس موجود ایک ایکس اسے انتہائی کمزور بناتے ہوئے زندگی کے میدان سے جلدی رخصت کرتا ہے۔ جبکہ عورت کے دو ایکس اسے حیات کے دشوار راستوں سے گزرنے کی استقامت دیتے ہیں۔

عورت کو کمزور کیوں سمجھا جاتا ہے؟ اس کا جواب معاشرے اور ماحول میں چھپا ہے۔ مردانہ بالادستی ایک رویے کا نہیں بلکہ ایک استحصالی بندوبست کا نام ہے اور بدقسمتی سے اس نظام کو چلانے والوں کو اپنی بقا اور عافیت اسی میں نظر آتی ہے کہ عورت کو بچپن سے ادنی، کمزور، کم عقل، بے شعور، کم فہم اور جذباتی طور پہ کمزور پکارا جائے۔ خود عورت کو یہ باور کرا دیا جائے کہ رہ حیات میں اس کی کارکردگی دوسرے درجے کی ہے۔

پالن ہارنے ذہن، عقل، سوجھ بوجھ، اور فہم وذکا بخشنے میں کہیں کمی نہ رکھی۔ قرآن میں جہاں جہاں مرد کو پکارا، عورت کو بھی آواز دی۔ علم دونوں پہ فرض کیا، گھر کی اکائی دونوں کی، بچوں کی تربیت کی ذمہ داری دونوں پر۔

مانتی ہوں کہ مرد کو جسمانی برتری دی لیکن وہیں پہ عورت کو زچگی کے مرحلے سے گزرنے کے لئے Flexibility سے نوازا۔ بچہ رحم اور مہبل سے ہوتا ہوا دنیا میں نہیں آسکتا اگر عورت کے بدن میں مرد جیسے غیر لچک دار مردانہ مسلز موجود ہوتے۔

اسلام کی خاتون اول، سمجھ بوجھ اس درجے کی، کہ ایک بڑی تجارت کی مالک اور پیغمبر کو ملازم رکھ رہی ہیں۔ جذباتی طور پہ اتنی مضبوط کہ چالیس کی عمر میں پچیس سال کے مرد سے اپنا رشتہ طے کر رہی ہیں۔ آج اگر عورت ایسا قدم اٹھائے تو اس کی عمر پہ بڑھی گھوڑی لال لگام کی پھبتی کسنے والے کم نہیں ہوں گے اور اس کے ساتھ ساتھ بے حیا کا لقب بھی عنایت کیا جائے گا۔

اسلام کی جنگوں نے عورت کو ہمہ وقت ہمرکاب دیکھا، چاہے وہ چوب اٹھائے حضرت صفیہ ہوں یا حضرت عائشہ۔ کربلا کے میدان اور پھر یزید کے دربار تک کا امتحان بی بی زینب نے بے انتہا جرات سے ہتھکڑیاں پہنے ہوئے دیا۔ امام سجاد نے یزید کو کہیں نہیں للکارا کہ رسالت کے گھر کی عورتوں کا لڑائی میں کوئی کام نہیں۔ حقیقت میں یہ بی بی زینب کے خطبوں کا ہی اثر تھا جس نے دنیائے اسلام میں لرزش پیدا کر دی۔

اس کے برعکس ہمارے سرکاری گیت نگاروں نے لکھا "جنگ کھیڈ نئیں ہوندی زنانیاں دی"

کسی بھی صحت مند معاشرے کے قیام کے لئے مرد عورت کو ساتھ چلنا لازم ہے۔ چاہے سیاست ہو، تجارت ہو، صحت ہو، علم ہو یا دفاع کا میدان ہو۔ اور جان لیجئے کہ اس راہ میں آنے والی کٹھنائیوں میں عورت کو کوئی تخصیص نہیں چاہیے۔

عورت کو سیاست دان کے روپ میں اگر الزامات کا سامنا ہے تو اس میں عورت ہونے کی رعایت کا نعرہ کیوں؟

اور سمجھیے کہ جو بھی عورت جس بھی میدان میں اترتی ہے ذہنی طور پہ ہر امتحان کے لئے تیار ہوتی ہے۔ اگر عورت الیکشن لڑ کے وزیر اعظم بن سکتی ہے تو گرفتار ہو کے جیل بھی جا سکتی ہے۔

بلاول! لڑائی بھڑائی کرتے ہوئے ٹھنڈے مولیوں والی بھڑکیں فلمی دنیا میں اچھی لگتی ہیں، اسمبلی میں نہیں!

برائے مہربانی اب بڑے ہو جائیے اور عورت کو کمزور سمجھنے سے پہلے اپنی ماں کو یاد کر لیجیے!

ہنسی اور پھنسی

ہنسنا، دل کھول کے ہنسنا اور جی بھر کے ہنسنا!
بچپن سے ہی بہت مرغوب!
ابا ہنستے دیکھ کے مسکرا دیتے، اماں ہنس پڑتیں اور پھر بھی ہنسی قابو میں نہ آتی تو
کہتیں
لڑکی ہے یا پھیپھے میں آپ ہی آپ!
ہنسنے کے لئے کچھ خاص ہونا ضروری نہ تھا، کوئی بھی لطیف بات، کچھ بھی دل گدگدا دینے والا خیال، کوئی بھی وقت جو ایک معصوم اور سادہ دل کو چھیڑ دے، مسحور کر دے۔
ذرا بڑے ہوئے تو اس طرح کے الفاظ کانوں میں پڑے
"لڑکیاں اس طرح نہیں ہنسا کرتیں"
"ایسی لڑکیاں بہت بدتہذیب سمجھی جاتی ہیں"
"لڑکی کے ہنسنے سے لڑکے غلط مطلب نکالتے ہیں"
ہمارا چھوٹا سا دل اور دماغ اس صنفی فرق کو سمجھنے سے قاصر تھا سو ہنسی نہ چھوٹی، نہ چھوڑنے کی کوشش کی۔
کچھ اور بڑے ہوئے تو پتہ چلا کہ کافی لوگ ہماری ہنسی کو پھنسنے کے خانے میں ڈال چکے ہیں، اور اب باری کے منتظر ہیں۔

تب بھی کمزور عقل کے پلے نہ پڑا کہ ہم تو اپنی روح و جاں کے تقاضے پورے کرتے ہیں اور آخر ہم کہاں پھنسنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں اور کون ہے جو ہماری ہنسی کو دعوت سمجھتے ہوئے اختیار اور جبر کی کنڈی ڈالے بیٹھا ہے۔

زندگی کا سفر آگے بڑھا، پدر سری معاشرے کی تلخ حقیقتیں دیکھیں، وہ معیار دیکھے جو صنف نازک کے لئے علیحدہ سے تخلیق کیے گئے ہیں۔ ارد گرد ہزاروں ہی کردار تھے۔ اور بے شمار فقرے سماعت تک پہنچے

"عورتیں منہ پھاڑ کے نہیں ہنسا کرتیں"

"مردانے تک عورت کے ہنسنے کی آواز نہیں آنی چاہیے"

"محفل میں منہ پھاڑ کے ہنسنے والی عورت بری عورتوں کے زمرے میں آتی ہے"

"مرد متوجہ ہوتے ہیں"

"زیادہ ہنسنے سے دل مردہ ہوتا ہے"

"اسلام میں قہقہہ لگانا منع ہے"

چونکہ ڈاکٹر تھے اور بہت سی سائنس پڑھ رکھی تھی سو اب ہم یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ کھل کے ہنسنے سے تو بہت سی آکسیجن جسم میں جا کر دل و دماغ کو فرحت بخشتی ہے اس سے دل کیسے مردہ ہو گا؟

اور اسلام تو رہبانیت سے کوسوں دور رہنے کی تاکید کرتا ہے تو پھر قہقہے کو منع کرنے کے حکم کا معنی؟

رہی مردوں کے کانوں تک عورت کی ہنسی پہنچنے کی بات تو اس کی حقیقت سمجھنے سے بھی عاری تھے کہ موسیقی بھری مترنم ہنسی تھی یا کلاشنکوف کی گولی جو مارے دیتی تھی اور آخر ہنسی جیسے بے ضرر جذبے سے مردانگی کے جذبے پہ کہاں ضرب پڑتی تھی۔

اب آج جب زندگی کی بہت منزلیں طے ہو چکیں، وقت بہت سے راز آشکار کر چکا، اب دل چاہتا ہے کہ ہنسی اور پھنسی کی تشریح کروں اور دریافت کروں کہ عورت کو اتنا ارزاں کیوں جانا جاتا ہے۔

ہنسی ایک فطری جذبہ ہے ویسے ہی جیسے کہ رونا، اداس ہونا، خوش ہونا، بے چین ہونا، مطمئن ہونا۔ اور یہ جذبات بغیر کسی صنفی فرق کے حضرت انسان کو عطا کیے گئے ہیں زندگی کی اونچ نیچ سے نبرد آزما ہونے کے ہتھیاروں کے طور پہ۔

ان جذبوں کا اظہار انتہائی فطری ہے اور اپنی شخصیت اور ماحول کے مطابق مرد و عورت اس سے زندگی کا سفر آگے بڑھاتے ہیں۔ پھر ایسا کیا کہ ایک فطری جذبے کو کسی پس پردہ بات کا اشارہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ جو بات کہی نہیں گئی، سمجھی نہیں گئی، کس کی عقل سلیم پہلے بچی اور پھر عورت کی معصومیت اور فطری بے ساختگی تک پہ شکوک کے پہرے بٹھا دیتی ہے۔

اے ہمارے معاشرے کے عالی قدر جناب! آپ اس قدر نرگسیت کے ڈسے ہوئے کیوں ہیں کہ آپ کائنات کی ہر خوبصورت، زندہ اور توانائی سے بھرپور چیز پہ صرف اور صرف اپنا حق سمجھتے ہیں

آپ کی انا یہ کیوں نہیں تسلیم کرتی کہ زندگی کی خوبصورتی کو محسوس کرنے کے لئے کسی اور کے پاس بھی وہی احساسات، جذبات، حسیات، توانائی اور صلاحیت موجود ہے جو حضور والا آپ کے پاس ہے۔

آپ کو یہ کیوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی راجہ اندر کا اکھاڑہ ہے اور ہر عورت داسی بننے کا ارمان لئے دل ہتھیلی پہ لئے گھوم رہی ہے۔ آپ کی توجہ حاصل کرنے کو سولہ سنگھار کیے ہوئے ہے۔ آپ کیوں اپنے آپ کو یقین دلا دیتے ہیں کہ اگر کوئی عورت مسکرائے گی یا ہنسے گی تو یہ ایک اشارہ ہے آپ کی وحشتوں کی تسکین کے لئے۔

یقین کر لیجیے! عورت کے اندر بھی جہاں آباد ہے۔

ایک ایسا جہاں جو ہنستا ہے، کھلکھلاتا ہے، پر نہ پھنسنا چاہتا ہے نہ پھانسنا۔ عورت کو بھی زندگی کی لطافتیں، رعنائیاں اور دوستوں کی محفل ایسے ہی محظوظ کرتی ہے جیسے کہ آپ حضور کو۔ وہ بھی زندگی کی کٹھنائیوں اور اونچے نیچے راستوں میں بکھری ہوئی سانس کو ویسے ہی بحال کرنا چاہتی ہے جیسے کہ آپ اعلی حضرت۔

شکاری کا کنڈی ڈالے پھانسنے والا جال اگر اس کے اندر سے اٹھنے والی آزاد ہنسی کو چارہ سمجھتا ہے تو ہم اس پہ سوائے ہنسنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔

ہاہاہا

لیکن دل اور روح پہ چھائی اداسی کیسے چھپے گی!

مجھے اپنی بیٹی کو قتل کرنا ہے

" مجھے اپنی بیٹی کو قتل کرنا ہے"

"ایسا کیا کر دیا اس نے ؟"

"وہ ایک لڑکے کی محبت میں مبتلا ہے، اس سے رہ و رسم رکھے ہوئے ہے، میں یہ برداشت نہیں کر سکتا"

" کیا قتل کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ؟"

" یہ میری عزت اور غیرت کا مسئلہ ہے، بیٹی نے باپ کی پگ اچھالی ہے"

"مجھ سے کیا چاہتے ہو ؟"

"تم بحیثیت وکیل مجھے بتاؤ کہ قتل کے بعد مجھے کم سے کم سزا کیسے ہو سکتی ہے"

"دیکھو، غیرت کے نام پہ مارو گے تو ولی ہونے کے ناطے کم سے کم تین اور زیادہ سے زیادہ دس برس قید ہو گی، سزائے موت نہیں ہو سکتی"۔

ایک عورت کو قتل کرنے کے لئے ایک مرد نے دوسرے مرد سے مشورہ لیا اور عورت بھی وہ، جو پندرہ سالہ بیٹی تھی۔ وکیل دوست کا دل نہ لرزا، نہ کانپا کہ ایک بیٹی موت کے دہانے پہ کھڑی ہے۔ غیرت کے نام پہ ہونے والے قتل کے بعد سزائے موت نہ ہونے کی تسلی کروائی اور گھر کو لوٹ گیا۔ بالکل ویسے ہی جیسے شام میں کافی پیتے ہوئے تاش کی بازی لگاتے ہوئے مختلف چالیں زیر بحث آئیں جو نہ تو کسی کو ہیجان میں مبتلا کریں اور نہ ہی کوئی احساس جرم ہو۔

سزائے موت نہ پانے کی نوید کے ساتھ اس رات وہ باپ ایک کلہاڑی لے کر اپنی پندرہ سالہ بیٹی کے کمرے میں گھسا اور ایک ہی وار میں سر تن سے جدا کر دیا۔ بیٹی کے خون میں بھیگ کے باپ کا شملہ پھر سے اونچا ہو گیا، عزت و غیرت کو درپیش چیلنج کو نمٹا لیا گیا۔ یہ ہے مشرق میں ایک لڑکی کا مقام!

یہ کہانی ہے ہمارے ہمسایہ ملک ایران میں رہنے والی ایک بیٹی رومینہ اشرفی کی!

حیرت کا ہے کی، ایران ہو یا افغانستان، ہندوستان ہو یا پاکستان، عورت کو دیکھنے، پرکھنے، جانچنے اور فیصلہ سنانے والی وحشت بھری آنکھ اور ہاتھ میں تھامے گئے آلہ قتل میں سرحدوں کی لکیروں سے کوئی فرق نہیں پڑا کرتا!

قصہ کچھ یوں ہے کہ رومینہ اشرفی کو ایک لڑکے سے محبت ہو گئی۔ کوئی انوکھی بات نہیں کہ مرد و عورت کی محبت کی گونج تو روز ازل سے کائنات میں موجود ہے۔ رومینہ کو اس لڑکے نے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہا اور اس کے رشتے کا طلبگار ہوا۔ رومینہ اشرفی کے باپ نے سختی سے انکار کر دیا کہ لڑکے کا خاندان اسے پسند نہیں تھا۔ رومینہ کی خواہش جاننے کے باوجود باپ ٹس سے مس نہ ہوا کہ بیٹی کی خواہش کی اہمیت خاک کے برابر تھی۔ یہاں تک کی کہانی ویسی ہی ہے جیسے ہم صدیوں سے سنتے دیکھتے چلے آئے ہیں۔

لیکن آگے کی داستان مختلف رنگ رکھتی تھی۔ رومینہ کا باپ، باپ نہیں رہا تھا، وہ ایک مرد بن چکا تھا جسے ایک عورت کی ہستی پہ بلا شرکت غیرے ملکیت کا زعم تھا۔ وہ بازار سے زہر خرید کے لایا اور رومینہ سے متقاضی ہوا کہ وہ زہر پی کے خودکشی کر لے۔

رومینہ نے باپ سے کہا،

"بابا، میں گھر سے چلی جاؤں گی، ایک رقعہ چھوڑ جاؤں گی۔ آپ یہ ہی سمجھیے گا اور اعلان کیجیے گا کہ میں مر گئی" اور وہ دنیا چھوڑنے کی بجائے گھر سے چلی گئی۔

غم و غصے سے پاگل ہوتا مرد ہار ماننے کو تیار نہیں تھا، اسے بیٹی کی موت ہی سکون دے سکتی تھی۔ بیٹی کا سراغ لگایا اور اغوا کا پرچہ درج کروایا۔ بیٹی بازیافت ہوئی لیکن اس بیان کے ساتھ کہ وہ اپنی مرضی سے گئی تھی۔

"اپنی مرضی"... وہ لفظ جنہوں نے رومینہ کے موت کے پروانے پہ دستخط کر دیے۔

رومینہ کو گھر لایا گیا، وکیل سے مشورہ کیا گیا اور اندھیری رات میں لڑکی کا سر اس کے جسم سے جدا کر دیا گیا۔ لیجیے، عزت وغیرت کے تقاضے پورے کر دیئے گئے۔

ایران کی رومینہ ہو، افغانستان کی زرگل یا پاکستان کی رضیہ، کیا فرق پڑتا ہے؟ ایشیائی معاشروں میں گھر کی لڑکی اور باڑے میں بندھے جانور کے نصیب کا تعین مالک کے ہاتھ میں ہوا کرتا ہے۔ لڑکی کی پسند اور مرضی وہ پرخار رہ گزر ہے جس پہ چلنے والی کے جسم و روح میں چھید ہونا مقدر ہوا کرتا ہے۔

ہمارے کچھ سوال ہیں جو ہم اٹھانا چاہتے ہیں!

کیا ہوتا اگر رومینہ کی جگہ رومین اشرفی ہوتا اور کسی لڑکی سے محبت کے بعد زندگی ساتھ گزارنے کی خواہش کرتا؟ کیا اس کا باپ اپنے بیٹے کا سر ویسے ہی تن سے جدا کرتا جیسے رومینہ کی گردن دھڑ سے اتر گئی؟

کیا ہوا؟ جواب دینا مشکل ہے نا! چلیے ہم بتائے دیتے ہیں تاکہ آپ کو گریبان میں جھانکنے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔

ایشیائی معاشروں میں جب کسی لڑکے کو کسی لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے تو اہل خانہ کے چہروں پہ دبی دبی سی مسکراہٹ پھیلتی ہے اور اپنے سپوت کی ابھرتی جوانی کا افتخار محسوس کیا جاتا ہے۔ کہیں کہیں باپ ماں کو چھیڑتے ہوئے یہ بھی کہتا ہے" ارے سنتی ہو، بیٹا پالنے سے پاؤں نکال رہا ہے"۔

نہ عزت کا جنازہ نکلنے کی فکر آن گھیرتی ہے اور نہ ہی غیرت کو کسی قسم کی آنچ پہنچنے کا اندیشہ۔ کوئی سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ پوت جس لڑکی سے عشق کی پینگیں بڑھا رہا ہے، وہ کسی اور کی دختر نیک اختر ہے اور شاید کہیں اور کسی کی عزت وغیرت خطرے میں ہے۔ خیال یہی ہوتا ہے "لڑکے تو ایسا کیا ہی کرتے ہیں، ہاں لڑکیوں کو والدین کی عزت کا بھرم رکھنا ہوتا ہے"۔

یہ کس طرح کی عزت و غیرت ہے جس کی پیاس بیٹی کے لہو سے بجھتی ہے اور بیٹے کی اداؤں سے۔ یہ کس طرح کا قانون ہے جو بیٹی کو قتل کرنے پہ باپ کی کچھ برس کی قید کو کافی سمجھتا ہے۔ ایک اور بات جان لیجیے اگر یہی قتل ماں کرے تو اس کو قانون میں کسی قسم کی چھوٹ نہیں کہ عورت کی غیرت کے تصور کا اندراج کہیں نہیں۔

ہمیں تو آج تک یہ ہی سمجھ نہیں آئی کہ غیرت کس چڑیا کا نام ہے؟ یہ بھی دریافت نہیں کر پائے کہ مرد اپنے مسخ شدہ کریہہ جذبات کو غیرت کا نام دے کے ایک عورت پہ اس کا بوجھ کیوں لاد دیا کرتے ہیں؟

خالق نے ایک مخلوق مرد و عورت کے نام سے بنائی اور بنیادی لاحقے ایک جیسے ٹھہرے۔ اب نہ جانے یہ غیرت و عزت کا پھندنا نہ جانے کس نے اور اور کیسے عورت کی گردن میں ٹانگ دیا بالکل ویسے ہی جیسے بکری کو نکیل ڈال دی جائے۔ دودھ دینا بند کر دے یا ذرا اڑیل ہو جائے تو گردن پہ چھری پھیرنے کے لئے زیادہ سوچ بچار نہیں ہوا کرتی۔

روبینہ اشرفی! تمہارے باپ کے نزدیک تم گلے کی ایک بھیڑ ہی تھیں، جسے وہ اپنی مرضی سے ہانکتا تھا۔ تمہاری قربانی کرتے وقت اس کے پیش نظر ایک ہی بات تھی، تم اپنی مرضی سے باپ کی ملکیت سے نہیں نکل سکتیں۔ تم کیوں بھول گئیں کہ تم صرف باپ کی مرضی کے مرد کے ساتھ رشتہ بنا سکتی ہو۔

یہ ہے مردوں کا معاشرہ، جہاں کا ہر قاعدہ، ہر قانون، ہر سزا عورت کے لئے اور ہے، مرد کے لئے اور۔ یہی وہ نظام ہے جس نے مرد کو عورت پہ ہر طرح کا ظلم روا رکھنے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

"کر دو قتل، سزائے موت نہیں ہو گی۔ تم باپ ہو اور باپ ولی ہونے کے ناطے کچھ بھی کرے، یہ اس کا حق ہے"

یہ حق باپ کو کس نے تفویض کیا ہے؟ ہمیں اس کا جواب چاہیے!

کیا اللہ نہیں جانتا تھا کہ عورت کو کونسے اعضا بخشنا ہیں؟

وہ افریقی لڑکی تھی!

چمکتی آبنوسی رنگت، گھنگریالے بال، طویل قامت، تیئس چوبیس کا مضمحل، آزردہ وجود!

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں"

وہ کچھ لمحے ہمیں دیکھتی رہی اور پھر بے اختیار آنسو اس کے رخساروں پہ پھسلنے لگے۔ لرزتے ہونٹوں سے کچھ زخمی الفاظ نکلے

"ڈاکٹر میری مدد کرو"

"جی بتایئے"

"چھ ماہ ہو گئے میری شادی کو، اور اذیت کا ایک سلسلہ ہے"

ہم سیدھے ہو بیٹھے اور اس لڑکی کو دلاسہ دیتے ہوئے مزید بتانے کا کہا۔ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اس کی تکلیف جاننے کے بعد ہمارے دل کا درد بڑھ گیا۔ مذہب یا رسم ورواج کے نام پہ دنیا کے ایک اور خطے میں بنیادی انسانی حقوق کی نفی کرتے ہوئے عورت سے زندگی اور خوشی کا حق چھیننے کا عمل جاری تھا۔

وہ لڑکی بچپن میں ختنہ کی جا چکی تھی!

"مجھے وہ دن نہیں بھولتا! تھا تو ایک روشن دن لیکن مجھے پوری عمر کا کرب دے گیا۔ میں آنگن میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ گھر میں کچھ لوگوں کی آمد ورفت کا سلسلہ تھا۔ ابا نے مجھے آواز دی تھی۔ میں ان کی طرف لپکی تھی، شاید وہ میرے

لئے گڑیا لائے تھے۔ لیکن کھیلنے سے پہلے مجھے چاچا سے ملنا تھا جو باہر میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں خوشی خوشی بھاگتے ہوئے گئی تھی اور پھر مجھے چار لوگوں نے زبردستی تھام لیا تھا۔ میں نے گھبرا کے ابا کو دیکھا تھا، ابا نے منہ پھیر لیا تھا۔ اس کے بعد جو ہوا، اس کی یاد ابھی بھی رات کو سونے نہیں دیتی۔ میری چیخیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔ درد تھا کہ رگ رگ میں دوڑ تا تھا۔ خون کسی فوارے کی طرح اچھلتا تھا۔ میں غش کھاتی اور درد مجھے بے ہوشی کی سرحد سے پھر واپس لے آتا۔ اس کے بعد میں بہت عرصہ چل نہیں پائی، حوائج ضروریہ بھی بہت مشکل تھے۔ رفتہ رفتہ جسم کے زخم تو مندمل ہو گئے مگر مجھے عذاب میں مبتلا کر گئے۔ میں اب سو نہیں پاتی کہ ایک ہی منظر آنکھوں کے سامنے رہتا ہے"

وہ بے طرح رو رہی تھی!

ہم نے چاہا کہ اس کا معائنہ کر کے معاملے کی سنگینی کو جانچا جائے۔ آسمان ٹوٹ پڑتا تو ہم اتنے دل گرفتہ نہیں ہوتے جتنے اس کو دیکھنے کے بعد ہک دک کھڑے تھے۔ ایک عورت کے ساتھ وحشیانہ بربریت نے ہماری آواز گم کر دی تھی اور ہمارے دل کی بے قاعدہ ہوتی دھڑکن ہمیں گھٹن کا احساس دلاتی تھی۔

"آپ دیکھ رہی ہیں میں کس حال میں ہوں، شوہر کے تقاضے ہیں۔ مجھے بتائیے میں وظیفۂ زوجیت کیسے ادا کروں؟"

وہ زنانہ ختنوں کی انتہائی قسم کا شکار ہوئی تھی اور تیس برس میں ہزاروں مریض دیکھنے کے باوجود اس طرح کا مریض میرا پہلا اتفاق تھا۔

عورتوں کے ختنے انسانیت کے منہ پہ ایک زناٹے دار طمانچہ ہے اور جبر وتشدد کی ایک انتہائی المناک مثال۔ اس سلسلے میں دنیا کی تمام انسانی حقوق کی تنظیمیں بے بس نظر آتی ہیں۔

ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے مطابق اس وقت دو سو ملین (بیس کروڑ) عورتیں اور بچیاں ختنہ کی جا چکی ہیں اور ان کا تعلق افریقہ، ایشیا اور مڈل ایسٹ کے تیس ملکوں سے ہے۔ مغرب میں ان ملکوں سے تعلق رکھنے والی رہائش پذیر بہت سی بچیاں اس رسم کا شکار غیر

قانونی طور پر ہوتی ہیں۔ ختنہ کرنے والے مرد وزن بغیر کسی بے ہوشی کی دوا کے یہ عمل کر گزرتے ہیں۔ زیادہ خون بہہ جانے سے کئی بد قسمت بچیاں زندگی کی بازی ہار جاتی ہیں۔

زنانہ ختنوں کی چار قسمیں ہیں!

پہلی قسم میں clitoris کاٹ کے نکال دیا جاتا ہے۔

دوسری قسم میں clitoris کے ساتھ labia minora بھی اس زد میں آتے ہیں۔

تیسری قسم میں clitoris, Labia minora اور Labia Majora کاٹ کے سب کچھ صاف کر دیا جاتا ہے۔

چوتھی اور انتہائی قسم میں سب اعضاء مخصوصہ کاٹ کے بقیہ جگہ کی سلائی کر کے ہمیشہ کے لئے بند کر دیا جاتا ہے بول اور ماہواری کے اخراج کے لئے ایک چھوٹا سا سوراخ چھوڑ دیا جاتا ہے۔

پہلی تین قسموں میں لڑکی کے نصیب میں بچپن سے تڑپنا، روز مرنا اور مر کے جی اٹھنا حصے میں آتا ہے۔ ایک درد بھری اندھیری رات اس کا مقدر بنتی ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی کہ مالک کائنات سے کیا شکوہ کرے کہ بنانے والے اگر یہ سب اعضاء غیر ضروری تھے تو بنائے کیوں؟

آدم کے بیٹے کے ہاتھ اور نظر میں حوا کی بیٹی کی تقدیر کا فیصلہ، کیوں آخر کیوں؟

چوتھی قسم کے ختنے کا شکار ہونے والی باقی کی عمر صلیب پہ مصلوب گزارتی ہے۔ زندگی کا ہر ہر لمحہ جسم و جاں سے خراج لیتا ہے۔ اذیت کی گھڑیاں ہجولی بن جاتی ہیں۔ حوائج ضروری کا اخراج قیامت بن جاتا ہے۔ ماہواری کسی سزا سے کم نہیں ہوتی کہ تمام اعضائے مخصوصہ قلم کیے جا چکے ہیں اور اب انسانی ہاتھوں کا تراشا ہوا بد صورت سوراخ ہے جو کبھی راہ دیتا ہے، کبھی نہیں۔

بات یہیں پہ نہیں ٹلتی! رہ حیات کے دشوار ترین معاملات میں سے گزرنا ابھی باقی ہے۔ اوائل عمری میں زندگی کا فیصلہ کرنے والے مردوں کے بعد اب ایک اور مرد کی آرزوؤں کا بوجھ اٹھانا ہے۔ اس مرد کو پاکیزہ ختنہ زدہ عورت بھی چاہیے اور اپنی جنسی

خواہشات کی تکمیل بھی۔ وہ متقاضی ہے کہ بربریت کا عمل پھر سے دہرایا جائے، مشکل سے مندمل ہوئے زخموں کو ادھیڑ کے راہ بنائی جائے کہ مالک کی خواہشات کو بھی پورا ہونا ہے اور افزائش نسل کی بھی تمنا ہے۔

اس ظلم کے پس پردہ بہت سی توجیہات گھڑ لی گئی ہیں۔ مذہب والے مذہب کی چادر اوڑھ کے اسے جائز قرار دیتے ہیں۔ روایت کی ڈگڈگی بجانے والوں کی ایک الگ کتھا ہے۔ پدر سری نظام کو اعلیٰ سمجھ کے عورت کو دو ٹکے کی مخلوق سمجھنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ جتنے منہ ہیں اتنے فتوے!

ان بیش قیمت آرا رکھنے والوں کے خیال میں عورت نجس ہے سو پاکیزہ بنانے کے لئے ختنے کا عمل ضروری ہے۔ کچھ کی سوچ ہے کہ عورت کے بیرونی جنسی اعضاء مرد سے کچھ مماثلت رکھتے ہیں سو عورت کو عورت ہونا چاہئے، مرد سے اتنی معمولی سی مشابہت بھی کیوں ٹھہرے؟ کچھ اہل دانش عورت کی جنسی خواہشات کو غیر ضروری گردانتے ہوئے ان کا یہ حق واپس لینے کے حق میں ختنوں کی رسم کو جائز، حلال بلکہ ضروری قرار دیتے ہیں۔

اس افریقی لڑکی کو اس کا شوہر ہمارے کلینک لایا تھا۔ اب ہمیں تمام کٹے پھٹے، سلے ہوئے اعضا کو آپریشن سے کھول کے اس قابل بنانا تھا کہ وہ لڑکی شوہر کے استعمال کے قابل بھی ہو جائے اور مستقبل میں وارث بھی پیدا کر سکے۔ اس سب میں ہمارے دل و جاں کا جو خون ہونا تھا، وہ کون جانے۔
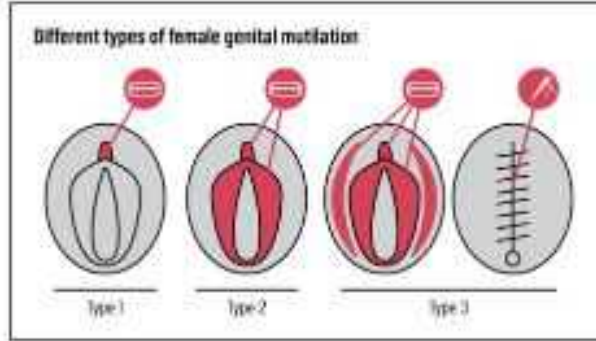
ان مقامات آہ و فغان سے ہم ہر دوسرے دن گزرتے ہیں۔ کبھی کتابیں پڑھتے ہوئے، کبھی سفر کرتے ہوئے، کبھی معاشرے کے خود ساختہ آقاؤں یعنی مردوں کو

عورت کی قیمت لگاتے دیکھ کے، کبھی وفا شعاری اور بے وفائی کی سولی پہ جھولتی ہوئی عورت کی بے بسی محسوس کر کے اور کبھی مریض دیکھ کے ان کی کہانیاں سنتے ہوئے۔

انسانیت کی اس تذلیل اور خالق کائنات کی تخلیق کے ساتھ کیا جانے والا ظلم ہمیں ایک ہی سوال پوچھنے پہ مجبور کرتا ہے

"کیا اللہ نہیں جانتا تھا کہ عورت کو کونسے اعضا بخشا ہیں؟"

سوارہ یا انسانیت کا بٹوارہ

مسرت بھرا شور، ہنسی، قہقہے، باتیں اور چھینا جھپٹی!

ہمارے دونوں ٹین ایجر بچے چھٹی منا رہے تھے اور روز مرہ کے دنوں میں گھر میں پھیلا ہوا سناٹا ان کی شرارت بھری آوازیں سن کے مسکرا تا تھا!

یک لخت دونوں بھاگتے دوڑتے ہم تک آن پہنچے اور پھولی سانس سے دونوں بولے،

"اماں ایک بات بتایئے"

"پوچھیے بیٹا"

"ہم دونوں میں سے آپ کو کون زیادہ اچھا لگتا ہے؟ حیدر یا شہر بانو؟"

اور ہمیں یوں لگا کہ یہ بازگشت تھی گئے زمانے اور گزرے وقت کی!

شاید ہم نے بھی کسی آنگن میں کھیلتے کبھی یہی پوچھا تھا۔ شاید ہر بچہ اپنے ماں باپ سے محبت والفت کی یاد دہانی چاہتا ہے۔

"پہلے مجھے بتایئے کہ آپ کو اگر دیکھنا ہو تو کونسی آنکھ استعمال کریں گے"

"اماں، ایک آنکھ سے تو ادھورا دکھے گا، مکمل منظر تو دو آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے"

"تو آپ دونوں میری دو آنکھیں ہیں، ایک دائیں ایک بائیں۔ مجھے دونوں سے زندگی خوبصورت اور مکمل نظر آتی ہے۔ دونوں آنکھیں میری ضرورت ہیں"

دونوں نے میرے گلے میں اپنی بانہیں ڈال دیں!

کیف وانبساط کے ان لحات میں ایک عجیب سے خیال نے سر اٹھایا،

"کیا ہم اپنے اس من موہنے بیٹے کی خاطر اس فرشتہ صورت بیٹی کو قربان کر سکتے ہیں؟

کیا حیدر اگر غلط راہوں پہ چلتا ہوا سزا کا حقدار ٹھہرے، اس کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے شہر بانو کو جیتے جی جہنم میں دھکیلا جا سکتا ہے؟ "

"کیا وہ باپ جو یہ فیصلہ کرتے ہیں، ان کا اپنی بیٹی کے لئے محبت کا پلڑا ہلکا ہوتا ہے اور بیٹی قربان کرتے ہوئے ان کا دل نہیں کانپتا؟"

دل پہ ایک گھونسا سا پڑا اور آنکھ سے کچھ بے مایہ قطرے ٹپک پڑے!

دنیا بھر کی عورت کی بات کرتے کرتے وطن عزیز میں کم سن بچیوں پہ ہونے والے ظلم کی یاد آگئی!

"ونی یا سوارہ" ایک ایسی رسم جو وطن کے سب مردوں کے منہ پہ ایک طمانچہ ہے۔ عورت کو دو ٹکے کا گردانتے والوں کی ذہنیت اس پنڈال میں کھلتی ہے جب مردانگی کے زعم میں مبتلا مردوں کا اجتماع اپنے جیسے مرد کی غلطی معاف کرتا ہے، اپنے جیسے ہی کو کفارہ ادا کرنے کو کہتا ہے، اور اپنے جیسے ایک اور مرد کی عیاشی کا سامان کرتا ہے۔

اس ساری اکھاڑ پچھاڑ میں چھری تلے کون آتی ہے، ایک کم سن بچی!

وہ جو ابھی ماں سے لپٹ کے سوتی ہے۔ وہ جو بابا کے گھر آنے پہ دوڑ کے دروازہ کھولتی ہے۔ وہ جو آنگن میں بہن بھائیوں کے ساتھ بے فکری سے کھیلتی کودتی ہے۔ وہ جو سہیلیوں کے ساتھ گڑیا کی شادی رچاتی پھرتی ہے۔ وہ جسے ابھی یہ بھی نہیں معلوم کہ زندگی آخر ہے کیا؟ وہ جس کے پاؤں تلے زمین نہیں، سر پہ آسمان نہیں، اپنی شناخت نہیں، اپنے وجود سے آگہی نہیں، جسم میں دوشیزگی کے آثار نہیں، نظر میں کوئی چاہ نہیں، سوچ میں معصومیت اور کھلنڈرے پن کے سوا کچھ بھی نہیں۔

جرگے میں بڑھاپے کی کھٹنائیوں کو جھیلتے، زندگی کو اپنی مرضی سے برتنے کے بعد تھکے ہارے سیاہ دل چالیس پچاس مردوں کا اجتماع ہے۔ ایک طاقت کے زعم میں مبتلا، جری

مرد قتل کر کے اس کی سزا سے خوفزدہ ہے اور جرگے سے معافی کا خواستگار ہے۔ بدلے میں 'کچھ بھی' کرنے کو تیار ہے۔

یہ 'کچھ بھی' اس کی آٹھ سالہ ننھی منی بہن ہے جو باہر گلی میں تتلیوں کے تعاقب میں بھاگ رہی ہے۔ من میں عجیب سی سرخوشی سمائی ہے اور سوچتی جاتی ہے، آج نہ معلوم بھائیا مجھے کیوں ایسے دیکھتا تھا، اماں کیوں سہمی جاتی تھی اور ابا بھائیا کی بات پہ سر اثبات میں ہلاتا تھا۔

لیجیے پتھر دل انسانوں نے فیصلہ سنا دیا۔ معافی کے بدلے میں قربانی چاہیے اور وہ بھی گھر کی عورت کی۔ کیا ہوا جو بچی ہے؟ جنسی اعضا تو رکھتی ہے نا۔ بھیڑ بکریوں جیسی استعمال کی چیز ہے، جیسے جانور منڈی میں بکتے ہیں ویسے ہی یہ لڑکی بھی۔ کیا ہوا جو بہن ہے؟ بہنوں نے ہی تو بھائیوں کی جھوٹی عزتوں کی لاج رکھنی ہوتی ہے۔

اب رخصتی ہونا ہے آٹھ سالہ بچی کی گھر سے۔ کچھ ڈھلتی عمر کے شقی القلب سودا طے ہونے کے بعد سوارہ لڑکی لینے آئے ہیں۔ مذہب سے کھیلنے والا مولوی بھی ہمراہ ہے جو اس سارے عمل کو جائز بنائے گا اور ایک گڑیا، ہاتھوں پہ تتلیوں کے رنگ لئے، بغل میں گڑیا دبائے ایک اور مالک کے حوالے کی جائے گی۔ جس کی غلیظ مسکراہٹ اس کے مذموم ارادوں کی خبر دیتی ہے۔ اس نے بیچ پنڈال میں ایک لڑکی جیتی ہے جو اسے بھینٹ چڑھائی گئی ہے۔ اس کے جنسی ارادوں میں وہ معصوم جان کی بازی بھی ہار گئی تو کسے پرواہ، لڑکی ذات ہی تو ہے، اسی قابل ہے۔

ہمیں شکوہ ہے اپنے معاشرے کے ان سب مردوں سے جو یہ خبریں پڑھتے ہیں، سنتے ہیں اور سنی ان سنی کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

ہمیں شکایت ہے نظام مصطفیٰ کی بات کرنے والوں سے کہ کبھی ان جرگوں کے نظام پہ بھی نظر ڈال لیجیے۔

ہمیں افسوس ہے ان تمام تبلیغی علما سے جو جنت کی حوروں کا تذکرہ کرتے نہیں تھکتے، کاش اپنے اردگرد ان مسل دی جانے والی کلیوں کی بھی بات کر لیں۔

ہمیں مایوسی ہے ریاست مدینہ کی مالا جپنے والوں سے کہ کبھی اپنی ریاست کی ان تاریک راہوں میں سے گزرنے کا حوصلہ تو کریں۔ ریاست مدینہ زبانی کلامی نہیں بنا کرتی، اس کے لئے انصاف کی صلیب بغیر کسی مفاد کے اٹھانا پڑتی ہے۔

اگلے زمانے کا مورخ یہ داستانیں پڑھ کے ایک سوال ضرور پوچھے گا،

"کیا واقعی یہ لوگ اپنے آپ کو انسان سمجھتے تھے؟"

مولانا ضمیر اختر نقوی عرف 'یہ تو ہو گا'

جب سے سنا ہے، پیچ و تاب کھاتے چلے جا رہے ہیں!

غضب خدا کا، تیس برس ہو گئے ڈاکٹر بنے، پچیس برس ہو گئے گائنی میں کام کرتے! دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں سے سائنس میں ڈگریاں حاصل کر ڈالیں، ہزاروں مریضوں کا علاج کر لیا، لیکن پھر بھی ہم نالائق کے نالائق ہی ٹھہرے!

موئے انگریزوں کی کتابیں پڑھ پڑھ کے اپنے ہاں کا جوہر قابل ہمیں نظر ہی نہیں آیا کہ زانوئے تلمذ تہ کرتے اور علم کے کچھ نادر موتی چن لیتے۔ لیجیے ثابت ہو گیا نا کہ احساس کمتری کی ماری قوم کو اپنے دامن کا ہیرا پتھر ہی نظر آیا کرتا ہے۔

حاضر ہیں آپ کے لئے کچھ لولوئے گلفام،

"معذور بچوں سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ حمل ٹھہرنے سے لے کر زچگی تک عورت شوہر کے علاوہ کسی بھی غیر مرد کو نہ دیکھے۔ بازاروں میں نہ جائے، مجمعے میں نہ جائے، غیر محرم کے پاس سے بھی نہ گزرے"

دیکھیے یہ سن کے تو ہمیں پچھتاوں نے آگھیرا ہے، کیسی فاش غلطی ہوئی ہم سے۔ تین حمل ہوئے اور تینوں میں ہر دن گھر سے نکل کے نہ صرف ہسپتال نوکری پہ پہنچ جاتے بلکہ رستے میں آنے والے تمام غیر مردوں سے سلام دعا بھی کرتے جاتے۔ ہسپتال کے چوکیدار، وارڈ بوائے، ساتھی ڈاکٹرز، میڈیکل سپرنٹنڈنٹ، مریضوں کے لواحقین، پٹرول پمپ کے ملازم، صدر میں جوس کی دوکان والا، ہمارا ریسرچ اسسٹنٹ، کتابوں کی دوکان کے

سیلز مین، درزی، اب کس کس کا نام گنوائیں۔ اور تو اور ہمارے گھر کے تو ملازم بھی مرد تھے، بیٹ مین، مالی، خاکروب جن کے سر پہ ہمارا گھر چلتا تھا۔

اب ہم انتہائی سراسیمگی کے عالم میں حیدر میاں کے بازو اور ٹانگیں ٹٹول ٹٹول کے دیکھتے ہیں کہ خدانخواستہ کوئی ٹیڑھاپن تو موجود نہیں۔ آنکھیں، ناک، کان اور دماغ کا معائنہ کروانا بھی مقصود ہے۔ دیکھیے نا مولانا ضمیر اختر نقوی کی سائنسی ریسرچ کو جھٹلانے کی تو ہم میں تاب نہیں۔ سو تشویش ہے کہ کہیں غیر مردوں کے چہرے دیکھنے کی بابت ہماری غفلت نے کچھ رنگ نہ دکھایا ہو۔ گھر میں فی الحال تو حیدر میاں دسترس میں ہیں سو انہی پہ زور چل رہا ہے۔ بیٹیوں سے بات ہو گی تو وڈیو کال پہ ان کو بھی غور سے دیکھنے اور نظروں میں ٹٹولنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔

ان سب حرکات سے یہ ضرور ہوا ہے کہ حیدر میاں کو ہماری دماغی صحت پہ شک ہو چلا ہے۔ شبہ تو ہمیں بھی ہے کہ ماضی میں تو بچ نکلے لیکن زمانہ حال کے غیر مردوں کو دیکھنے سے شاید ہمارا دماغ چل چکا ہے۔ کبھی مولوی قوی، کبھی خلیل الرحمن قمر، کبھی مولانا طارق جمیل، کبھی مفتی منیب اور اگر تھوڑی کسر باقی تھی تو اب یہ حضرت ضمیر اختر نقوی!

"یہ سائنس کہہ رہی ہے کہ ماں اگر غیر مرد کو دیکھے گی تو اس کی ساری عادات و اطوار ریز (شعاعوں) کے ذریعے عورت کے اندر اتر جائیں گی، خباثتیں جو معاشرے میں ہیں، وہ بچے میں آ جائیں گی"

اللہ معاف کرے! یہ حیدر میاں جو ہر وقت میوزک سے الجھتے ہیں، ضرور ہمارے بے شمار میوزک کنسرٹس میں شرکت کرنے کا شاخسانہ ہے۔ ہم محو حیرت ہیں کہ کس کی خباثت کی شعاعیں ہم تک پہنچیں؟ ابرار الحق؟ نہیں وہ تو کچھ معصوم ہی دکھتے تھے۔ فاخر؟ نہیں بھئی ان کی بہن تو سہیلی تھیں ہماری۔ ہو نہ ہو یہ عارف لوہار ہوں گے، اللہ ان سے پوچھے۔

لیکن ایک بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ ہماری اماں تک کس کی خباثت پہنچی کہ ہم ایسے ہوئے۔ دادی سے کیسے سوال کریں کہ ابا جب بطن میں تھے تو وہ کہاں گھوما کرتی تھیں؟

اور سنیے

" اب سائنسی خبر سنیے! ایک گورے جوڑے کے ہاں کالا لڑکا پیدا ہو گیا۔ یہ میں سائنس کی بات بتا رہا ہوں۔ تو بھئی سب کو بڑی حیرانی ہوئی کہ گورے ماں باپ کے ہاں کالا یعنی نیگرو کیسے پیدا ہوا۔ جب ریسرچ کی گئی تو پتہ یہ چلا کہ ایک کیلنڈر پہ نیگرو کی تصویر ٹنگی ہوئی تھی اس کمرے میں جہاں ہونے والی ماں سوتی تھی۔ صبح جب وہ اٹھتی تھی تو اٹھتے ساتھ ہی وہ تصویر دیکھتی تھی تو اس کے اثرات کی وجہ سے بچہ کالا پیدا ہوا۔

لیجیے یہ خوشخبری نہ صرف آپ کے لئے بلکہ ان تمام بدنصیبوں کے لئے جو رنگ کی تفریق سے ہونے والی ناانصافیوں کا شکار ہیں۔ سو اگر آپ کو انجلینا جولی، بریڈ پٹ، کیٹ ونسلیٹ، لیونارڈو ڈی کیپریو یا کسی بھی اور جیسا بچہ چاہیے تو لٹکائیے ان سب کی تصویریں ارد گرد اور گھوریے دن رات۔ دیکھیے اب یہ خود ان سے پوچھ لیجیے کہ غیر مردوں کی تصویروں پہ بھی وہی کلیہ لاگو ہو گا کہ نہیں۔

ایک بات کی وضاحت درکار ہے کہ وہ سب کالی عورتیں جو مغرب میں سفید فاموں کے بیچ بستی ہیں، کیا ان کی آنکھوں پہ نو ماہ پٹی بندھی رہتی ہے، جو اگلی نسل پھر وہی نیگرو کی نیگرو۔ ارے معاف کیجیے گا، یہ لفظ اگر ہمارے بچوں نے سن لیا تو بگڑ جائیں گے۔ تین گھنٹے کا لیکچر تو کہیں نہیں گیا کہ کہ اماں، خدا کے لئے یہ لفظ نسلی تفاوت کی پہچان ہے اور اس لفظ کے استعمال پہ ہر ذی عقل اور ذی ہوش کو شرمندہ ہونا چاہیے۔ اب خدا کرے، بچے کہیں مولانا کی وڈیو نہ دیکھ لیں ورنہ ان کے اقوال زریں سمجھنے سے پہلے ہی بگڑ بیٹھیں گے۔

مولانا نے تصویر کے اثرات کے علاوہ بھی ترکیب بتائی ہے،

"گورا بچہ اگر چاہیے تو ماں کو چاہیے کہ حمل کے دوران ناریل خوب کھائے، ارے بھائی، یہ سب سائنس ہے"

لگتا ہے مولانا کو ہندوستان چھوڑے زمانے ہو گئے اور یادداشت میں کچھ بھول چوک ہو گئی۔ چلیے کوئی بات نہیں عمر کے بھی تو کچھ تقاضے ہوا کرتے ہیں۔ ہندوستان میں کیرالہ، گجرات، سورت اور کلکتہ میں رہنے والوں کا من بھاتا کھاجا ناریل ہے، ہر وقت اور ہر

کھانے میں۔ اب اگر پھر بھی دور دور تک اصلی رنگت نظر نہیں آتی تو یقیناً ان کی نیت میں فتور ہو گا، مولانا کی کہی بات تو سائنس ثابت کر چکی۔ اب آپ اعتراض کرنے والے کون؟

"دیکھو ساعتیں مقرر کی گئی ہیں، جن میں اگر آپ دلہن کے پاس چلے جائیں تو بچہ گونگا پیدا ہو سکتا ہے، بہرا پیدا ہو سکتا ہے، بچے کے اعضا نامکمل رہ جائیں گے۔ اسی لئے ایسے بچے پیدا ہو رہے ہیں، کسی کا کان نہیں ہے، کسی کا اور کچھ نہیں ہے۔ اسی لئے جنسی عمل کا دن اور وقت مقرر کیا گیا ہے اللہ کی طرف سے"

ہمارا جی چاہتا ہے کہ امریکہ سے جان ہاپکنز یونیورسٹی والے آئیں اور مولانا کی گرانقدر خدمات حاصل کر کے اپنی درسی کتابوں کو مولانا کے علمی معیار کے مطابق ترتیب دیں۔ ان معلومات کو جینیٹکس کے سلیبس میں ڈال کے ہی نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہو گا۔

ارے ایک بات تو بھول گئے، جفتی کی یہ مبارک ساعت مولانا نے بتایا نہیں کہ قمری تقویم کے مطابق ہو گی یا فرنگیوں کی شمسی تقویم بروئے کار لائی جائے گی۔ خدا کرے کہ قمری حساب سے دو دلوں کے ملنے اور پھول کھلنے کی بشارت دی گئی ہو۔ پھر تو مفتی منیب مدظلہ کے عیش ہو جائیں گے۔ ابھی رمضان اور عید پر نخاس کا اہتمام ہوتا ہے۔ پھر ہر جوڑے کے لئے الگ سے رویت ہلال ہو گی۔ وہی رانی توپ جیسی دوربین سے۔ ہر شام ریڈیو پر "دو ستاروں کا زمیں پر ہے ملن آج کی رات" کی دھن چھیڑی جائے گی۔ اناؤنسر شرماتے لجاتے ہوئے اعلان کرے گی کہ کراچی کے رہنے والے اپنے مقامی وقت کے مطابق علامہ ضمیر اختر نقوی سے رجوع فرمائیں۔ واللہ ہمارا دیس پھولوں کی نگری بن جائے گا

ہمیں مولانا سے صرف اتنا کہنا ہے کہ للہ ہمیں اپنی شاگردی میں قبول کیجیے۔ ہم اپنی تمام ڈگریاں جلانے کو تلے بیٹھے ہیں اور تیس سالہ تجربے پہ تو ہم لعنت بھیجتے ہیں۔

مولانا ضمیر اختر نقوی عرف "یہ تو ہو گا"، زندہ باد!

۔۔۔کی گود میں حور دیکھ کر

"پردہ ہٹے گا آہستہ آہستہ، سامنے تخت پہ ایک لڑکی کہنی سے ٹیک لگائے نیم دراز ہو گی۔ اس کے جسم پہ سو جوڑے ہوں گے، ہر جوڑا الگ نظر آتا ہو گا۔ ہر جوڑے کے لحاظ سے چہرے پہ میک اپ کی لہریں لگی ہوں گی۔ ہر جوڑے کی خوشبو الگ مہک رہی ہو گی۔ ہر جوڑے کا ڈیزائن الگ الگ نظر آئے گا۔ میرے کرتے کے نیچے بنیان نظر نہیں آتی (ہنسی) اس کے سو جوڑے الگ الگ نظر آئیں گے۔ سو جوڑوں کے پیچھے اس کا پورا جسم دکھے گا۔

جب اس پہ پہلی نظر پڑے گی تو آنکھیں پھٹ جائیں گی اور بندہ اسے بیٹھ کے چالیس سال دیکھتا رہے گا، پلک بھی نہیں جھپکے گا۔ آخر وہ بولے گی، آپ میرے پاس نہیں آئیں گے، دور ہی بیٹھیں رہیں گے۔

وہ جس نے دوزخ کے کالے کالے فرشتے دیکھے، وہ حور کو دیکھ کے پاگل نہیں ہو گا تو اور کیا ہو گا؟ اوو یکھی جاندا اے، وو یکھی جاندا اے (ہنسی)...

پھر وہ کہے گی، میرے سرتاج، میرے آقا، میرے پاس تشریف لائیں، آپ دور ہی بیٹھ گئے ہیں۔ پھر اس کو ہوش آئے گا اور اس کے پاس جائے گا۔ یہ جنت کا نچلا درجہ ہے!

اگلے درجے میں شراب بھی ہے، کباب بھی ہے، پھل بھی ہے اور جنت کی خوبصورت لڑکی۔ جو بنی ہے انگوٹھے سے گھٹنے تک زعفران سے، گھٹنے سے سینے تک مشک سے، سینے سے گردن تک عنبر، گردن سے سر تک کافور۔ چار خوشبوؤں سے گندھی ہے۔

اس کا قد ہے ایک سو تیس فٹ، سر کے بال چوٹی سے آتے ہیں آبشار کی طرح اور ایڑیوں کا بوسہ لیتے ہیں۔ ایک سو تیس فٹ لمبے بال اور اس میں موتی ہیرے جڑے ہوئے۔

جب سر گھماتی ہے تو بال چاروں طرف بکھر جاتے ہیں، پوری جنت میں جگمگ جگمگ بجلیاں چمکنے لگتی ہیں۔ ایک مسکراہٹ سے جو نور نکلتا ہے، ساری جنت کو روشن کر دیتا ہے۔ قدم اٹھاتی ہے تو ایک لاکھ ناز و انداز اپنے خاوند کو دکھاتی ہے۔ ایک سو تیس فٹ لمبی لڑکی، تہاڈا قد پانچ فٹ دس انچ، چھ فٹ، تہانوں تے بوجھے وچ پا کے بہے جاوے گی (تم لوگوں کو تو جیب میں ڈال لے گی) (لوگ ہنستے ہیں)

فیر ویکھے گی میرا ہسبنڈ بجے پاسے، کھبے پاسے (پھر ٹٹولے گی میرا خاوند دائیں طرف ہے یا بائیں طرف۔ (جیبیں ٹٹول کے دکھائی جاتی ہیں، لوگ ہنستے ہیں)

"تمہیں لوریاں دے رہی ہو، گود میں بٹھا کے (لوگ ہنستے ہیں)۔ ارے میں قربان جاؤں، اللہ تمہیں بھی ایک سو تیس فٹ کا کر دے گا"

اور سنیے!

" جنت کی لڑکی، تم نے اس کو یوں دیکھا تو تمہیں اس کے حسن کا ایک لیول نظر آیا، ایک دو سیکنڈ کے بعد پھر دیکھا تو رب کی قسم، اس کا حسن ہزاروں گنا بڑھا ہوا پایا۔ لہذا ہزاروں سال اسے دیکھتا رہ تو لذت ختم نہیں ہو گی۔ نہ کھانا یاد رہے گا، نہ پینا یاد رہے گا بس دیکھتے رہو تو پلانے والیاں یہ ہیں۔"

"جنت کی لڑکی اگر فنگر ٹپ دکھا دے تو سورج نظر نہیں آئے گا۔ جس کی فنگر ٹپ ایسی ہے اس کا چہرہ کیسا ہو گا؟ مستورات بھی سن رہی ہیں، سو ڈپریس نہ ہوں۔ ایمان والی عورت اس سے ستر گنا زیادہ خوبصورت ہو گی وہ عورت جو نماز پڑھے، روزہ رکھے اور گناہوں سے بچے"

مزید سننا چاہتے ہیں،

" رات حور کو میں نے خواب میں دیکھا، اب بھی دیکھ رہا ہوں، میرے رب کی قسم، میں کیسے بتاؤں کیا حسن تھا جو اللہ نے مجھے دکھایا، اس کی مسکراہٹ.... ہائے ہائے ہائے...(ہنسی) اگر وہ دنیا میں ہوتی تو میں فوت ہی ہو جاتا۔ اللہ نے جنت کی لڑکی کو ایسا حسن و جمال دیا ہے کہ اگر موت مر نہ گئی ہوتی اسے دیکھ کے آنکھیں برداشت نہ کرتیں، کلیجے پھٹ جاتے، مر جاتے"

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں ۔۔۔ کیا کمال کے مناظر باندھتے ہیں حضرت!

آنکھوں کو گھما گھما کے اشتیاق کو بڑھاوا دیتے ہوئے، شرارتی ہنسی بکھیرتے اور ذو معنی جملے بولتے ہوئے لاکھوں کے مجمعے میں مسجد کے منبر سے اس پاکیزہ گفتگو کرنے والے کا کہنا ہے کہ کرونا کی وبا اس لئے بھیجی گئی کہ ملک میں بے حیائی اور فحاشی پھیل گئی ہے۔ ہم سر دھنتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ حضرت واقعی سادہ لوح ہیں؟ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا"۔ کاش کبھی اپنی تقریروں کے وڈیو کلپس خود بھی سن لیا کریں۔

حضرت کی سادہ لوحی تو ان کی مستقل مزاجی سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اسلام آباد میں چونکہ اسلام کا لفظ آتا ہے سو وہ وہاں کے مکینوں سے خاص الفت رکھتے ہیں۔ انہیں اس امر سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کون آیا اور کون گیا۔ وہ اپنی وارفتگی میں اعلی کرسی کے گرد ہی منڈلانا پسند فرماتے ہیں۔ خطابت میں کمال تو ہے ہی، اسلام آباد والوں کی فرمائش پہ بالکل ویسے ہی آنکھ سے نیر بھی بہاتے ہیں جیسے کبھی ریڈیو سے فوجی بھائیوں کا پروگرام پیش کیا جاتا تھا۔

نیر بہانے کے علاوہ ان کی آنکھوں میں بے ساختہ ایک الوہی چمک آ جاتی ہے جب وہ جنت کی لڑکی کے جسم کی ساخت بیان کرتے ہیں۔ وہ لڑکی جس کا دیدار اکثر اوقات اپنے خواب میں بھی کرتے ہیں اور وفور مسرت سے ان کی خوشی چھپائے نہیں چھپتی۔

موجودہ وزیراعظم بھی تائب ہونے کے بعد تسبیح کے دانے پھیرتے ہوئے حضرت کے مصاحبین میں شامل ہیں سو حضرت کی رہنمائی اکثر و بیشتر حاصل کرتے ہیں۔ جنت کی لڑکی کا تذکرہ تو ہوتا ہی ہے، مسجد بند کرنے اور کھولنے کا مشورہ بھی لے لیا جاتا ہے۔

حضرت کا کہنا یہ ہے کہ آخر مسجد کیسے بند کی جا سکتی ہے؟ بھلا جس دن نمازیوں کو جنت کی لڑکی کا روح پرور نظارہ نہیں پیش کیا جائے گا، نماز میں بھلا کیا لطف رہے گا۔ نماز کا خشوع و خضوع اور آنکھیں میچ کے جنت کا تصور تو جنت کی لڑکی کے سہارے ہی تو قائم ہے۔

انہیں سپر سٹارز کو اسلام کی طرف مائل کرنے اور اسلامی روپ عطا کرنے میں ملکہ حاصل ہے۔ وہ ان کی تاک میں رہتے ہیں کہ کب ان بھٹکے ہوؤں کو حرام کاموں سے بچا کے

انہیں جنت کا رستہ دکھایا جائے۔ اس سلسلے میں جنت کی لڑکی کے حسن وجمال کا تفصیلی ذکر بہت کام آتا ہے اور ہمارے نامور گلوکار اور کرکٹر دنیاوی بیوی کے ہاتھوں تنگ، فوراً ڈاڑھی رکھ کے جنت کی لڑکی کا سودا پکا کرتے ہیں۔

انہیں اداکاروں (بالخصوص طبقہ اناث) سے بھی خاص ہمدردی ہے سو وہ نامور اور کچھ معاملات میں شہرت یافتہ شخصیات پہ خاص دست شفقت رکھتے ہوئے انہیں سیدھی راہ پہ لانے کے لئے ان سے ملاقاتیں کرتے ہیں۔ پھر کسی پادری کی طرح ان کی توبہ قبول کرتے ہوئے اُن کے گناہ بخشے جانے کی نوید سناتے ہیں۔

ہمیں ان کے معتقدین پہ ترس آتا ہے جو ان کے جنسی لذت سے بھرپور ورس کی لذت جسم وجاں میں اندھی عقیدت سے انڈیلتے ہیں۔ زبان سے رالیں اور آنکھ سے خواہش کی ہوس ٹپکاتے ہیں اور ان خوابوں میں کھو جاتے ہیں جن کا سرا جنت کی شراب، کباب اور حور کے شباب سے جڑا ہوتا ہے۔ اب یہ ہمیں معلوم نہیں کہ کتنے لوگ ان خوابوں کی تعبیر یہیں پا لیتے ہیں ویسے مدرسے اور مولوی کی کہانیاں کسی سے چھپی ہوئی تو ہرگز نہیں۔

حضرت کے وڈیو کلپس دیکھتے ہم پہ تین کیفیات طاری ہوئیں۔ ایک تو اپنے عورت ہونے پہ گھن آئی، دوسرے ہمیں ایسی جنت میں ہرگز نہیں جانا جہاں لڑکیوں کا کام سوائے اس کے کچھ اور نہیں کہ بن سنور کے مردوں کو رجھایا جائے۔

اور آخری کیفیت یہ سوچتے ہوئے طاری ہوئی کہ اگر ابا آج زندہ ہوتے اور ان حضرت کا جنت کی لڑکی کے بارے میں بیان مسجد کی اول صف میں بیٹھ کے سنتے ہوئے خوشی سے سر دھن رہے ہوتے... واللہ ہم انہیں کبھی معاف نہ کرتے!

گولڑہ شریف کے تین بھائی اور ایک بہن

عورت مارچ سے چہار سو گونجتے متنازع نعرے "میرا جسم، میری مرضی" کے بعد ہم پہ ایک شکریہ واجب ہو گیا ہے!

اور یہ شکریہ ادا کرنا ہے گولڑہ شریف راولپنڈی کے رہائشی ان باریش بھائیوں کا جنہوں نے ثابت کر دیا کہ اس نعرے کی صداقت اور اصلیت کیا ہے اور ہمارے معاشرے کی مجموعی حمیت وغیرت کہاں کھڑی ہے؟

خبر پچھلے برس کی ہے لیکن جب بھی پڑھیں جسم وروح کو ریزہ ریزہ کرتی ہے۔ دل تھام کے سنیے: تین سگے بھائی، عمریں تیئس سے تیس سال کے درمیان اپنی چودہ سالہ معصوم بہن کے جسم کو کئی برس تک اپنی ہوس کا نشانہ بناتے رہے۔ یہ بھی جان لیجئے ان تین میں سے ایک بھائی دینی مدرسے کا استاد تھا۔ چوتھا بھائی جو ٹانگوں سے معذور تھا اس کار خیر میں حصہ نہ بٹا سکا۔

پانچ بھائیوں اور چار بہنوں پہ مشتمل اس خاندان نے اس درندگی سے کیسے پہلو تہی برتی؟ ننھی معصوم بہن کو اس ظلم پہ کیسے خاموش کروایا گیا؟ یہ تو علم نہیں لیکن خبر شنید ہے کہ مذہب اور مقدس کتابوں کا حوالہ اس معصوم کی زبان بندی کے لئے استعمال ہوا۔ نہ معلوم یہ حوالہ ہابیل وقابیل کے درمیان پائی جانے والی چپقلش کے بارے میں تھا یا کچھ اور؟

عورت کے جسم پہ کس کا حق ہے اور کس کی اجارہ داری، غاصب یہ بات نہیں سمجھنا چاہتا، چاہے لہو کی ڈوری میں ہی بندھا کیوں نہ ہو۔ شاید اس واقعے کی تفصیل جاننے کے

بعد کچھ مرد وزن سمجھ جائیں جو اس نعرے کو فحش ثابت کرنے کے لئے زبان کی دو دھاری تلوار استعمال کر کے کشتوں کے پشتے لگانے میں مصروف ہیں۔

ہمارا دل اس معصوم بچی کا وڈیو کلپ دیکھ کے خون کے آنسو رو اٹھا اور مانو ہر رشتے پہ سے ایمان سا اٹھ گیا۔ وہی ہوا نا کہ عورت صرف جسم کا نام ٹھہرا۔ مذہب، معاشرہ، اخلاق سب گڈمڈ ہو گئے۔

انسان جب کسی مذہب کے بنا جنگلوں میں بسیرا کیا کرتا تھا تب بھی انسانیت و حرمت کے بنیادی اصول کی پاسداری ہوا کرتی تھی۔ ایک ہی ماں باپ کے گھر جنم لینے والوں کے درمیان جنسی تعلق قائم ہونا انسانیت سے گرا ہوا فعل ہے، حضرت انسان کو اس کا ادراک تب بھی تھا۔

اس حرمت کی بے حرمتی کا ذکر تاریخ میں Incest کے نام سے فرعونوں کے زمانے سے ملتا ہے جب بادشاہت کو محفوظ کرنے کے لئے بہن بھائیوں کی شادی کی جاتی تھی۔ مشہور فرعون طوطن خامن اس سلسلے کا ایسا فرد ہے جس کے ماں باپ بھی بہن بھائی تھے اور اس نے خود بھی بہن سے ہی شادی کی۔ مصر کی مشہور عالم کلیوپیٹرا کی شادی اپنے چھوٹے بھائی سے ہوئی اور ان دونوں کے ماں باپ بھی بہن بھائی تھے۔

الہامی کتابوں نے اصول واضح کر دیئے کہ خونی رشتوں میں اختلاط کی انسانیت میں کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن آج کے اسلامی جمہوریہ پاکستان میں نظریہ ضرورت خونی رشتوں اور اخلاقیات کی کیسے دھجیاں اڑاتا ہے، اس کی جھلک ہم تک اکثر و بیشتر پہنچتی رہتی ہے۔

کیا اس چودہ سالہ معصوم یتیم بچی کی بے کسی اور اذیت کا اندازہ کوئی ذی شعور لگا سکتا ہے جب کسی ظالم لمحے میں اپنے باپ جیسے بھائی نے اس کا ہاتھ پکڑا ہو گا، اسے بے لباس کیا ہو گا، اپنے بھاری ہاتھ کو اس کے منہ پہ جما کے اس کی چیخوں کا گلا گھونٹا ہو گا۔ وہ معصوم جو ابھی اس تعلق کی کھٹنائیوں کو صحیح سے جانتی بھی نہیں، اس کو کس اذیت کا سامنا کرنا پڑا ہو گا۔ کیا وہ تکلیف کے ان لحات میں سوچتی ہو گی کہ میں کس دنیا کی باسی ہوں؟ کیا اس جگہ کو جنگل کہتے ہیں؟ لیکن سنا ہے کہ جنگلوں کا بھی کوئی قانون ہوا کرتا ہے۔

اگلی صبح اسی بھائی نے اسے کس نظر سے دیکھا ہو گا؟ دن کی روشنی میں لاڈلی چھوٹی بہن کے لاڈ اٹھانے والا رات کو اس کے جسم کو ایک اجنبی عورت سمجھ کے کھیلنے والا اپنے آپ کو کیا کہہ کے مطمئن ہوتا ہو گا۔

جیسے کوڑھ کی بیماری ایک سے دوسرے کو لگ کے جسموں کو پیپ کے پھوڑے میں بدل دیا کرتی ہے، اس ذہنی دیوالیہ پن کے جراثیم نے باقی دو بھائیوں کو بھی جکڑا ہو گا۔ مفت کے مال نے، چاہے اپنے گھر کا ہی ہو، انہیں ویسے ہی وحشی اور بدمست کیا ہو گا۔ رات کی تاریکی میں جانوروں کا کھیل کھیلنے والے دن کی روشنی میں مذہب کا لبادہ اوڑھ کے کس طرح اپنے آپ کو بری الذمہ کرتے ہوں گے، بہن کی مشترکہ ملکیت کے بارے میں کیسے ایک دوسرے سے نظریں ملاتے ہوں گے، بخدا ہم سمجھنے سے قاصر ہیں۔

کئی برس یہ شرمناک کھیل کھیلنے کے بعد اب ان بھائیوں کے پاس تو شاید چلو بھر پانی کے برابر بھی شرم موجود نہیں کہ معافی کی طلبگار ہیں۔ نہ جانے کیسے ابھی تک زندہ رہنے کی تڑپ باقی ہے، شاید ڈھٹائی اپنے اعلی درجے پہ ہے۔ سفوکلیز کے کھیل ایڈی پس میں مردانہ کردار نے غلطی سے اپنی ہی ماں سے شادی کر لی تھی تو مارے شرمندگی کے اپنی آنکھیں نوچ ڈالی تھیں۔ ہمارے پاس انتون چیخوف کا قلم نہیں ہے۔ اس نے تین بہنوں کے نام سے ایک تمثیل لکھی تھی۔ ہمیں چیخوف کا قلم نصیب ہوتا تو ہم نے " تین بھائی " کے عنوان سے گراوٹ کی یہ حکایت لکھی ہوتی۔

ہمارا خیال ہے کہ ان تینوں کو باقی ماندہ عمر کاٹنے کے لئے چڑیا گھر کے پنجرے الاٹ کر دینے چاہئیں۔ خلق خدا کم از کم یہ تو جان لے کہ جسم اور مرضی کو خاطر میں نہ لانے والے کس طرح کے ہوا کرتے ہیں۔ اور شاید اس وسیلے سے ہم درمیان کچھ لوگ " میرا جسم، میری مرضی کا مفہوم بھی جان لیں۔

آدم بو نہیں، عورت بو

"اور جب وہ ناک سکیڑتا اور چلاتا، آدم بو، آدم بو "

تو ہمارا دل وہیں بیٹھ جاتا!

اوہ خدایا، آخرکار ظالم جادوگر اور جنوں کے گروہ نے مظلوم شہزادے کا سراغ لگا لیا جو شہزادی کو ڈھونڈنے نکلا تھا۔ اب کچھ ہی دیر میں وہ اسے کھوج نکالیں گے، کچا چبا جائیں گے اور شہزادی ساری عمر قید میں گزار دے گی، کبھی اپنے گھر واپس نہ جا سکے گی۔

ہمارا ننھا سا دل سہم جاتا، ہمارے آنسو ٹپ ٹپ گرتے، غم کا بادل چھا جاتا اور ہم بستر میں منہ چھپا کے خوب روتے۔

یہ ہمارا بچپن تھا، ہمارا گھر کتاب دوست گھر تھا جہاں ہر عمر کے پڑھنے والوں کے لیے سب ساماں میسر تھا۔ طلسم ہوشربا میں امیر حمزہ کی بہادری کے ہم مداح تھے اور عمرو عیار کی عیاریاں ہمیں مزا دیتی تھیں۔ ان کتابوں میں پائے جانے والے وہ سب شہزادے شہزادیاں ہمارے ساتھ بڑے ہوئے یا یوں کہیے کہ ہم ان داستانوں کے ساتھ بڑے ہوئے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں جب سب کزنز اکھٹے ہوتے، ہماری فرمائش پہ ایک کھیل ضرور کھیلا جاتا جس میں ہم ہمیشہ شہزادی بنتے۔ ہمارے کزن شفقت کو اکثر دربان کا کردار ملتا اور انہیں آج تک اس کا گلہ ہے۔

آدم بو، آدم بو کہنے والے انہی داستانوں کے کردار تھے اور یہ فینٹسی کی دنیا تھی۔ بچپن بیت چکا، زندگی کی تیز دھوپ میں فینٹسی کی حقیقت کھل چکی۔ لیکن ہمیں جانے کیوں ایسے محسوس ہوتا ہے کہ طلسم ہوشربا کے دروازے کھل چکے اور داستانوں کے اوراق سے

ایک نہایت بدصورت اور خوفناک مخلوق آزاد ہو کے ہر طرف بلا جھجک، آزادی اور اختیار سے پھر رہی ہے، ناک سکیڑے ہوئے، سونگھنے کی بھرپور کوشش، عیار آنکھیں گول گول گھماتی، شکار کو ڈھونڈتی اور منہ پہ الفاظ ہیں،

"عورت بو، عورت بو"

دن رات ریپ کے واقعات، چھوٹی بچیوں سے زیادتی، چھوٹے بچوں کی معصومیت کی تباہ کاری، اجتماعی زیادتی کی شکار عورتیں، منہ پہ تیزاب کا شکار عورتیں، سڑکوں پہ بھوکی نظریں، بسوں میں سانپ جیسے رینگتے ہاتھ، دفتروں میں ٹپکتی رالیں، سینیئرز کا اپنی پوزیشن سے فائدہ اٹھانے کا شوق، محفلوں میں معنی خیز الفاظ، گھروں میں بڑھتے ٹھرکی رشتے دار، بھوکے ملازم، جوانی کی سرحدوں پہ قدم رکھتے گزنز!

ایک ہی خیال ہے، ایک ہی بھوک ہے، ایک ہی بو ہے جس کا تعاقب ہے،

"عورت بو"

آپ یقین جانیے یہ سب دیکھ کے، محسوس کرتے ہوئے میں شدید مایوسی کے اندھیروں میں ڈوب جاتی ہوں۔ خود بھی عورت ہوں اور دو بیٹیوں کی ماں بھی۔ نہ اپنی مرضی سے پیدا ہوئی اور نہ ہی اپنی مرضی سے اس جسم کی مالک بنی۔ اردگرد جو شکاری گھوم رہے ہیں وہ بھی اسی جبر کی پیداوار ہیں، نہ اپنی مرضی سے آئے اور نہ ہی اپنی مرضی سے جسم کے مالک!

پھر ایسا کیا کہ ان کے دماغ پہ ہمہ وقت ایک ہی طلب، ایک ہی نشہ!

اور یہ بات بھی تو سمجھنے والی ہے کہ کائنات بنانے والے نے ہر مخلوق کو ایک اصول کے تحت پیدا کیا۔ جانور میں طلب ڈالی مگر عقل کے بنا، وہی طلب حضرت انسان میں پر عقل کی پاسبانی کے ساتھ۔ پھر ایسا کیا ہوا، کہ عقل ہوئی تماشائے لب بام اور خواہش ہے کہ عورت بو، عورت بو پکارتی تباہی کی منزلیں طے کر رہی ہے۔

کیا مرد کی خواہش اس قدر شدید ہے جو اسے سب اخلاقی حدود و قیود بھلا کے جانور بننے پہ مجبور کر دیتی ہے؟

کیا وہ سب جانور بننے والے مرد کہیں اور کسی اور مقام پہ باپ، بھائی، شوہر کہلائے جاتے ہیں؟

کیا وہ سارے مرد جو ایک اجنبی عورت کو دیکھ کے اپنی طلب کو قابو نہیں کر پاتے، اپنے گھر کی عورت پہ کسی اور کی ایسی نظر برداشت کر سکتے ہیں؟

کیا کبھی کسی مرد نے عیاشی کے ان لمحوں میں یہ سوچا کہ کبھی کہیں اور ان کی بیٹی بھی کسی اور مرد کے رحم و کرم پہ ہو سکتی ہے؟ جو بد فعل کسی دوسری عورت کو دیکھ کے کرنے کی چاہت ہے، وہ کوئی ان جیسا کہیں اور چاہ رہا ہو گا۔

ہمارے خیال میں طوائفی کردار کے مالک یہ مرد اپنے گھر کی عورت کو سات پردوں میں رکھنے کا انتظام کرتے ہیں۔ گھر کی بلند و بالا دیواروں میں مزید سلاخیں لگواتے ہیں، عورت کی آواز تک دفن کر دیتے ہیں اور پھر باہر گندی گرسنہ نگاہوں سے دامے درمے سخنے شکار کرتے ہیں، جس کو جتنا موقع مل سکے اور حد تو نپلا آسمان ہے۔

سوال یہ ہے کہ مرد کیوں اپنے آپ کو عورت کی عزت کرنے کی اخلاقی ذمہ داری سے آزاد سمجھتا ہے؟ وہ کیوں ہر عمل میں آزاد ہے؟ وہ کیوں یہ فرض کیے بیٹھا ہے کہ جو چاہے، جب چاہے عورت کے ساتھ کر گزرے۔ دنیا کا کوئی قانون، کوئی فلسفہ اور کوئی مذہب مرد کو ایسی کھلی چھوٹ نہیں دیتا۔ دنیا نہ تو جنگل ہے اور نہ ہی شکار اور شکاری کا کھیل۔

مرد اور عورت مہذب دنیا کے ایسے باسی ہیں جن کی عزت بنا کسی جبر اور بنا کسی تعلق کی بنیاد پہ ہوتی ہے۔ عورت برابری کی سطح پر خلق کی گئی ہے۔ دونوں کی ذمہ داری و اختیار کا دائرہ مختلف ضرور تھا مگر عورت کی دماغی اور تخلیقی صلاحیت کہیں کمتر نہیں تھی۔ مرد نے بقا کی جنگ میں جنگلی جانوروں کا شکار کرتے کرتے عورت کو بھی اسی قطار میں لا کھڑا کیا۔ نہ جانے یادداشت کا زائل ہونا تھا یا جسمانی قوت کا زعم، کہ وہ اپنی زندگی کے اولین ساتھی جو تخلیق کے وقت بھی ساتھ تھی، اسے بھی بھلا بیٹھا۔

اس سارے قصے میں ہنسی ان نیک بیبیوں پہ آتی ہے جو مرد کی اس بے راہروی کے جواز گھڑتے ہوئے عورت کو مورد الزام ٹھہرانے کی کوشش کرتی ہیں۔ جان لیجیے کہ آزاد اور کسی پرندے کی طرح آسمان کی بلندیوں پہ پرواز کرتی عورت انہیں بھی بھاتی ہے۔

لیکن کیا کیجیے کہ ان کے پر تو کاٹے جا چکے ہیں، خود ساختہ نیک پروین بننے کا جام شیریں پی چکی ہیں، معاشرے کے مرد کی تھپکی پشت پہ ہے۔ مرد سے نیک عورت کا تمغہ پانے کا لالچ، یا اپنی تشنگی دل کا علاج یہ ہے کہ اپنی ہی ہم نفس کو راندۂ درگاہ ٹھہرایا جائے۔ لباس سے لے کر پروفیشن سے ہوتے ہوئے، زندگی کے فیصلے آزادی سے لے لینے کی عیاشی سے لے کے اپنی ذات کے متعلق سوچنے تک، ہر پہلو سے سنگ باری کی جاتی ہے اور ایسی عورت کے ساتھ کیے جانے والے ہر سلوک اور طرز عمل کی توجیہ گھڑ کے مرد کو باعزت بری کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

معاشرے کو ایک طرز نو پہ رکھنا، کمزور افراد کے استحصال پہ نظر رکھنا اور بچاؤ ریاست کا کام ہوا کرتا ہے۔ لیکن کیا کیجیے کہ اس سارے قصے میں جنگل کے بادشاہ اور حواریوں کے دماغ میں بھی عورت کا وہی ایک کردار ہے، گھر کی چاردیواری کے اندر ایک قوت گویائی سے محروم ایک کھلونا۔ اور اس حد کو ماننے سے انکار پہ جنسی تشدد کی حقدار چاہے وہ کوئی کم عمر معصوم بچی ہی کیوں نہ ہو جو گلی کے نکڑ پہ ایک غبارے کی چاہ میں گئی ہو۔

سو عورت وہ بد قسمت مخلوق ہے جس کے لئے تاج محل جیسی یادگار جنم لے سکتی ہے۔ جس کی یاد میں ہسپتال بنایا جا سکتا ہے لیکن زندگی کی سنگلاخ راہوں میں اسے عزت کی نظر سے نہیں نوازا جا سکتا۔ اسے "عورت بو" کا شکار ہونا ہی ہے کہ شکاری ہر طرف اس بو کے تعاقب میں ہے آخر یہ ان چاہی مخلوق ہوس اور مفروضہ بالادستی کے کھیل میں روندے جانے ہی کے لئے تو تخلیق ہوئی ہے۔

کراچی میں نومولود بچیوں کا قبرستان اور پدرسری غنیم کا پیام

""کیا پدرسری، پدرسری کی رٹ لگا رکھی ہے، سنگ باری ہو رہی ہے، الزام و دشنام کی برسات الگ ہے۔ چھوڑو، یہ ٹیڑھے میڑھے الفاظ جو ہر دوسرے روز گھسیٹتی ہو۔ تمہاری اپنے پیشے میں اچھی عزت ہے، اسی کو نبھاؤ""

کسی مہربان نے مفت مشورہ دیا ہے!

اب کیا کہوں کہ یہ کہانیاں میرے ارد گرد چلتی پھرتی ہیں، کبھی ہنستی کبھی روتی ہیں۔ میرے کان میں سرگوشیاں کرتی ہیں، مجھ سے فریاد کرتی ہیں کہ ہمیں اپنے آنسوؤں میں پرو کے دل کے صفحے پہ اتار لو، اور اس معاشرے کے ناخداؤں کو ہمارے چہرے دکھاؤ۔ شاید کہیں کوئی پہچان و احساس کی رمق باقی ہو۔

یہ کہانیاں وہ چلتی پھرتی زندہ لاشیں ہیں جو جینے کا حق پیدا ہوتے ہی کھو دیتی ہیں۔ مردہ جسم مختلف کوڑا دانوں میں ملتے ہیں۔ حوا کی بیٹیوں کے لاشوں کو رات کے اندھیرے میں جانور بھی مال غنیمت سمجھتے ہیں۔

یقین نہیں آتا نا! میری بات دیوانے کی بڑ لگتی ہے۔

لیکن کیا کیجیے کہ حالیہ ایدھی رپورٹ کے الفاظ مجھے بچھو بن کے کاٹتے ہیں، میری روح انگاروں پہ لوٹتی ہے اور ان تمام لڑکیوں کی بے نور آنکھیں مجھ سے سوال پوچھتی ہیں کہ ان سے زندگی کیوں چھین لی گئی؟

ایدھی فاؤنڈیشن نے رپورٹ پیش کی ہے کہ 2019 میں 375 لاوارث نومولود بچوں کی قبریں کھودی گئی ہیں۔ ایک ہی برس میں اس تعداد میں دوگنا اضافہ ہوا ہے۔ کراچی میں ملنے والی ان عبرت کی نشانیوں میں اکثریت نومولود بچیوں کی تھی۔ اب یہ تو فہم ماننے

سے انکاری ہے کہ تمام مائیں جنہیں وقت کے کسی حادثے یا لغزش نے یہ مقام بخشا تھا، ان سب کی گود میں بچیاں آئیں تھیں۔

کون کہتا ہے کہ وقت بدل گیا، زمانہ آگے بڑھ گیا۔ جاہلیت کے دور ماضی کا حصہ ہوئے، جب گھر کے اندر ولادت کے بعد تھر تھر کانپتی ماں کے ہاتھ سے ستارہ آنکھوں اور پنکھڑی جیسی بچی کو کچھ شقی القلب ہاتھ چھین کے اس گڑھے میں اتارتے تھے جو پہلے سے کھود لیا جاتا تھا۔ بچی باپ کی انگلی پکڑ کے چومنے کی کوشش کرتی تھی، پر مسرت غوں غاں کر کے باپ کو بتاتی تھی کہ وہ دور، بہت دور سے اس کے آنگن میں کھیلنے آئی ہے، لیکن قفل پڑے دلوں کو کون کھول سکا ہے کبھی؟

عزت دار باپ کی زہر بھری گونگی بہری اندھی سوچ یہ ننھی سی جان کیا بدلتی سو یونہی چاند ستاروں کو دیکھتے دیکھتے آنکھوں کو مٹی ڈھانپ لیتی۔ کانوں میں دور جاتے قدموں کی چاپ ہلکی پڑ جاتی، ننھا سا گول دہانہ شیر مادر کی جگہ مٹی کا ذائقہ چکھتا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ وہیں پلٹ جاتی جہاں سے مالک کائنات نے بنا سنوار کے بھیجا تھا۔

سو پدر سری کے لشکر سے پیام عافیت دینے والے کو وہی جواب ہے جو احمد فراز نے ٹھیک 40 برس پہلے ایسے ہی کسی مہربان کو دیا تھا۔ پہلے چند سطریں اس نشیبی پیغام کی اور پھر فراز فصیل سے جواب۔۔۔

مرے غنیم نے مجھ کو پیام بھیجا ہے
کہ حلقہ زن ہیں مرے گرد لشکری اس کے
فصیل شہر کے ہر برج ہر منارے پر
کماں بہ دست ستادہ ہیں عسکری اس کے
اور پھر احمد فراز نے لکھا
سو یہ جواب ہے میرا مرے عدو کے لیے
کہ مجھ کو حرص کرم ہے نہ خوف خمیازہ
اسے ہے سطوت شمشیر پر گھمنڈ بہت
اسے شکوہ قلم کا نہیں ہے اندازہ

وقت بدل گیا! ارکیے! کیاوقت واقعی بدل گیا؟

اب انسانوں کے اس انبوہ میں گمنام رہنا ممکن ہو گیا ہے۔ کھدے ہوئے گڑھے کی جگہ کچرے کے ڈھیر نے لے لی جہاں ستاروں کی چھاؤں تلے، سرد ہوا میں کتوں اور جنگلی بلیوں کی منتظر آنکھیں ایک ان چاہی نووارد بچی کے آخری سانسیں گنتی ہیں۔ ستارے اپنا منہ چھپا لیتے ہیں۔ چاند بدلیوں کی اوٹ لیتا ہے، بدلیوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے ہیں۔ آسمان کا بس نہیں چلتا کہ زمیں پر گر پڑے۔ آوارہ جانوروں کی بھوک عروج پہ ہے، طعام کا بندوبست تو انسانیت کے نام لیواؤں نے کر دیا ہے، بس کچھ ہی دیر اور!

قبروں کی تعداد کہیں زیادہ ہو سکتی تھی مگر کیا کیجیے کہ کچھ سیانے اس انتہائی مقام عبرت کی نوبت ہی نہیں آنے دیتے۔ بیسویں صدی کی ٹیکنالوجی نے چودہ سو سال پہلے کا نقشہ لپیٹ دیا ہے جب وقت ولادت ماں ہچکیوں اور سسکیوں میں پناہ ڈھونڈتی تھی۔ اب چوتھے مہینے میں ہی الٹرا ساؤنڈ کے بعد ان چاہی لڑکی کا وجود کسی کانٹے کی طرح شکم مادر سے کھینچ کے علیحدہ کر دیا جاتا ہے اور ماں کی روح ان کانٹوں پہ گھسٹتے گھسٹتے تار تار ہو جاتی ہے۔ قتل وغارت گری کے لئے ضروری تو نہیں کہ میدان جنگ ہی سجائے جائیں۔

کبھی اس سے بھی بڑھ کے سوچا جاتا ہے جب معاشرے کے ناخداؤں کی جیب بھاری ہو۔ شکم مادر تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آ پاتی، اس سے پہلے ہی خرید وفروخت طے پا جاتی ہے۔ کسی لیبارٹری کی خورد بین کے نیچے اس سپرم کو دھتکار دیا جاتا ہے جو اپنے اندر عورت کی نمو کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس سپرم کو چن لیا جاتا ہے جس سے پدر سری کا نام و مقام اونچا رہے۔

اب سمجھ آئی آپ کو کہ پدر سری کی مخالفت میں نعرہ لگاتے ہوئے ہماری آواز کیوں رندھ جاتی ہے؟ یہ درد کیوں آنکھوں میں طغیانی لے آتا ہے؟ لیکن کیا کیجیے کہ دیکھنے والی آنکھ تو اپنی خواہشات کے پیچھے اندھی ہے اور ذہن میں اندیشے کھجوروں کی طرح پاؤں گاڑے بیٹھے ہیں۔

اسی لئے تو منٹو نے کہا تھا!

"ہر مرد عورت کے ساتھ سونا تو چاہتا ہے لیکن بیٹی کا باپ کوئی نہیں بننا چاہتا"

آپ کے گھر کھسرا پیدا کیوں نہیں ہوا؟

بہت بچپن کی یاد ہے۔ ہمارا گھر ایک بازار کے نزدیک تھا اور بازار میں خوب چہل پہل ہوا کرتی تھی، ہم نے بازار جانے کا شوق تبھی سے پال لیا تھا۔ جونہی دیکھتے کہ امی باہر جانے کے لئے تیار ہیں، ہم بھی جوتا پہننے کو دوڑ پڑتے۔ امی کی گھوریاں، ڈانٹ ڈپٹ، ابا سے سرزنش کی دھمکی، کچھ بھی ہمیں باز نہ رکھ سکتی۔

بازار کی رونق، گہما گہمی، آوازیں، راہگیروں کی دھکم پیل اور روشنیاں ہمیں خوب لطف اندوز کرتیں۔

ان تمام یادوں میں ایک یاد ایسی ہے جس نے ہمیں بہت حیران وپریشان کیا اور یہ حیرت بہت سالوں تک ہمارے ساتھ رہی۔ ہم دیکھتے کہ کچھ کیم وشیم خواتین زرق برق لباس میں خوب میک اپ اور زیورات پہنے، دوپٹہ گلے میں لٹکائے، جسم کے خطوط نمایاں، بازار میں آ جا رہی ہوتیں۔ یک لخت کہیں رکتیں اور انتہائی موٹی اور مردانہ آواز میں گانا گاتیں اور تالیاں بجاتے ہوئے اشارے کرتیں۔

ہمیں کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ یہ کون عورتیں ہیں جو بازار میں یوں آزادانہ گھوم رہی ہیں؟ ان کا حلیہ اس قدر مختلف کیوں ہے؟ آواز مردوں جیسی کیوں ہے؟ میک اپ کیوں گہرا ہے؟ لباس اس قدر شوخ اور تنگ کیوں ہے؟ وہ کیوں اٹھلا اٹھلا کر دکانداروں سے بات کرتی ہیں؟ جواب میں سب مردوں کی اتنی باچھیں کیوں کھلی پڑتی ہیں؟ ہم نے مردوں کو انہیں آنکھ مارتے اور چٹکی کاٹتے بھی دیکھا جس پر وہ قطعی برا نہ مانتیں اور زور زور سے ہنس پڑتیں۔

ہم امی سے بارہا پوچھنے کی کوشش کرتے کہ وہ کون ہیں؟ امی جواب دینے کی بجائے فوراً کوئی اور بات شروع کر کے ہمارا دھیان بٹانا چاہتیں- ایک آدھ دفعہ کے لئے تو ٹھیک تھا اور ہم بہل بھی گئے مگر اگلی دفعہ ان سوالوں کا سلسلہ پھر سے شروع ہو جاتا- جب ہماری پر تجسس طبیعت کسی طرح ہار نہ مانتی تو امی جھنجلا کے کہتیں "چپ ہو جاؤ، دماغ نہ کھاؤ"- بہر حال اس ساری کہانی میں ہمیں ایک نام ازبر ہو چکا تھا جو ہم نے کسی دکاندار کو کہتے سنا تھا اور وہ تھا "کھسرے"-

اب ہمیں لفظ کھسرے پہ مزید تحقیق کرنا تھی- ہم اپنے سوالوں کی بنیاد پہ خاندان میں "سوالیہ نشان" کے نام سے پکارے جاتے تھے- اب ہمارے پاس کھسروں کے متعلق سوال تھے- ان کو اس نام سے کیوں پکارا جاتا ہے؟ یہ کون ہیں؟ یہ اس حلیے میں کیوں ہیں؟ جس سے بھی پوچھا، جواب ملا، بچے ایسی باتیں نہیں پوچھتے، یہ تمہاری عمر نہیں ایسے سوال پوچھنے کی۔ مزید سوالوں کے جواب میں ایک زوردار ڈانٹ کھانے کو ملتی۔

کچھ برسوں بعد جب ہم میڈیکل کالج میں داخل ہوئے تو اس وقت تک اس معاشرتی المیے سے آگہی ہو چکی تھی کہ یہاں مرد و عورت کی شناخت کا مسئلہ ہے، ان لوگوں کی بنیادی شناخت دھندلی ہے- اگلے ہی لمحے دماغ نے سوال کیا کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ بھڑکیلے چیختے ہوئے رنگوں کے کپڑے، میک اپ سے لپا ہوا شیو زدہ چہرا، نقلی بالوں کی چوٹی، تنی ہوئی چھاتی، مردانہ ڈیل ڈول اور بھاری آواز کے ساتھ گانا بجانا کرتے ہوئے روزی کی تلاش۔

میڈیکل کی تعلیم نے بہت سے سوالوں کے جواب دیے- بچے کی ماں کے پیٹ میں نمو کے دوران، تمام اعضا کے ابتدائی تکمیل کے مرحلے میں بہت سی معلوم اور نامعلوم وجوہات کی بنیاد پر اعضا بننے کے عمل میں خرابی پیدا ہو سکتی ہے- نتیجے میں بچے میں گونگا پن، بہرہ پن، اندھا پن، لولا پن، لنگڑا پن، غرض کوئی بھی جسمانی کمی نظر آتی ہے- اسی طرح دماغی لحاظ سے خرابی کی صورت میں کم سمجھ، نا سمجھ، دیوانگی یا مجہول پن ملتا ہے-

بالکل اسی طرح کبھی کبھار جنسی اعضا میں کمی بیشی رہ جاتی ہے- کچھ میں جنسی اعضا واضح طور پہ بن ہی نہیں پاتے، کچھ میں ہر دو جنسی اعضا بن جاتے ہیں اور کچھ بچے اندرونی طور پہ ایک جنس اور بیرونی طور پہ دوسری جنس بن جاتے ہیں۔

یہاں یہ جاننا اہم ہے کہ سوائے جنسی اعضا کے ان کا سارا جسم اور دماغ ایک نارمل انسان کا ہوتا ہے- ایک ایسے انسان کا، جس کو بھوک بھی لگتی ہے اور پیاس بھی، ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی، بات کرنا بھی آتی ہے اور سمجھنا بھی۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب تمام خواہشات، احساسات، خیالات، جذبات اور ضروریات ایک عام انسان کی سی ہیں پھر ان لوگوں کو قبول کیوں نہیں کیا جاتا؟ جب والدین اپنے لولے، لنگڑے، کانے، مجہول بچے کو سنبھال لیتے ہیں تو جنسی اعضا کی خامی والے بچوں کے ساتھ یہ سلوک کیوں؟ کیا جنسی اعضا اتنے اہم ہیں کہ ان میں خامی والدین اور معاشرے دونوں کے لئے ناقابل قبول ہوتی ہے اور یہ دونوں ان بچوں کو خود ہی گالی بنا دیتے ہیں- نہ یہ زندوں میں رہتے ہیں نہ مردوں میں- گالیاں، کوسنے، تمسخر ان کا مقدر بن جاتے ہیں، دو وقت کی روٹی کے لئے معاشرہ پاؤں میں گھنگرو پہنوا دیتا ہے، سر پہ چھت بستی سے باہر دی جاتی ہے- اگر جذبات کا غلبہ ہو تو ہم بستری کے بعد بندوق کی گولی مقدر ہوتی ہے، خس کم جہاں پاک۔

اگر کوئی ان تمام صعوبتوں کے باوجود بھی زندگی کے سفر میں آپ کے ساتھ قدم ملانا چاہے تو یہ ممکن نہیں- مسجد میں داخلہ ممنوع، خدائے بزرگوار جس کے نزدیک سب ایک ہی منزل کے راہی ہیں، کا گھر دیکھنے کی اجازت نہیں ملتی- اور تو اور مرنے کی صورت میں کوئی مذہب کا ٹھیکیدار نماز جنازہ تک پڑھنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

کیا مسلمان ہونے کے ناتے ہمارا یقین نہیں کہ ہر مخلوق کا خالق خدا ہے- اگر وہی پالن ہار ہے تو اس کی تخلیق کو مسترد کرنا کیا ہمیں زیب دیتا ہے؟ کیا آج ہم سب جو اس خامی کا شکار نہیں کیا یہ ہمارا کریڈٹ ہے؟ کیا ہمیں یقین ہے کہ ہم اس آزمائش کا شکار نہیں ہو سکتے اور کوئی کھسرا ہم میں سے کسی کے گھر پیدا نہیں ہو سکتا؟

یہ بچے اس دنیا میں والدین کی جسمانی وابستگی کے نتیجے میں آتے ہیں۔ پھر یہ کہاں کا انصاف ٹھہرا کہ رحم سے نکلنے والے ناقص مال کو سڑک پہ پھینک دیا جائے اور کام کا مال سنبھال لیا جائے۔ ایسا کرنے والے کامیاب کاروباری تو ہو سکتے ہیں والدین نہیں۔

یہ وہ سوال تھے جو میں نے اپنے آپ سے بھی پوچھے اور اپنے ارد گرد والوں سے بھی۔

مگر کوئی جواب نہیں ملا!

کیا آپ کے پاس جواب ہے؟

عورت ہی عورت کی دشمن کیسے ہوتی ہے؟

شادی کی ایک تقریب تھی!

ہماری نشست کے قریب والی میز پہ کچھ ادھیڑ عمر خواتین آپس میں اپنے بچوں کی شادیوں اور اس سے پیدا ہونے والی صورت حال پہ گفتگو فرما رہی تھیں۔ آوازیں بہت اونچی تھیں سو بغیر کسی دقت کے کان تک پہنچ رہی تھیں۔

"میں نے تو اسد سے کہہ دیا، بڑی جان ماری ہے تجھے پالنے میں، راتوں کو جاگی ہوں۔ اپنے منہ سے لقمہ نکال کے تمہیں کھلایا ہے، اب یہ نہ ہو کہ بیوی آتے ہی ماں کی طرف سے منہ پھیر لو"

"ارے کہہ دینا تھا کہ دودھ نہیں بخشوں گی"

"کہہ دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ جنت نہیں ملنے کی اگر حکم عدولی کی"

"بہن میں نے تو وہ آیات رٹ چھوڑی ہیں جو ماں باپ کی خدمت کا حکم دیتی ہیں اور یہ بھی بتاتی ہیں کہ ان کو اف تک نہ کہو۔ جونہی مجھے لگتا ہے کہ بیٹا پٹڑی سے اترنے کو ہے فوراً سنا دیتی ہوں، تیر جیسا سیدھا ہو جاتا ہے"

"بالکل ٹھیک کرتی ہو، ساری عمر مشقت کر کے پالا ہے، عیش کے دن آئے تو کیا اس چھوکری کو سونپ دیں اپنا پلا پلایا بیٹا"

"میں تو وہ آیات بھی پڑھ دیتی ہوں جس میں بیوی کو مارنے کا حکم ہے"

"میں نے تو پہلے ہی دن کہہ دیا تھا دیکھو اکیلے گھومنے کی ضرورت نہیں، باہر جانا ہے تو سب اکٹھے جائیں گے"

"میں نے تو بہو بیگم کو بھی بتا دیا کہ زیادہ ہار سنگھار کرنے کی ضرورت نہیں، لڑکیوں والا گھر ہے، شریف گھرانوں میں یہ اطوار نہیں چلتے"

"ارے بہن میں نے تو اپنے بیٹے کو ہی سمجھا دیا کہ سر شام کمرے میں جانے کی ضرورت نہیں، گھر میں بہنیں ہیں آخر، سو جب پورا گھر سو جائے تب کمرے میں جانا"

"میں تو صبح پانچ بجے ہی دروازہ بجا دیتی ہوں کہ اٹھ کے نماز پڑھو"

"بہن کوشش کرو کہ زیادہ محبت نہ ہونے پائے دونوں میں، محبت ہو گئی تو ہمیں کہاں پوچھیں گے"

"اور کیا، الجھتے رہیں آپس میں، فائدہ تو ہمارا ہے نا"

"میں نے تو امجد کو سمجھا دیا، بیوی کو اپنی تنخواہ نہیں دینی، یہ بری عادتیں مت ڈالنا"

"جس دن بہو بیگم زیادہ مسکرا رہی ہوں، میں بھانپ جاتی ہوں آج شام کوئی پروگرام ہے۔ بس شام سے پہلے ہی میری طبعیت خراب ہو جاتی ہے پھر مجھے اکیلا چھوڑ کے تو نہیں جاسکتے نا"

"ارے ہمارے والی بڑی ہوشیار بنتی تھیں، علیحدہ ہو گئیں۔ ہم نے بھی شرط رکھ دی کہ صاحبزادے ہر ویک اینڈ ہمارے ساتھ گزاریں گے، بیٹے کو ماننی پڑی۔ بس اب وہ ویک اینڈ پہ گھر اکیلی پڑی رہتی ہے اور بیٹا ہمارے پاس"

"اچھا کیا، میں نے تو کہہ رکھا ہے کہ ہر شام اگر شکل نہ دکھاؤ تو مجھ مری کا منہ دیکھو۔ بس دفتر سے آتے ہی نکل پڑتا ہے ہماری طرف، پھر رات کا کھانا کھلا کے ہی بھیجتی ہوں"

"ارے میں روز یاد کرواتی ہوں ماں تمہیں ملے گی کہیں، ہاں بیویاں بہت۔ ایک نکل جائے تو دوسری لانا کیا مشکل"

"میں نے تو کہہ رکھا ہے کہ بہنوں کے حقوق ساری عمر پورے کرنے ہیں۔ وہ تیرا خونی رشتہ ہیں۔ بیوی تو ہوتی ہی غیر ہے"

"میں تو کہہ چکی ہوں، اگر بیوی کے لئے کچھ لاؤ تو بہنوں کے لئے بھی لازم لانا"

"ارے بہن، میں نے تو مرنے کے بعد تک کا انتظام کر رکھا ہے۔ بتا دیا ہے سارے بیٹوں کو، میرے بعد بڑی بیٹی کو ماں سمجھنا۔ بہو بیگم کیا سمجھتی ہیں، عیش کریں گی ہمارے جانے کے بعد"

"میرا بیٹا تو جب بیوی کو باہر اپنے پاس بلانے کی بات کرتا ہے میں صاف کہہ دیتی ہوں، میں پوتے کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم سال میں ایک دفعہ آ کے بیوی سے مل جایا کرو"

"بہت اچھا کیا، باہر جا کے ہمارے بیٹے کے پیسے پہ یہ منحوسیں کیوں عیش کریں۔ دیکھ لو دس برس ہونے کو آئے، میں نے بہو کو ساتھ نہیں جانے دیا"

ہم کچھ دیر تو ہک دک یہ گفتگو سنتے رہے۔ پہلے غصہ آیا، پھر رنج و تاسف نے گھیر لیا اور پھر یہ رنج ترس میں بدل گیا۔

کون تھیں یہ ادھیڑ عمر عورتیں؟

وہ بیٹوں کی مائیں تھیں یا اپنے مسخ ہوئے خوابوں کی قیدی؟ جو اپنی ہی اولاد کو شیریں لہجے میں دعائیں نوازنے کے ساتھ ساتھ بیٹوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے والی جیون ساتھی کے لئے زہر بنی بیٹھی تھیں۔

ان لمحات میں وہ مائیں نہیں تھیں، وہ عورتیں تھیں جن کی آنکھوں سے برسوں پہلے خواب نوچے گئے تھے۔ جن کے جسم و جان کو ننگے الفاظ اور تلخ رویوں کی بھٹی میں جلایا گیا تھا۔ ان عورتوں کے نازک جذبات و احساسات کو پاؤں تلے روندا گیا تھا۔ اس پدرسری معاشرے نے انہیں ذلت و بے بسی کا مشروب قطرہ قطرہ پلایا تھا۔

اب وہاں مائیں کہیں نہیں تھیں، وہاں لہولہان روحیں اپنے بھسم خوابوں، سنگلاخ رستوں پہ زخمی پنجوں کے بل مسافت طے کرنے والی کچھ مجبوریاں بیٹھیں تھیں۔ یادوں میں صرف نارسائیاں تھیں، دامن میں چھید تھے، دل خالی تھا۔ اب بہو کی کھلکھلاتی ہنسی انہیں اپنے آپ پہ گزرے عذاب یاد دلاتی تھی۔ وہ بھی تو کبھی ایسی ہی دلہن بنی تھیں، ان پہ بھی ایسے ہی کوڑے برسے تھے۔ ایسی ہی لپلپاتی زبانوں سے نکلے الفاظ نے جسم و روح کو نیلا کیا تھا۔ کبھی، وہ بھی پل پل مرتی تھیں، ایک دو دھاری تلوار تھی جس پہ تماشا دیکھنے والوں کے سامنے مصنوعی مسکان کے ساتھ چلی تھیں۔

وقت کا پہیہ گھوم چکا تھا۔ پدرسری معاشرے کا نظام انہیں نوچ نوچ کے نیم مردہ کر چکا تھا۔ وہ نظام جس میں مرد ایک عورت کو دوسری عورت پہ ظلم کرنے پہ مجبور کر دیتا ہے۔ عورت اس چکی میں پس کے اپنی ماہیت ہی تبدیل کر بیٹھتی ہے۔ اپنی بقا کے لئے اس نظام پہ ایمان لاتے ہوئے وہ عورت نہیں رہتی، اس نظام کا پرزہ بن جاتی ہے۔ اس کے اندر ایک عورت ہونے کی حساسیت اور دوسری عورت کے دکھ کو پہچاننے کی صلاحیت زندگی کے شروع میں ہی آرزوؤں کی چتا میں جل کے راکھ ہو جاتی ہے۔ وہ تمام عمر اختیار رائے اور اپنی مرضی کو ترستی ادھیڑ عمری کی منزل پہ پہنچ جاتی ہے۔

طاقت کے اس کھیل میں ماں نامی اس عورت کو اختیار ملنا صرف ایک مرد کے ذریعے سے ہی ممکن ہے، اور وہ ہے اس کا بیٹا۔ پدرسری نظام کا مرد بیٹا بن کے ماں پہ ترس کھانے کے ساتھ ساتھ جنت کے لالچ میں وہ سارے اختیار بخشتا ہے جو گزر جانے والے کل میں اس کے باپ نے چھین کے ایک عورت کو عضو معطل بنایا تھا۔ مرد بیوی کو اس پلڑے میں ڈالتا ہے جو ہلکا ہو کے کہیں خلا میں جھول رہا ہوتا ہے اور ماں کو دیوی بنا کے ایک ایسے طاق پہ رکھ دیتا ہے جہاں بیوی کو صبح شام دیوی کے چرن چھونے کا حکم ہے اور انکار کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی جاتی۔ ایسا کرتے ہوئے وہ بھول جاتا ہے کہ وہ کسی کو زندگی بانٹ رہا ہے اور کسی کو موت۔ زندگی کے سفر میں ساتھ چلنے والی عورت جو محبت کی چاہ میں ساتھ چلنے آئی تھی اسے ویسی ہی بے جان مورت میں بدل رہا ہے جیسی آج اس کی ماں ہے۔

پدرسری نظام میں پستے پستے عورت ایک زومبی کی صورت اختیار کرتی ہے اور زندگی کی آخری سیڑھی پہ کھڑی وقت کی دھول میں اپنا آپ کھوجتی ہے۔ اپنی بے نور آنکھوں سے یہ جان ہی نہیں پاتی کہ ابھی بھی وہ ایک مرد کے ہاتھ میں کھلونا بنی بخشے گئے اختیار کو ایک اپنی ہی جیسی کی زندگی میں زہر گھولنے کی ذمہ دار ہے۔

مرد اس دائرے سے باہر بیٹھا ایک زخموں سے چور چور ڈھلتی عمر کی عورت کو دوسری عورت سے نبرد آزما ہوتے دیکھ کے بالکل اسی سرور کے عالم میں رہتا ہے جب رومن بادشاہ اکھاڑے میں زندگی اور موت کی جنگ لڑتے کھلاڑیوں کو دیکھ کے حظ اٹھایا کرتے تھے۔ جانتے تھے کہ دونوں کا مقدر اذیت بھری موت ہے۔

اسی سرور کے عالم میں پدر سری نظام کا یہ مرد انگلی اٹھاتا ہے کہ ہم بے چاروں کا
نام تو ناحق بدنام ٹھیرا، اصل میں تو عورت ہی عورت کی دشمن ہے۔

کیا پانچ عورتیں مرد کا گینگ ریپ کر سکتی ہیں!

مجھے افسوس ہے کہ میں اس زمانے میں زندہ ہوں جب خلیل الرحمن قمر جیسے مرد بھی زمیں کا بوجھ ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ میں اس معاشرے سے تعلق رکھتی ہوں جہاں مرد کے نام پر خلیل الرحمن قمر جیسی مخلوق بھی پائی جاتی ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ بہت سی عورتوں نے تمہاری لکھی ہوئی فلم "میں پنجاب نہیں جاؤں گی دیکھی کیونکہ انہیں تمہارے اندر چھپی غلاظت کا علم نہیں تھا۔

مجھے افسوس ہے کہ میرے ملک کا میڈیا تم جیسے لوگوں کو ایسی قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھتا ہے جن کے تم کسی طور مستحق نہیں ہو۔

مجھے سخت ہمدردی ہے ان سب عورتوں سے جنہیں ماں بہن اور بیٹی سمیت کسی بھی رشتے میں تم جیسے گنوار سے واسطہ پڑا۔

یہی کہا ہے نا تم نے کہ پانچ مرد عورت کا گینگ ریپ کر سکتے ہیں مگر پانچ عورتیں مرد کا گینگ ریپ نہیں کر سکتیں سو وہ کس طرح سے برابری کا دعوی کر سکتی ہیں؟

ہمیں شرم آئی، حجاب آیا اور تم سے کراہت محسوس کی۔ واہ کیا شان فضلیت ڈھونڈی ہے تم نے مرد کی! کیا آنکھ میں غرور بھر کے تم نے مرد کی طاقت کی شان بیان کی ہے۔ کیا گردن اکڑا کے تم نے یہ حقارت آمیز لفظ کہے ہیں۔ برتری کا یہ تصور بتاتا ہے کہ تم بیمار بلکہ مجرمانہ ذہن کے مالک ہو۔ تم جرم کو برتری کی دلیل قرار دیتے ہو۔

تمہارے الفاظ تیں یا زہر بھرے تیر جو ہر کسی کا دل چھید گئے۔ کیا انہی زہر بھرے الفاظ سے کہانیاں لکھتے ہو؟ ایسا شقی القلب ہوتے ہوئے تم اپنے آپ کو رائٹر کہتے ہو؟ لکھنے والے کا دل تو موم سے بنا ہوتا ہے جو کوئی بھی نا انصافی دیکھ کے پگھل جاتا ہے۔ مگر تمہاری انگارے اگلتی زبان تو کچھ اور ہی کہانی سناتی ہے۔

اگر پانچ عورتوں کے ایک مرد کو گینگ ریپ کرنے سے عورت برابر یا برتر ثابت ہوتی ہے تو سنو ہمیں ایسا مقام نہیں چاہیے۔ ہمیں ایسا کوئی رتبہ نہیں چاہیے جہاں ہم انسانی جان کی تحقیر کریں۔ جہاں اپنے اندر کے حقیر کیڑے کی تسکین کے لئے کسی دوسرے انسان کے احترام کو روندا جائے۔ جہان انسان کو جسم سے ناپا جائے۔ جہاں ہوس کا درندہ ایک مظلوم پھول کی پتیوں کو نوچ نوچ کے پھینک دے۔ جہاں اپنی بے لگام طاقت کو ایک کمزور پہ آزمایا جائے۔ جہاں طاقت کا نشہ سر پہ چڑھ کے بولے اور کسی کی زندگی مرد کی ٹھوکروں کا نشانہ بنے۔ ایسی بڑائی، ایسی برابری، منوانے کی خواہش سے ہم باز آئے، ایسا بے رحم مقابلہ لڑنے کا ہمیں کوئی شوق نہیں۔ تمہیں تمہاری جہالت مبارک ہو۔

جسے تم مقام سمجھتے ہو وہ قعر مذلت ہے

جسے تم نے غرور جانا ہے، وہ تمہارے اندر چھپی اپنی بے وقعتی کی ٹیس ہے۔

جسے تم بڑائی کہتے ہو، وہ ایک اسفل مقام ہے۔

تمہیں ایک بے مایہ لو تھڑے کے نام پر اپنی برتری مبارک!

ہمارے پاس جو حساس دل ہے، وہ دھڑکتا ہے اور ظلم پہ خون کے آنسو روتا ہے۔ ہماری آنکھ سے جو آنسو ٹپکتا ہے، وہ بھی ان مول ہے۔ تم کئی جنم بھی اور کاٹ لو تا تو وہ دل اور وہ آنکھ نہیں پا سکتے۔ پتھر سے بنے ہوئے شقی القلب کو ہیرے اور موتی کی کیا قدر۔

سو جان لو تم، کہ ہمیں تم سا نہیں بننا!

اور تم یہ بھی سن لو کہ ایک مذموم گناہ اور انسانیت سے گرے ہوئے عمل کو تم فخر سے بیان کرتے ہو۔ کیا تمہاری مردانگی کا یہی معیار ہے کہ گینگ ریپ کرنے والے افضل ٹھہرتے ہیں؟ سنو ہمارے پاس تمہارے جیسی وحشی طاقت نہیں مگر عقل تو ہے۔ تم اپنی اس جسمانی ہیئت کے ساتھ اس اخلاقی جرات سے عاری ہو جس سے ننگے سر بی بی زینب شام کے

دربار میں ظلم کو للکارتی ہے۔ تم نے اس ملک میں چار دہائیاں گزار دیں، کوئی ایک دن ایسا جب تم نے بوڑھی فاطمہ جناح کے لہجے میں آمریت کو بے نقاب کیا ہو۔ کوئی ایک لمحہ تمہارے مقدر میں ایسا نہیں جو بے نظیر بھٹو کی اس عظمت کو پہنچ سکے جب وہ ایک شفیق ماں کی صورت اپنے بچوں کی انگلی پکڑے انہیں باپ سے ملوانے جیل لے جاتی تھی۔ کوئی ایک ساعت تمہارے اعمال نامے میں نہیں جب تم نے کلثوم نواز کی طرح تن تنہا سڑک پر آمریت کا مقابلہ کیا ہو۔ تم جیسے ذہنی غلام، روایت کے پجاری پاکستان کی عورت عاصمہ جہانگیر کی عظمت کو سمجھ ہی نہیں سکتے جس کے ایک لفظ سے ہیبت ناک آمر لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔ تمہیں کیا معلوم کہ سترہ برس کی ملالہ یوسف زئی کو اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم پر نسل انسانی کا غیر مشروط احترام ملتا ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ بندوقوں والی کسی نہتی لڑکی سے کیوں ڈرتے ہیں؟

کیا خیال ہے اگر تمہارے جیسے پانچ دس مردوں کے کھانے میں زہر ملا دیا جائے تو دنیا تھوڑی سی بہتر ہو جائے گی۔ نہیں، تمہیں وقت کی انگلی پر لٹکا دینا چاہیے، تم وقت آنے پر کوئی نشان چھوڑے بغیر غبار ہو جاؤ گے۔ تاریخ انسانی کی محضر ملامت میں بھی تم جیسوں کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ تاریکی کے بلیک ہول سے ضیا کی کرن نہیں گزرتی۔

میں نے سنا ہے تم کہیں ادب پڑھتے پڑھاتے رہے ہو۔ تکبر تو تمہارے لہجے میں ایسا ہے گویا تم ہنرک ابسن کے ہم سر ہو۔ کیا تم نے A Doll 's House پڑھا؟ اور اگر پڑھا تو کیا سمجھا بھی؟ تمہارے قلم کو اسٹرنبرگ کا ایک مکالمہ نصیب نہیں ہو سکتا۔ تمہاری اسکرپٹ پر گاؤں کے ٹاکی سنیما میں جاہلوں کی آوازے تو بلند ہو سکتے ہیں لیکن تمہیں برگماں اور اسپیل برگ کا ایک شاٹ نہیں مل سکتا کیونکہ تمہیں یہی معلوم نہیں کہ اسفوکلیز سے لے کر شیکسپیئر تک دنیا بھر کے ڈرامائی ادب میں عورت کا کردار ہمیشہ مرد سے مضبوط دکھایا گیا ہے۔

طاقت کے کھیل میں تھوڑی سی عقل بھی شامل کر جائے تو کیا حرج ہے اور اسی کی تم جیسوں کے پاس شدید کمی ہے۔

سنو! عورت نے کبھی مرد جیسا ہونے کی خواہش نہیں کی۔ صرف یہ کہا کہ عقل اور صلاحیت میں مرد اور عورت برابر ہیں۔ تم اپنی کم سوادی سے یہ ثابت کرنے پر تلے ہو کہ تم مردوں میں بھی اسفل السافلین کے درجے سے تعلق رکھتے ہو۔ کوئی تمہارے برابر کیوں ہونا چاہے گا۔ تم کوشش کرو، شاید تمہیں انسان ہونے کا وہ لمحہ نصیب ہو سکے جو ماں کے پیٹ سے خاص اعضا لے کر برامد ہونے سے نہیں، کردار سے حاصل کیا جاتا ہے۔

تم نے کہا کہ سچی اور اصلی عورت وہ ہے جس میں حیا اور وفا ہو۔ عورت وہ جو اپنی مٹھی نہ کھولے۔ حیا اور وفا کی بحث تمہارے اخروٹ جتنے دماغ میں بس اتنا بھیجا ہے کہ تم حیا کو لباس میں محدود سمجھتے ہو اور وفا کا تصور تم نے غلاموں کی کسی منڈی سے لیا ہے۔ تمہیں فلم اور ڈرامہ لکھنے کی بجائے کسی ایسی جگہ روزگار ڈھونڈنا چاہیے جہاں دماغ کی بجائے جسم سے روٹی کمائی جا سکے۔

تمہارا مرد کی حیا اور وفا کے بارے میں کیا خیال ہے؟ تم ان مردوں میں سے ہو جو عورت کو کھونٹے سے باندھ کے خود کو تمام بے وفائیوں اور بے حیائیوں کے لئے آزاد سمجھتے ہیں۔ تمہیں بہت فخر ہے ناباہر سے روزی روٹی کما کے لانے کا، کبھی سوچا کہ عورت سارا دن کتنی کٹھنائیوں سے گزرتی ہے۔ کس طرح سارا دن ایک بازی گر کی طرح تنے ہوئے رسے پہ چلتی ہے۔ اور اس کے بعد اس کے دامن میں تم جیسا مرد آ گرتا ہے جس کے پاس اپنے شاؤنزم کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ جسے عورت صرف حیا اور وفا کے ساتھ شام کو بند زبان کے ساتھ کھونٹے سے بندھی ملنی چاہیے۔ جس کے پاس مرد کی تھکاوٹوں اور بے چینیوں کے لئے دامن وا ہو اور اس کا دل کیسے دھڑکتا ہے، یہ جاننا مرد کا کام نہ ہو کہ اس کی ہوس کے کئی اور ٹھکانے ہوں۔

دوسری عورت کیوں زندگی میں آ جاتی ہے یہی کہا نا تم نے۔ کیوں پھر ایک اور مرد کی جھوٹی دام الفت میں پھنس جاتی ہے۔ جب تم جیسے شکاری ہر طرف پھندا لے کر گھوم رہے ہوں، جب عورت کے دامن میں میں اپنے گھر سے نارسائیوں کی آگ ہو، تو تم جیسے مرد جال بچھایا ہی کرتے ہیں اپنی خود ساختہ مظلومیت کی کہانیاں سنا سنا کر۔

اور عورت کے جذبات اور احساسات کی بات کیوں نہ کی جائے؟ پروردگار نے آدم و حوا کا جوڑا بنا کے بتا دیا کہ یہ ہے کائنات کا پہلا اور مضبوط ترین اور چاہا جانے والا رشتہ، مرد اور عورت۔ سو اگر ضرورت ہے تو دونوں طرف، جذبات ہیں تو دونوں طرف، احساسات ہیں تو دونوں طرف۔ حیا، وفا، اور شرم کے خود ساختہ غلاف جو کچھ بھی تم عورت کے سر منڈھ رہے ہو، اس کی ضرورت دونوں طرف ہے۔ مرد و عورت ایک ایسی تخلیق ہے پروردگار کی جس میں نہ کوئی افضل ہے اور نہ کوئی کمتر۔ اجزائے ترکیبی ایک ہی ہیں دونوں کے۔

تم نے برصغیر کا نام لیا نا! مان لیا تم واقعی برصغیر سے تعلق رکھتے ہو، عورت کو پاؤں کی جوتی اور بھیڑ بکری سمجھ کے برتنے والے، عورت کو شرم و حیا کے کفن میں لپیٹنے والے، عورت کو گھر کے اندر قید کر کے باہر داد عیش دینے والے۔ پھر بھی وفا کے تقاضے؟

تم عورت کی عزت نفس کو ٹھوکریں مار کے اپنے آپ کو رائٹر سمجھتے ہو۔ اپنے جیسے کچھ مردوں کا حال سن کے اسے مظلوم گردانتے ہو۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ تمہیں ایک چابی سے چلنے والی گونگی گڑیا چاہیے جس کو تم اپنی ہوس کے لئے تو استعمال کرو مگر وہ کیا چاہتی ہے اس سے تمہیں کوئی سروکار نہیں۔

تم ایک تعفن زدہ معاشرے کی پیداوار ہو اور تمہارے لب و لہجے میں وہی مرد بولتا ہے جو عورت کو دوسرے درجے کی مخلوق قرار دیتا ہے۔ تم نے شادی شدہ مرد و عورت کی بے وفائی کی بات کی ہے تو لکھو نا کہ جب دونوں ایک دوسرے کو برداشت نہ کر سکیں، جب ایک دوسرے سے گھن آنے لگے تو بیچ کو درمیان میں لائیں اور آزاد کر دیں ایک دوسرے کو۔ کیوں تمہارا اصرار ہے کہ عورت نفرت کی صلیب میں مصلوب ہو اور پھر بھی تمہارے معیار کے مطابق وفائیں بکھیرتی پھرے۔ کیوں جھوٹے رشتوں سے آزاد نہ ہو۔ بہتر ہو گا کہ تم دوسروں کو اپنی انا کی ٹکٹکی سے آزاد کرنا سیکھو تا کہ خود بھی اپنے بھیتر کے عذاب سے آزادی پا سکو۔

اور سنو، عورت کی برابری کرنا چاہو گے تم؟ عورت کے پاؤں تلے جنت خریدنا چاہو گے تم؟ چلو ذرا حاملہ عورت کی طرح نو مہینے ہی گزار کے دکھا دو۔ اصلی حمل اٹھانا تو

تمہارے بس کی بات نہیں، ذرا پیٹ پہ بارہ کلو وزن باندھ لو اور نو مہینے کام کاج کر کے دکھاؤ، جس میں تم جیسوں کے چونچلے بھی اٹھائے جائیں۔ اور نارمل نہ سہی، پیٹ کاٹ کے سیزیرین ڈلیوری کا درد کا تو تمہیں تجربہ کروایا جا ہی سکتا ہے۔

ذرا تم بھی تو جانو کہ گینگ ریپ کر کے عورت نے تمہارے مقام تک آنا ہے یا تم نے ماں بننے کی تھوڑی سی ریہرسل کر کے اس مقام کا اندازہ لگانا ہے۔ اور اس ساری اذیت کے بعد اگر کوئی تم جیسا گود میں آ ٹھہرے تو ماں کی گود انگاروں سے بھر جایا کرتی ہے۔

چلو اگر نو مہینے کا وزن نہیں اٹھا سکتے تو ایک مہینے اپنی ٹانگوں میں صبح شام ایک پیڈ ہی باندھ لو اور اسی کے ساتھ اپنی تمام مصنوعی کہانیاں لکھو۔ تجربہ تو کرو کہ عورت کن کن مراحل سے گزرتی ہے اور پھر تم جیسوں کے زہر بھرے الفاظ سن کے زخمی ہوتی ہے۔

بگڑے ہوئے جنسی معاملات برتری یا کمتری کا معیار نہیں لیکن شاید افضل نامی لفظ تمہارے غلیظ خیالات میں اس قدر گھس گیا ہے کہ تم ہر جذبہ، ہر رشتہ اور ہر انسان کو اس پہ تولنے کھڑے ہو جاتے ہو۔

تم اسی ملک پاکستان کے رہنے والے ہو نا؟ سنو، اس ملک میں کوئی کسی سے چھپا ہوا نہیں۔ باقی سب کی طرح تمہارے بچپن کی ناکامیوں سے لے کر جوانی کی خرمستیوں کی تک سب داستانیں زبان خلق پر ہیں۔ لیکن انہیں دہرا کے اپنی تحریر کو آلودہ نہیں کرنا چاہتی اور یہ بھی نہیں چاہتی کہ ان نیک عورتوں کے نام پر کوئی حرف آئے جنہیں کسی بھی رشتے میں تم جیسے نابکار سے واسطہ پڑا۔ عورت کی عظمت اسی میں ہے کہ اس کا نام تم جیسے ناکردہ کار نمونوں سے منسوب نہ ہو۔

عورتوں کے خلاف تمہاری غلیظ گفتگو کے بعد کسی عورت کو تمہارا لکھا ہوا نہ کوئی ڈرامہ دیکھنا چاہیے اور نہ تم سے کوئی انٹرویو کرنا چاہیے۔ صرف عورتیں ہی نہیں تمام صاحب عقل عورتوں اور مردوں کو تمہارا سوشل بائیکاٹ کرنا چاہیے۔ تم اسی قابل ہو کہ تمہیں اپنی مردانگی کی بے معنویت میں تنہا چھوڑ دیا جائے جہاں تم جھنجھلاہٹ کی خود کلامی میں فنا کے گھاٹ اترنے کا انتظار کرو۔ جہاں تم گینگ ریپ کے صحرا اور خلاف وضع فطری کے جزیرے

میں ایسے مکالمے لکھو جو نفسیات کے کسی طالب علم کے کام آسکیں گے۔ بے شک تم لا علاج
ہو لیکن طبی تحقیق میں تم جیسوں سے بھی کچھ کام لیا جاسکتا ہے۔

بیوی کا دل کیسے جیتا جائے؟

"وہ میرے سامنے بیٹھی رندھی آواز میں بول رہی تھی" "ڈاکٹر! میرا دل چاہتا ہے میں خودکشی کر لوں"

"کیوں بھئی، کیا ہوا"

"شادی کے بعد میری ساس نندوں نے ایک دن مجھے سانس نہیں لینے دیا۔ دن رات کام ہے اور طعن و تشنیع۔ شوہر کو صرف ان کی بات سمجھ آتی ہے۔ دن کو میرے لئے وہ اجنبی ہوتا ہے بات بہ بات جھگڑتا ہوا اور اپنی ماں بہنوں کی شکایات پہ میری جواب طلبی کرتا ہوا، اور رات کے اندھیرے میں اپنی خواہشات کی طلب کی، مانگ میں بے قرار۔

لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ صبح کو زخمی کیا گیا من، رات کو محبت کی رم جھم میں ڈوب جائے۔ پھر یہ سب ایک فرض بن جاتا ہے ڈاکٹر، ایک ناگوار فریضہ اور شوہر چڑ کے کہتے ہیں کہ میں پتھر ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم لڑکیاں خوشی خوشی سولی کیوں چڑھ جاتی ہیں"

ہمارے آج کے کالم کا گہرا ناتا ہے کچھ باتوں سے، کچھ احساسات سے، کچھ کمنٹس سے جو ہم نے پچھلے کالم (جاہلوں کی دعا۔ خدا بیٹی کے نصیب اچھے کرے) کے بعد پائے۔

ابھی ہم ان سب کی روشنی میں کچھ لکھنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ ہفتہ واری کلینک میں دو مریضوں سے ملاقات ہو گئی اور ہماری سوچ میں کچھ اور چراغ جل اٹھے، کچھ اور در وا ہو گئے۔

ڈاکٹر اگر ہمدرد ہو تو مریض بیماری کے ساتھ اپنے اندر کا حال بھی بیان کر دیتا ہے۔ نتیجتاً وہ گتھیاں سلجھانے کے لئے مل جاتی ہیں جن کا تانا بانا ہمارے گھروں کی بد صورت سیاست سے جڑا ہے، طاقت اور اختیار کی سیاست!

پہلی مریض انتہائی مضمحل دکھتی تھی، اداس آنکھیں اور پر کشش چہرہ۔ وہ بہت سی ایسی تکلیفوں کے ساتھ آئی تھی جو ذہنی اعصاب سے جڑی تھیں۔ ہم ماہر نفسیات تو نہیں لیکن دل کی کہانی سننے پہ یقین رکھتے ہیں۔ ہمارے تھوڑا سا کریدنے پہ وہ پھٹ پڑی تھی اور خودکشی کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اور ہم نے سوچا تھا، اوہ خدایا! پھر وہی پدر سری معاشرے کی ازلی دیمک زدہ کہانی!

"میم، کیا اگلا مریض بھیج دوں" میری اٹینڈنٹ نے پوچھا تھا؟

اور اگلا جوڑا جو داخل ہوا، یوں محسوس ہوا کہ باد نسیم کے جھونکے سے بیمار کو بے وجہ قرار آ گیا۔ پہلی مریض سے مل کے جو اداسی چھائی تھی، اس کا مداوا ہو گیا۔

نوجوان، بے انتہا پر کشش، فرحاں چہرے، ہنستی آنکھیں، کھلکھلاتے لب، کلینک میں شادمانی رقص کر رہی تھی۔ ہم کافی حیران تھے کہ اپنے ملک سے تعلق رکھنے والا ایسا جوڑا کم ہی دیکھنے میں ملتا ہے۔

شادی کو ایک برس گزر چکا تھا اور اب خوشخبری ٹھہر چکی تھی۔ دونوں بات بے بات ہنستے تھے۔ دولہا میاں بہت جملہ باز تھے اور دلہن بہت پر جوش۔ دولہا میاں کو اپنی کہانی کہنے کا شوق تھا اور ہمیں سننے کا سو ہمارے چھیڑنے کی دیر تھی۔

"میں دس سال سے ملک سے باہر ہوں اور اپنے خاندان کو مالی طور پہ سپورٹ کر رہا ہوں۔ گزشتہ پانچ سال سے عقد کی خواہش تھی سو گھر والوں سے بارہا درخواست کی۔ میری والدہ اور بہنوں نے سینکڑوں لڑکیاں دیکھ ڈالیں۔ میری کوئی خاص پسند نہیں تھی لیکن ان کے معیار پہ کوئی پورا ہی نہیں اترتا تھا۔ ہر لڑکی میں کوئی نہ کوئی نقص نکال دیا جاتا۔ میں تھک چکا تھا، مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ سب اس سلسلے میں زیادہ پر جوش نہیں ہیں۔

ان کے ہاں جب یہ سلسلہ شروع ہوا تو میں نے کچھ اور ٹھانی۔ میں نے کسی طرح نمبر لے کے ان کے والدین سے خود بات کی، انہیں اپنے بارے میں تفصیل سے بتایا۔

درخواست کی کہ جو بھی تحقیق کرنا چاہتے ہیں کر لیجیئے اور اگر میں معیار پہ پورا اتروں تو مجھے قبول کر لیجیے۔ ان کے خاندان کو کچھ تامل تھا کہ عموماً ایسا ہوتا نہیں۔

میں نے انہیں وڈیو کالز کیں، اپنا گھر دکھایا، اپنی تنخواہ کی تفصیل بھیجی، اپنی جاب کے متعلق بتائی، اپنی عادتیں بتائیں۔ اپنی خواہشات کا اظہار کیا، میں ان کی بیٹی کے تحفظ کے لئے کیا کر سکتا ہوں بتایا اور یہ بھی کہا کہ ان باتوں کا میرے والدین کو علم نہ ہو تو بہتر ہے۔

ان کے والدین کو میری صاف گوئی بے حد بھائی لیکن پھر بھی وہ تذبذب کا شکار تھے۔ میں نے گھر کے ایک ایک فرد سے بات کی اور بالآخر انہیں میری سچائی پہ اعتبار آ ہی گیا۔ ایک درخواست اور کی کہ میں والدین کو رشتہ لینے بھیجوں گا اور آپ لوگ فوراً قبول کر لیجیے گا۔ مزید یہ کہ مجھے عقد بھی جلد کرنا ہے تاکہ کوئی رخنہ اندازی نہ ہو سکے۔

اب دلہن کی باری تھی "ہمیں ان کی باتیں بہت عجیب محسوس ہوئیں، لیکن لفظوں میں صداقت بولتی تھی۔ سو ہم سب نے ان پہ اعتبار کا فیصلہ کیا اور وقت نے ثابت کیا کہ ہمارے دل نے غلط نہیں سوچا تھا۔ ڈاکٹر میں آپ کو بتاؤں، میں پہلی دفعہ ان سے شب زفاف پہ ملی اور ملتے ان کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔

انہوں نے یہ کہہ کے میرا دل موہ لیا کہ تم اب میرا حصہ ہو، میرا مستقبل ہو، تم میرے لئے آئی ہو، میرا گھر بنانے سو اب تمہارا تحفظ میری ذمہ داری ہے۔ میں تمہیں کچھ باتوں سے پہلے ہی محتاط کرنا چاہتا ہوں تاکہ تمہاری طبیعت بوجھل نہ ہو۔ مجھے اپنی ماں اور بہنوں سے محبت ہے کہ ہم ایک ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں لیکن میں تم سے بھی محبت کا رشتہ باندھ چکا ہوں سو کچھ باتیں بتانا میری ذمہ داری ہیں۔ بڑی آپا مزاج کی بہت تیکھی ہیں، طنز کرنے کا بہت شوق ہے، سو کوئی موقع جانے نہیں دیں گی۔ منجھلی باجی بھی ہر وقت تمہاری ٹوہ میں رہیں گی اور چھوٹی سے تو بہت ہی ہوشیار رہنا، تمہاری ہر بات اماں کو جڑے گی۔ رہیں اماں تو تمہارے ساتھ اب ان کا شراکت کا رشتہ ہے۔ سو تھوڑا مشکل ان کے لئے بھی ہوگا، بیٹے کی محبت بانٹنا۔ لیکن تم صرف میرا یقین رکھنا اور دوبدو مقابلے پہ مت اترنا۔ ان کی بھی سنوں گا اور تمہاری بھی لیکن میں تمہارا مقام کبھی متاثر نہیں ہونے دوں گا اور ان کو بھی تمہیں اذیت نہیں دینے دوں گا"

وہ مسکرائی "اور اب میں ایک لمحہ بھی ان کے بنا نہیں رہ سکتی"

ہمارے الفاظ گم ہو چکے تھے، آواز حلق میں پھنس چکی تھی۔ بڑی مشکل سے سوال کیا، "بیٹا! اس عمر میں ازدواجی زندگی کی غلام گردشوں کے تاریک راز تم نے کیسے سمجھے"

وہ مسکرایا "میرا بچپن مشترکہ خاندانی نظام میں گزرا۔ گھر میں پھوپھیاں بھی تھیں اور دادی بھی اور میں نے اپنی ماں کو ان کے ہاتھوں زچ ہوتے دیکھا۔ ابا دفتر سے آتے اور جھوٹی شکایات کا دفتر کھل جاتا۔ ابا دفتر کی تھکاوٹ اور ماں بہنوں کی شکایات کا ملبہ اماں پہ گراتے اور اماں کی بات بے مول ٹھہرتی۔ اماں خون کے آنسو روتیں اور ہم بہن بھائی خاموش تماشائی بنتے۔ وہی شیر بن کے گرجنے والے ابا رات کے اندھیرے میں اماں سے معافی کے خواستگار ہوتے کہ نفسانی خواہشات کا غلبہ ہوتا لیکن کب تک؟ آہستہ آہستہ اماں ابا سے دور اور خاموش ہوتی گئیں۔ سر جھکا کے زندگی گزارتی رہیں۔ وقت گزرا، دادی عالم بالا کو سدھار گئیں۔ مگر پھوپھیوں نے اپنے گھروں میں جا کے بھی میکے میں طاقت کی سیاست نہیں چھوڑی۔

ابا اور اماں میں برسوں کی دوری تھی اور ان تمام برسوں کی تلخیوں نے اماں کا مزاج کڑوا کر دیا تھا۔ اماں نے بچوں میں دل لگا لیا تھا اور ابا اب تنہائی کا شکار تھے۔ اب ابا کی زندگی کا ساتھی ابا سے صدیوں کی دوری پہ کھڑا تھا۔ وہ سب برس جب محبت کا بیج بویا جانا تھا اور بڑھاپے میں جس کی چھاؤں نے دونوں ساتھیوں کو پناہ دینی تھی، کیکٹس میں بدل چکا تھا۔

پھر میں ملک سے باہر آ گیا اور بدلتے برسوں میں محسوس کیا کیا میری ماں نادانستگی میں دادی کا رستہ اپنا چکی ہیں۔ بیٹے سے وابستہ معاشیات بھی اس کھیل میں بھرپور کردار ادا کرتی ہے۔ بیٹا تو اپنا ہی رہتا ہے لیکن اس کے بیوی بچوں سے شراکت مشکل۔ اور اس سب میں بنیادی نقصان مرد کا ہوتا ہے۔ شباب عمری میں خونی رشتوں کی محبت وہ فیصلے کروا دیتی ہے جس کا خمیازہ آخر عمر میں بھگتنا پڑتا ہے۔ پدرسری معاشرے میں بیوی جو ساری عمر تاوان دیتی ہے، آخر عمر میں بچوں کے ذریعے طاقت چھین کے شوہر کو ایڑیاں رگڑنے پہ مجبور کر دیتی ہے۔ اور یہ وہ آتش فشاں ہے جس سسرال اور شوہر مل کے برسوں سلگاتے ہیں"

وہ پھر گویا ہوا،

"میں نے بہت پہلے سوچ لیا تھا مجھے اپنی زندگی کے ساتھی کو ناراض نہیں کرنا۔ میں والدین کے حقوق بھی پورے کروں گا لیکن اپنے من کی ساتھی کے ساتھ بھی مرضی کی زندگی گزاروں گا۔ مجھے ازدواجی زندگی کی لذت کشید کرنی ہے۔ مجھے دن میں اپنے ساتھی کو بے عزت کرنا اور رات کے اندھیروں میں اس سے معافی نہیں مانگنی۔ میں اپنی ماں کے ساتھ اپنے بچوں کی ماں کو بھی عزت دینا چاہتا ہوں"

ہم ٹک ٹک چہرہ لئے اس نوجوان کو دیکھ رہے تھے جس نے صرف بتیس برس میں وہ گیان و عرفان پالیا تھا جو کچھ لوگ اک ناآسودہ عمر بسر کرنے کے بعد بھی نہیں پاسکتے اور یونہی دنیا کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ پہلی کہانی معاشرے کی نوے فیصد عورتوں کی کہانی ہے اور دوسری شاید پانچ فیصد کہ توازن قائم رکھنا کوہ طور کو سر کرنے کے مترادف ہے۔

ایک دلچسپ بات سناتے چلیں جو ہمارے کزن طیب کاظمی نے ہمیں کبھی سنائی تھی۔

"اگر آپ چاہتے ہیں کہ بڑھاپے میں شوہر کی چارپائی ڈیوڑھی میں نہ بچھے تو جوانی میں اپنی بیگم کو اپنا بنا لیجیے"

بازی گر کی طرح تنے ہوئے رسے پہ توازن قائم رکھنے میں ہی زندگی ہے!

ہانگ کانگ کے شعلوں میں جلتی بیویاں

محمد حنیف کے کالم "ہانگ کانگ کے شعلے" اور "ہانگ کانگ کے نیلے پیلے" ہمارے ویک اینڈ کا مزا دوبالا کر گئے لیکن ہمیں ایک بھولی ہوئی کہانی بھی یاد کرا گئے، ایک مریض کی کہانی!

عورت چاہے کتنی بھی پارسا ہو، مرد کی نادانیاں اور رسوائیاں اس کے دامن میں ضرور چھید کرتی ہیں اور وہ ان چاہے میں بھی برابر کی حصے دار ٹھہرتی ہے۔ زندگی کے سفر میں ساتھ چلنے والے ساتھیوں کا عذاب و ثواب بھی مقدر کی طرح سانجھا بن جایا کرتا ہے۔

"ڈاکٹر میں بہت تکلیف میں ہوں، نہ بیٹھ سکتی ہوں، نہ لیٹ سکتی ہوں۔ خدارا! کچھ کیجیے" وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

میں کلینک پہ تھی! وہ داخل ہوئی، تکلیف کے آثار چہرے سے عیاں تھے۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہ ہمارے سامنے آ بیٹھی۔ وہ سات مہینے کی حاملہ تھی۔ اپنی ہم وطن ڈاکٹر دیکھ کے اس کے جملے کراہوں میں بدل گئے۔

"کچھ دن پہلے زیر ناف چھوٹی چھوٹی گوشت کی طرح کی پھنسیاں نمودار ہوئیں۔ ابتدا میں تین چار تھیں، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بہت زیادہ ہو گئیں اور خون رسنا شروع ہو گیا۔ اب عالم یہ ہے کہ تکلیف بہت زیادہ ہے، برداشت کرنا محال ہے۔ پیٹ میں بچہ ہے اور اوپر سے یہ ناگہانی!

ہم نے مریض کو تسلی دی اور معائنہ کروانے کو کہا،

"اوہ! میرے خدا، یہ تو وارٹس ہیں"

زیر ناف حصہ پھنسیوں سے بھرا پڑا تھا۔ انفیکشن بھی موجود تھی اور خون بھی رس رہا تھا۔ یہ خاص قسم کے وائرل وارٹس تھے۔ اگلا مرحلہ زیادہ مشکل تھا۔ کہ اب ہمیں جاننا تھا کہ خاتون کو وارٹس بنانے والے وائرس کی منتقلی کہاں سے ہوئی۔ چونکہ یہ وائرس جنسی تعلقات سے پھیلتا ہے سو ایشیائی مشرقی اور مذہبی معاشرے کے لوگوں کے ساتھ یہ موضوع زیر بحث لانا کافی دشوار ہوتا ہے۔

خاتون کافی پریشان تھی لیکن اس طرح کی صورت حال میں کونٹیکٹ ٹریسنگ اور جنسی تعلقات کے بارے میں جاننا تولازم ہوا کرتا ہے۔ جب ہم نے مرض کی نوعیت پہ روشنی ڈالی تو خاتون کی آنکھیں حیرت، شرمندگی اور خوف کے احساسات سے پھٹ گئیں۔ ایک طویل خاموشی کے بعد وہ تھوک نگل کے بولی، ڈاکٹر میں حمل سے ہوں، میرے لئے تو اس حالت میں شوہر کا تقاضا ہی محال ہے۔ کجا یہ کہ کوئی اور؟ دوسرے یہ کہ میں ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ شوہر کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتی کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں کافی گھر سے باہر رہتے ہیں۔

خاتون کو بتایا گیا کہ ان کے شوہر کا معائنہ بہت ضروری ہے اور ہمارے ایک ساتھی مرد ڈاکٹر اس سلسلے میں مدد کریں گے۔ اور اگر وہ بھی اس مرض کا شکار ہوئے تو دونوں کا علاج اکھٹے شروع ہو گا۔ شوہر تو یہ سن کے ہی بدک گئے اور لگے بیگم کو جھاڑنے جو ڈاکٹر کے کہنے پہ مصر تھیں کہ شوہر بھی اپنا معائنہ کروائیں۔

یہ لمبی کہانی ہے کہ وہ کیسے راضی ہوئے لیکن طبی معائنے کے بعد انکشاف ہوا کہ موصوف بھی وائرس کا شکار تھے۔ چونکہ ان میں مرض کی شدت کم تھی سو ابتک وہ بے فکر ہوئے بیٹھے تھے۔ لیکن ازدواجی تعلقات میں وہ وائرس کا تحفہ بیوی کو دے چکے تھے۔

بالآخر انہیں اقرار کرتے ہی بنی کہ ان کا کاروبار کے سلسلے میں ہانگ کانگ جانا رنگ لایا تھا اور وہیں کے کسی جنسی تعلق کے نتیجے میں وائرس ان سے ہوتا ہوا ان کی حاملہ بیوی تک پہنچ گیا تھا۔ حمل میں اس طرح کا مرض زیادہ شدت سے حملہ آور ہوتا ہے۔ ہمیں ہانگ کانگ کے شعلے اور نیلے پیلے تو دیکھنے کو نہ ملے، لیکن ہانگ کانگ کے وائرس سے ملنے کا اتفاق ضرور ہو گیا۔

اس نوع کی پیدا ہونے والی لحمیاتی پھنسیاں یا وارٹس ہیومن پیپیلوما وائرس (Human papiloma virus) کی دین ہیں۔ عرف عام میں یہ HPV کہلاتا ہے اور HPV 16 اور HPV18 خاص طور پہ جنسی مقامات پہ پھنسیاں بناتے ہیں۔ ان کا ٹھکانہ مرد وزن کی جنسی رطوبات ہوتی ہیں۔ جسم سے باہر HPV فورا مر جاتا ہے اور دوسرے وائرسز کی طرح یہ فضا میں یا ملبوسات پہ نہیں پل سکتا۔

اس کا پھیلاؤ یا منتقلی براہ راست جنسی تعلقات سے ہوتی ہے یعنی خاتون سے محترم اور محترم سے خاتون۔ یہ وائرس زیادہ تر جنسی کاروبار میں ملوث افراد میں پایا جاتا ہے اور وہیں سے مختلف لوگوں میں منتقل ہوتا ہے۔ HPV کی منتقلی کسی اور طریقے سے ممکن نہیں۔ لیکن لوگ اپنی تسلی کے لئے بہت سی کہانیاں گھڑ لیتے ہیں۔

ہمیں ایک دفعہ ایک خاتون ملیں، جن کے شوہر اس وائرس کا شکار ہونے کی بعد قسمیں کھا کھا کے انہیں یقین دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ یہ انفیکشن ہوٹل کے تولیوں کے استعمال سے ہوئی ہے۔ کچھ اور کہانیوں میں شوہروں نے غلطی سے دوستوں کے استعمال شدہ زیر جامے کو مورد الزام ٹھہرایا۔

جب اس طرح کی توجیہہ کے بعد کوئی ہماری رائے جاننے کی کوشش کرتا ہے تو " ہم چپ رہے، ہم ہنس دیئے، منظور تھا پردہ ترا " کی تصویر بن جایا کرتے ہیں۔

ان وارٹس کا علاج لیزر یا بجلی کے ذریعے کیا جاتا ہے جہاں ان پھنسیوں کو جلایا جاتا ہے۔ یہ پھنسیاں ایک دفعہ جلانے سے ختم نہیں ہوتیں سو یہ عمل کئی دفعہ دہرانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر پھنسیوں کا علاج زچگی تک نہ ہو سکے تو حاملہ خواتین کا بچہ دوران زچگی اس وائرس کا شکار بن سکتا ہے۔ ایچ پی وی کی شکار خواتین میں کینسر میں مبتلا ہونے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے اور یہ کینسر رحم کے منہ سے شروع ہوتا ہے۔

مغرب میں HPV کی ویکسین عورتوں کے لئے بہت محفوظ سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے یہاں اس کا استعمال متنازع ہے کہ لوگ ایک سے زیادہ جنسی رشتوں میں ملوث تو ہوتے ہیں لیکن اقرار نہیں کرتے۔

لیجیے، محمد حنیف کا ہانگ کانگ کا تذکرہ ہمیں کیا کچھ یاد دلا گیا۔ ہم کسی کو اخلاقیات پہ درس نہیں دینا چاہتے۔ بس اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ چند لمحوں کی تسکین کے لئے اپنی زندگی کی ساتھی کو کسی مشکل میں مبتلا مت کیجیے۔ اعتماد کے جس رشتے میں آپ بندھے ہیں، اسے دوریوں کے زہر سے کچے دھاگے میں مت بدلیے۔

ہانگ کانگ کے شعلے بھی دیکھیے اور نیلے پیلے بھی، لیکن وائرس کا تحفہ گھر مت لائیے۔

ایک مثالی مرد کو کیسا ہونا چاہئے؟

یاسر پیرزادہ کا کالم پڑھ کے محسوس ہوا کہ جیسے زخموں سے کھرنڈ اتر گیا ہو اور یہ پھر سے رسنے لگے ہوں۔

ہمیں اچھا لگا کہ آپ کو کسی درسی کتاب کے باب کا سرنامہ دیکھ کے عورت سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ ورنہ بیشتر کرم فرما اور مہربان تو ہمدردی کے قابل بھی نہیں سمجھتے کہ موری کی اینٹ کے بارے میں کیا سوچنا؟

ہم سے پوچھیے، عورت ہونا اور وہ بھی پاکستانی معاشرے میں، کیسا محسوس ہوتا ہے؟ ایک قیامت ہے جو عورت پہ روز آتی ہے۔ ایک ہمہ وقت ذلت ہے جس کا سامنا عورت کو ہر آن ہے۔ پل پل جینے اور زہر پی کے زندہ رہنے کا کرب مرد کیا جانیں۔

یقین نہ آئے تو صرف ایک ہی دن اخبار پڑھ لیجیے یا ٹی وی کھول لیجیے۔ دارالامان کی کم عمر بچیوں کے ساتھ ہوس و درندگی کا کھیل کس ڈھٹائی سے کھیلا جا رہا ہے۔ چاردیواری کے اندر جھانکیے تو شوہر کی حکم عدولی پہ زندگی سے محروم ہونا بھی کل ہی کی خبر ہے۔ عورت کی کم ظرفی کے افسانے تراشنا اور ان پہ ٹھٹھا لگانا خلیل الرحمن قمر جیسے بہت سے مردوں کے ایجنڈے میں شامل ہے۔

کیا کہا آپ نے؟ عورت کے حقوق، اجی کونسے حقوق؟

بے فکر رہیے، ہمارے معاشرے میں اتنے ہی حقوق مناسب سمجھے جاتے ہیں جتنے گھر کے پچھواڑے بندھی بھیڑ بکریوں کے جنہیں صرف چارہ پانی اور کھونٹے سے باندھ کے

سمجھ لیا جاتا ہے کہ ذمہ داری پوری ہوئی۔ خیر سے چھت بھی ہے اور دو وقت کی روٹی بھی اور کیا چاہیے بھلا ان بے چاریوں کو!

عورت کو دست نگر رکھ کے نہ صرف بہت سوں کی انا تو انا ہوتی ہے بلکہ احتجاج نہ کرنے والی عورت کو مثالی جان کے شاباش بھی دی جاتی ہے۔ اگر کبھی کوئی قسمت کی ماری رسی تڑوانے کی کوشش کر بیٹھے تو نہ جسمانی تشدد سے مرد کو پرہیز ہے اور نہ ہی ذہنی عذاب میں مبتلا کرنا کوئی عار کہ ملکیت جو ٹھہری۔ اگر پھر بھی کوئی جیالی سر پہ کفن باندھ لے تو مذہب کی چھڑی ہے نا جو عورت کی سرکشی دبانے کے کام آتی ہے۔ نہ فتویٰ لگانے والوں کی کمی ہے اور نہ یقین کرنے والوں کی کہ سب ہی ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔

عورت کی پسند اور خواہش کا احترام وہ خیرات ہے جسے دینے میں مرد کا دل اور دامن کبھی کشادہ نہیں ہوتا۔ ہم ایک خاتون کو جانتے ہیں جو سالہا سال اپنی بہن سے اس لئے ملنے سے قاصر تھیں کہ بہن نے اپنی مرضی سے ذات برادری سے باہر شادی کی تھی۔ اب ان کے شوہر کو خدشہ تھا کہ ان کی بیوی کی اخلاقیات اپنی سگی بہن کو ملنے سے تباہ ہو سکتی ہیں۔

مرد کی پسندیدہ مثالی عورت ایک احساسات جذبات اور خواہشات سے خالی ایک زندہ لاش ہے جو ہمارے معاشرے میں بچپن سے مثالی بیٹی، مثالی بہن، مثالی بیوی اور مثالی ماں کے درس سنتے سنتے اور اس قالب میں ڈھلتے ڈھلتے عمر گزار دیتی ہے۔

مثالی بیٹی والدین کے اونچے شملے کا بوجھ اٹھا کے اپنی خواہشات کو دفن کرتی ہے، مثالی بہن بھائی کی غیرت کی لاج رکھ کے قرآن سے شادی کر بیٹھتی ہے، مثالی بیوی شوہر اور سسرال کی ہر ناانصافی پہ لب سی لیتی ہے کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں گھر سے دھکے دے کے نکالی جائے گی اور شاید گھر کا چولہا ہی نہ چھٹ جائے۔ مثالی ماں نے تو ویسے ہی قدموں تلے جنت کا وقار قائم رکھنا ہوتا ہے سو جنت اور ماں کے بیچ عورت کا وجود نہیں رہتا۔ یوں عورت مثالی کتابچہ ء زندگی کے اصول نباہتے نباہتے زندگی کی شام کر دیتی ہے اور مثالی ہونے کا تمغہ پھر بھی نہیں مل پاتا۔

ویسے کیا کوئی کتاب اور کوئی نصاب مثالی مرد کے طرز عمل پہ بھی روشنی ڈال سکتا ہے؟ کیا کوئی اخلاقی قاعدہ یا معاشرہ تصویر کشی کرتا ہے کہ کیسا ہونا چاہئے ایک مثالی مرد؟

ہم نے کتابوں، نصابوں یا حکایتوں میں جواب ڈھونڈنے کی بجائے زندگی برتنے والی خواتین سے یہ جاننے کی کوشش کی کہ کیسا ہونا چاہئے مثالی مرد؟

"جو عورت کو مثال بنانے کے لئے نصابی پیمانے تلاش نہیں کرے اور ہر وقت ترازو کے پلڑوں میں تولتا نہیں پھرے"

"جو عورت کو اپنے جیسا آزاد فرد جانے، استعمال کی چیز سمجھنے کی بجائے بحثیت انسان عزت واحترام دے"

"جو عورت کو سیدھے رستے پہ رکھنے کے لئے خدا نہ بنے، جو عورت کی ٹھکائی لگانا یا زبان کے تیر برسانا حقوق زوجیت کا حصہ نہ سمجھے"

"جو عورت کی تکلیف اور اس کے درد کو جانے اور بانٹ سکے، جو عورت کے سر پہ کڑی دھوپ میں اس کے لئے سایہ بن سکے"

"جو عورت کو 'میری بیوی میری ملکیت' سمجھ کے اس کی زندگی کے فیصلوں پہ اپنا حق نہ سمجھے۔ جس کے نزدیک عورت بھی ہر فیصلہ اور ہر خواہش کرنے میں آزاد ہو اور اس کی مرضی بھی اہم ٹھہرے"

"جو یہ سمجھے کہ آزاد فضا میں سانس لینے کا حق عورت کو بھی مرد جتنا ہی حاصل ہے۔ عورت کا سانس بھی گھر کی اونچی دیواروں میں گھٹتا ہے"

"جو عورت کو پاؤں کی جوتی، ذاتی ملکیت یا کاغذ کی بے جان گڑیا نہیں سمجھے۔ جسے معلوم ہو کہ عورت کے پاس سوچ بھی ہے اور زبان بھی کہ عورت کو بھی جسم کے ساتھ روح ودیعت کی گئی ہے"

"جو عورت کو اپنے غصے اور اپنی کمزوریاں ٹھکانے لگانے کا کوڑادان اور لغزشوں کا تاوان ادا کرنے کا سامان نہ بنائے"

ہم یہ کہتے ہیں کہ مثالی مرد وہ ہے جو کائنات کے پہلے رشتے کی لاج رکھے، مرد اور عورت، پروردگار کی پہلی تخلیق!

جہاں نہ کوئی مثال تھی اور نہ ہی مثال بننے کا درس۔ ایک ایسا مرد جو آدم بن کے حوا کو پہچانے، اسی ذوق و شوق اور محبت کے ساتھ، جو تخلیق کی اول گھڑی دو ساتھیوں نے محسوس کی۔

پھر کیا خیال ہے یاسر صاحب، ہو جائے ایک کالم ضابطہ حیات برائے مرد!

"ایک مثالی مرد کو کیسا ہونا چاہیے؟"

نہر والا پل اور سعودی عرب!

سمجھ میں نہیں آرہا کہ ہنسیں یا روئیں اور اس سمجھ، نا سمجھ میں ممکن ہے کہ کپڑے چاک کر کے جنگلوں کو نکل جائیں، نیرنگی زمانہ پہ غور کریں اور گنگنائیں،

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

اور اگر طبیعت میں انتشار کچھ زیادہ ہی ہو تو اس گیت کی گت پر ٹھیکا لگانے میں بھی مضائقہ نہیں،

ساتوں نہر والے پل تے بلا کے

ہماری یہ کیفیت اس خبر کا نتیجہ ہے جو ہم نے ابھی ابھی پڑھی ہے،

"سعودی عرب میں اٹھارہ برس سے کم عمر کی شادی پہ پابندی لگا دی گئی"

سعودی عرب نے پچھلے چالیس برس میں ہمارے معاشرے کی تشکیل میں ایک خاص کردار ادا کیا ہے۔ عرب کی تقلید میں عجم والے بھی حصہ بقدر جثہ کے ذمہ دار ہیں۔ کم عمری کی شادی ہمارے ہاں بھی ایک تازیانہ ہے جس کے خلاف بل ایک ایسا بھاری پتھر ہے جسے ہر کوئی چوم کے چھوڑ دیتا ہے۔ مخالفت کے لئے جید علماء کرام کے پاس اسلامی تاریخ سے بہت سی مثالیں ہمیشہ موجود رہتی ہیں۔

ہمارے معاشرے میں اس کی توجیہ کچھ یوں دی جاتی ہے کہ لڑکی شباب کی عمر کو پہنچنے کے فوراً بعد بیاہ دینی چاہیے۔ شباب کا مطلب حیض اور حیض شروع ہونے کا معنی کہ لڑکی حاملہ ہو کے بچہ پیدا کر سکتی ہے۔ سو اب لڑکیوں کی زندگی کا کوئی اور مصرف تو نظر نہیں آتا

سوائے حاملہ ہو کے آبادی بڑھانے کے، سو شادی کی فکر کرنا لازم ٹھہرتا ہے اور اس سب قضیے کو اسلامی روایات کا نقاب پہنا دیا جاتا ہے۔

اس برس کچھ ماہ پہلے ہماری چھوٹی بیٹی کی اٹھارویں سالگرہ تھی۔ معصوم چہرے اور بچگانہ حرکات کے ساتھ وہ پورے گھر میں اچھلتی پھر رہی تھی۔ اسے دیکھ کے بے اختیار دل میں ایک خیال ابھرا، اگر ابھی میں اسے بیاہ کے ایک مرد کے حوالے کر دوں، ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دھکیل دوں تو کہاں جائے گا اس کا بے ساختہ الھڑ پن؟ پرندوں سی بے فکری، صبا سی شوخی و چنچل پن، اپنے آپ کو منوانے کا شوق اور اپنی پہچان، اپنی ذات کا غرور، اپنی آزادی، اپنی فکر و آدرش۔ کہاں سے لے گی یہ سر اونچا رکھ کے جینے کا مان؟ آپ کو احمد ندیم قاسمی صاحب کا معروف شعر تو یاد ہو گا

کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ بجز اذن کلام
ہم تو انسان کا بے ساختہ پن مانگتے ہیں

تو بھیا، انسان کے اس بے ساختہ پن پر لڑکوں کا اجارہ تھوڑی ہے؟ کیا ہم ایسے گئے گزرے ہیں کہ اپنی بچیوں کو انسان نہیں سمجھتے۔ کیا ہماری عقل پر ایسے پتھر پڑ گئے ہیں کہ کم سن بچی کو ادھیڑ عمر مرد سے بیاہ کے اس کے لئے خوشیوں کی دعا کرتے ہیں۔ دعا کا ایک مقام ہے، لیکن درد کی دوا بھی تو کرنی چاہیے۔

جو بچی ابھی اپنی زندگی جینے کا قرینہ نہیں جانتی، کیا سکھا سکتی ہے اپنے بچے کو؟ زمانے کے حوادث کا مقابلہ کرنا آتا نہیں، اگلی نسل میں کیا بانٹے گی؟ اپنے حقوق کا علم نہیں، اپنی اولاد کو کیا بتائے گی؟ ازدواجی زندگی کی پیچیدگیوں کو کیسے سلجھائے گی؟ بند گلیوں اور اندھے موڑوں سے کیسے گزر پائے گی؟ ازدواجی زندگی ناکام ہونے کی صورت میں کیا ٹھکانہ ہو گا؟ پیٹ بھرنے کے لئے کس کے آگے ہاتھ پھیلائے گی کہ ہنر سیکھنے کا تو نہ موقع ملا اور نہ مہلت۔

ہم اپنے کلینک میں اٹھارہ برس سے کم عمر کی بے شمار بچیوں کو دیکھتے ہیں جو نوعمری کے جسمانی مسائل سے الجھ رہی ہوتی ہیں۔ جسمانی تبدیلیاں، ہارمونز کا طوفان، شخصیت کی تکمیل کا فقدان، بچپن اور لڑکپن کے درمیان کھنچی دھندلی لکیر، آنے والی زندگی کا ذہنی بوجھ۔ انسانی نفسیات یہ کہتی ہے کہ دماغ کی مکمل نشوونما چوبیس پچیس کی عمر میں تکمیل پاتی

ہے۔ کیا کرنا ہے؟ کدھر جانا ہے؟ زندگی کیسے گزارنی ہے؟ عقل اس عمر کے بعد ہی کچھ اشارے دینا شروع کرتی ہے۔

کیا مرد کو کم عمر لڑکی اس لئے پسند ہے کہ نہ عقل مضبوط ہے اور نہ رائے۔ نہ اعتماد سے بات کر سکتی ہے اور نہ ہی بات ماننے سے انکار۔ نہ آزادی کا معنی جانتی ہے اور نہ حقوق کی طلب اور پاسداری۔ نہ پاؤں تلے زمین ہے اور نہ سر کے اوپر آسمان۔ سو بھیڑ بکری جیسی ہوئی نا، جب چاہا، جہاں چاہا، باندھ دیا۔

ہم نے بات سعودی عرب سے شروع کی تھی۔ ہمارے یہاں شاید بہت لوگوں کو علم نہ ہو کہ ہم اپنے خطے میں ان نازک مرحلوں سے بہت پہلے گزر چکے لیکن عرب شریف کی محبت میں اپنی تاریخ ہی سے انکار کرتے آئے ہیں۔ تاریخ کے جھروکوں سے جھانکتے کچھ لمحات ہمیں یاد آتے ہیں۔

1929 میں ہندوستان کی لیجسلیٹو اسمبلی میں ایک بل چائلڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ کے نام سے پیش کیا گیا اور اس مسودہ قانون کو پیش کرنے والے تھے ہماری قوم کے نجات دہندہ، قائد اعظم محمد علی جناح۔ آج سے نوے سال قبل اس بل کے مطابق لڑکی کی شادی کے لئے کم از کم عمر اٹھارہ برس مقرر کی گئی تھی۔ ان گنت علمائے کرام، ہر فرقے اور رنگ کے پیشوا، اس قانون کی مخالفت میں لنگر لنگوٹ باندھ کر میدان میں اتر آئے۔ فتووں کی بہار اتر آئی۔ ان علما کی تقلید میں، برصغیر میں کم سن مسلم لڑکیوں پہ ظلم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ آنکھیں بند کر کے فتووں پہ عمل کرنے والے والدین نے علمائے کرام کی طرف سے اس قانون کی مخالفت کے فتوے پہ خوب عمل کیا تھا اور اس طوفان کی لپیٹ میں آنے والی ہزاروں کم عمر لڑکیاں اندھا دھند بیاہ دی گئیں۔

کاش آج وہ علمائے کرام زندہ ہوتے اور عرب کی سرزمین پہ ہونے والی فکری تبدیلی کو دیکھتے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ انھیں گریبان میں جھانک کے شرمندہ ہونے کا خیال آتا یا نہیں؟

یہ ارتقا کا چلن ہے کہ ہر زمانے میں
پرانے لوگ نئے آدمی سے ڈرتے ہیں

موم بتی والی عورتوں کو اللہ غارت کرے!

خلیل الرحمن قمر نے عجب وصف پایا ہے، جب بھی منہ کھولتے ہیں، دانائی اور علم ودانش کے پھول جھڑتے ہیں اور ہم ان کے دہن دریدہ سے بر آمد ہوتے رموز بے خودی پہ سر دھنتے ہیں

ارشاد فرماتے ہیں " عورتوں کی اکثریت مجھے بہت پسند کرتی ہے، واری صدقے جاتی ہے، بس پینتیس چھتیس موم بتی والی عورتیں ہیں جو میرے خلاف بولتی ہیں"

کیا کہیے سوائے اس کے کہ چلیے گیارہ کروڑ میں سے پینتیس چھتیس تو جی دار نکلیں اور صد شکر کہ ہمارا بھی اسی قافلہ حریت میں شمار قرار پایا۔

مزید گل افشانی کرتے ہیں:" مرد تو عورت کی ساری عمر خدمت کرتا ہے، پہلے کما کے ماں کے ہاتھ پہ تنخواہ رکھتا ہے، پھر بہنوں کی شادیاں کرتا ہے، پھر بیوی کے پیٹ کی فکر کرتا ہے، پھر بیٹی کو پالنے پوسنے کی ذمہ داری اٹھاتا ہے۔ آخر بے چارہ اور کیا کرے؟ "

اور اسی بے چارگی کے زیر اثر خلیل الرحمن کچھ اردو اور کچھ انگریزی کی بھاری بھر کم گالیوں کا سہارا لینے پہ مجبور ہو جاتے ہیں۔ شعور کی سطح کمزور ہو، اخلاقی قامت پست ہو تو ضعف ضمیر سے کانپتے ہاتھ پیروں کو کمزور مرد اسی بدزبانی سے سنبھالا کرتے ہیں۔

محترم خلیل الرحمن غالباً عورت کے حقوق کا مطلب ماں اور بیوی کا پیٹ بھرنا، چھت فراہم کرنا اور مناسب وقت پہ بہن بیٹی کو اپنے گلے سے اتار کر دوسرے کھونٹے سے باندھنے کے مترادف سمجھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے بے زبان بھیڑ بکریوں کو چارہ ڈالا جاتا

ہے، چھپر میں باندھا جاتا ہے، دودھ دوہا جاتا ہے، فروخت کیا جاتا ہے اور جب دل چاہے ذبح کیا جاتا ہے۔ ان کا مالک بھی تو یہی سمجھتا ہے، اب اس کے علاوہ اور کیا کروں؟

محترم مزید فرماتے ہیں " ہماری مٹی کی روایات اور معاشرے کی اقدار مغرب سے مختلف ہیں، ہم کچھ عورتوں کی بے سروپا باتوں کی وجہ سے اسے نہیں بدلیں گے "

بالکل ٹھیک کہتے ہو خلیل الرحمن قمر، یہ وہی سرزمین ہے جہاں عورت شوہر کے مرنے کی صورت میں ستی کی جاتی تھی اور آج بھی بیوہ کو زندگی کے رنگوں کی طرف لوٹنے کا حق نہیں دیا جاتا۔ یہ وہی معاشرہ ہے جو عورت کو زمین وجائیداد میں حصہ دینے کی بجائے قرآن سے شادی کا جعلی اور بھونڈا ڈرامہ رچاتا ہے۔ یہاں کی اعلی اقدار وہی ہیں جہاں عورت کو مرد کی غلطیاں معاف کرانے کے لئے ونی یا سوارہ کیا جاتا ہے۔ یہ وہی عالیشان روایات ہیں جہاں عورت پٹتی ہے، گالیاں کھاتی ہے بالکل اسی طرح جیسے تم نے ایک خاتون کو اپنے ڈرامے پر تبصرہ کرنے پہ دی ہیں۔

اگر اس پہ غصہ ٹھنڈا نہ ہو تو منہ پہ تیزاب پھینکنے کی باری آتی ہے، نازک حصے بجلی کی راڈ سے داغے جاتے ہیں، ریپ کر کے توڑا پھوڑا جاتا ہے، چولہے پھٹتے ہیں، اور مالک کی بخشی ہوئی زندگی چھین لی جاتی ہے کہ روٹی کھلانے والے کو زعم اس قدر ہے اپنی مہربانی کا کہ اس کا خراج لے کر اپنی وحشتوں کو بجھانا اسے بھاتا ہے۔

کیا آپ سننا چاہتے ہیں اس سوال کا جواب کہ عورتوں کی اکثریت کے منہ میں ویسی زبان اور رویے میں ویسا احتجاج کیوں نہیں جو پینتیس چھتیس عورتیں موم بتی جلا کے کرتی ہیں۔ خلیل الرحمن قمر کے زہر اگلتے قلم اور گالی دیتی زبان پہ صدقے واری ہونے والی کون ہیں یہ آخر؟

خلیل الرحمن قمر، آؤ بتائیں تمہیں کہ مسوجنی نظام ہے کیا اور یہ کیسے کام کرتا ہے؟ (یہ لفظ misogyny شاید تم نے سن رکھا ہو پڑھے لکھوں کی کسی مجلس میں غلطی سے بیٹھے ہوئے۔ سمجھنے کی امید تو خیر تم سے کیا خاک ہو۔)

ماضی قریب ہی کی بات ہے نا جب وطن عزیز میں ہر طرف خود کش بمبار گھوم رہے تھے۔ چھوٹی عمر کے لڑکے، اپنی جان جانے کے غم سے بے نیاز، بے شمار بے گناہوں کی

ہنستی مسکراتی زندگیاں موت میں بدلنے کو ہمہ وقت تیار۔ نہ اپنے پیاروں کو چھوڑ کے جانے کا غم اور نہ اوروں کی زندگی اجاڑ دینے کی پریشانی۔ ان کے پاس نہ سوچ اپنی تھی، نہ خیال وی قین کے مالک تھے۔ پھر کیسے بے شمار ماؤں کے ان گنت معصوم جگر گوشوں کو سنگ سیاہ جیسے دل رکھنے والے روبوٹس میں بدل دیا گیا؟

ان معصوموں کے ذہن کی کوری تختی وہ سب لکھ دیا گیا جو کسی نامعلوم کے مفادات کا تحفظ کرتا تھا۔ کسی خاص مکتبہ فکر کی دانش استعمال کرتے ہوئے انہیں یہ باور کرا دیا گیا کہ انسانیت کی فلاح اور ترویج کے لئے ان کی جان کی قربانی اشد ضروری ہے۔ بدلے میں رب کائنات انہیں جنت میں اعلیٰ مقام اور حسین و جمیل حوروں کا جھمگٹ عطا کرے گا۔ ناپختہ، کم فہم، زمانہ ناشناس ذہنوں کو یہ سبق اتنی دفعہ گھول کے پلایا گیا کہ وہ اس کی حقانیت پہ یقین لا کے خود ساختہ معرکہ حق و باطل میں بلاخوف و خطر کود پڑے۔ ان کو ایقان کی منزل پہ پہنچا دیا گیا تھا اور جب یقین حاصل ہو جائے تو آگے کی منزلیں سر کرنا مشکل نہیں ہوا کرتا۔

مسوجنی نظام یہی تکنیک بروئے کار لا کے عورت کو زیر کرتا ہے۔ اس نظام میں مرد کو خاندان کی اکائی میں کلیدی حیثیت دی جاتی ہے اور عورت کو اس کے گرد طواف کرنے اور سوال نہ کرنے کا کردار سونپا جاتا ہے۔ عورت کیا کرے گی؟ کیسے رہی گی؟ زندگی کیسے گزارے گی؟ شریک حیات کسے چنے گی؟ کس سے بات کرے گی؟ کس سے منہ پھیر کے کھڑی ہو گی؟ اس فیصلہ سازی کا حق مرد اپنے پاس رکھتا ہے اور تمام عمر کی مشقت عورت کے کندھے پہ رکھ کے ہاتھ میں لاٹھی لیے ہانکنا شروع کرتا ہے۔ لیجیے جہاں کسی نے سر اٹھایا، وہ آئی چھمک۔

اس طویل منصوبہ بندی کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ عورت اسی روپ میں ڈھلتی ہے جیسا مرد چاہتا ہے۔ اس کا ذہن اسے وہ باور کراتا ہے جو مرد اس کے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ گونگی، بہری، اور اندھی بنادی جاتی ہے۔ وہ ایک دائرے میں مقید ہو کے اس سے باہر کا منظر دیکھ ہی نہیں پاتی۔ اس کی مرضی اور رائے مختلف ہو سکتی ہے، کہنا سیکھ ہی نہیں پاتی۔ اس کو زندگی کا کیا رنگ برتنا پسند ہے، بتا ہی نہیں پاتی۔

اس لئے کہ کوری تختی پہ مرد نے کندہ کر دیا ہے کہ عورت صرف وفاداری، پاکیزگی، بے لوث ممتا اور قربانی کے کردار میں جچتی ہے اور مرد کو صرف اسی مقام پہ قبول ہے۔

اس نظام سے بغاوت کرنے والی سرکش عورت کے بارے میں یہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ اس کے حصے میں خاندان کی تھو تھو کے علاوہ معاشرے کی سنگ باری بھی آئے گی۔ کیا کیجئے، جگ ہنسائی سے بچنے کے لئے عورتوں کی اکثریت بھی مجبوراً اس نظام کا حصہ بن کے اپنے ہی قاتل کو مسیحا مان لیتی ہے اور تم جیسے ذہنی کبڑے مرد ان غلام جسموں کی مجبوریوں کو پسندیدگی جان کر اپنے آپ کو ہی تھپکیاں دیتے رہتے ہیں۔

باقی رہ گئیں ہم جیسی، پینتیس چھتیس باغی عورتیں جو اس ظالم نظام کو سمجھ کے ان کچلی ہوئی عورتوں کی مدد کے لئے فکر اور سوچ کے دیے جلاتی ہیں، سنگ باری کی صلیب اٹھاتی ہیں، الزام و دشنام کی تیز دھار پہ چلتی ہیں، تو اسی نظام کے ٹکڑوں پر پلنے والے تم جیسے خانہ زاد، لے پالک کارندے انہیں " موم بتی والی.... عورتیں کہہ کر اپنا جی خوش کرتے ہو۔

ہمیں فخر ہے کہ ہم نے انصاف کی یہ شمع روشن کی ہے، زندگی کی سنگلاخ راہوں میں اپنے حصے کا دیا جلایا ہے۔ یہ تو آنے والا مورخ ہی بتائے گا کہ تاریخ کی شمع ہماری لوحوں پر روشن ہو گی یا خلیل الرحمن اس انعام کا حق دار ٹھہرے گا؟

آج کے تقویم میں بہر حال یہ نظر آتا ہے کہ خلیل الرحمن قمر کے لئے عقیدت کی موم بتیاں نہیں جلائی جائیں گی، کافوری اگر بتیاں سلگائی جائیں گی جن سے اسی طرح دھواں اٹھے گا جیسے 35 یا شاید 36 عورتوں سے تنقید سن کر تمہارے لفظ ختم ہو جاتے ہیں، دلیل تمہارے پاس کبھی تھی نہیں، گالیاں تمہارے دہان بے لگام سے بے دریغ بر آمد ہوتی ہیں اور تم شاید بازاری گالیوں ہی کو ڈرامائی مکالمے کی معراج سمجھتے ہو۔ تم بھلے اپنی کھوٹے سکے جیسی بے وقعت عقل کے مطابق مقبول ڈرامے لکھ کر کلاشی چوک میں بد تمیزی کا لائسنس لے لو لیکن تمہیں بتا دینا چاہیے کہ تاریخ کے صدیوں پر پھیلے ہوئے ڈرامے میں تمہارا اپنا کردار محض ایک مسخرے کا ہے اور ایسا بد نصیب مسخرا جس کی ہونق حرکتوں پر کسی کو ہنسی نہیں آتی، تمہاری جہالت پر رحم آتا ہے۔

سڑک زنانہ یا مردانہ نہیں ہوتی

آج ہم نے زور زور سے گاڑی کا ہارن بجایا اور کئی منٹ تک بجاتے ہی چلے گئے۔ ایک ایسی جگہ پہ جہاں دور دور تک ہارن کی آواز سنائی نہیں دیتی بلکہ ہارن بجانا بد اخلاقی میں شمار ہوتا ہے۔ یہ کارنامہ کرنے کے بعد ہمیں کچھ کمینی سی خوشی محسوس ہوئی کہ ہم عورتوں کو، مردوں کی اکثریت کم عقل ڈرائیور پکار کے ٹھٹھے لگاتی نظر آتی ہے۔

کوئی گاڑی سڑک پہ غلط موڑ کاٹ لے، آہستہ چل رہی ہو، اوور ٹیک کی جسارت نہ کرے، فوراً اندازہ لگایا جاتا ہے 'ضرور زنانی چلا رہی ہوئے گی'

ہم نے میڈیکل کالج سے نکلنے کے بعد ڈرائیونگ سیکھی۔ صاحب سے سیکھنے کا خطرہ مول نہیں لیا، علم تھا کہ چھوٹی سی غلطی پہ بھی ایسی ڈانٹ پڑے گی کہ دل اچھل کے حلق میں آ جائے گا۔ سوچا کہ کسی ڈرائیور سے سیکھنی چاہیے۔ سو یہی ہوا، ہم جب بھی کوئی غلطی کرتے، ایک گرج دار آواز اور قہر آلود نظروں کی بجائے ایک مؤدب سی آواز آتی،

" باجی! ذرا گئیر تو تبدیل کر لیں، باجی! زور سے بریک نہ لگائیں، باجی! کلچ سے پاؤں اٹھا لیں"

نوے کی دہائی کے شروع سے گاڑی چلانی شروع کی اور عورت ذات پہ لگے الزامات کو دھونے کی کوشش کرتے کرتے دبنگ ڈرائیور بن گئے۔ سمجھ جائیے کہ آج ہارن بجانا اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

مشرق وسطی میں ڈرائیونگ کی رفتار تیز ضرور ہے لیکن نپی تلی بھی ہے۔ ہر گاڑی اپنی لین میں چلتی ہے، لین تبدیل کرنے سے پہلے دیکھا جاتا ہے کہ کوئی اور گاڑی زیادہ قریب

تو نہیں اور اشارہ لازمی دیا جاتا ہے۔ ہارن بالکل نہیں بجایا جاتا اور اگر کوئی ہارن بجائے تو یہ دوسرے ڈرائیور کے لئے شرمندگی کا باعث ہے۔ ہمارے لئے یہ بات باعث افتخار ہے کہ آج تک ہمارا چالان نہیں ہوا۔

ہم اپنے بیٹے کو سکول سے لینے جا رہے تھے اور اپنی لین میں سکون سے کھڑے اشارہ کھلنے کے منتظر تھے۔ جونہی اشارہ کھلا، ہماری ساتھ والی لین سے ایک گاڑی انتہائی بھونڈے پن سے ہماری لین میں اس طرح سے آگھسی کہ اگر ہم زور سے بریک نہیں لگاتے تو حادثہ ہونا لازم تھا۔ گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی لیکن ہمارا پارہ گرمی پکڑ چکا تھا۔ ہم نے ہارن بجایا اور بجاتے ہی چلے گئے۔ یہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو تنبیہ تھی۔ اور اس واقعے سے ہمیں ایک بھولی بسری بات یاد آگئی۔

اکیسویں صدی کا اوائل تھا اور ہم راولپنڈی کینٹ میں رہا کرتے تھے۔ راولپنڈی کینٹ کچھ ایسا علاقہ ہے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ (ڈاکٹر صاحب، بیرون ملک قیام سے ناجائز فائدہ مت اٹھائیں۔ راولپنڈی کے بارے میں تنقیدی کمنٹ قومی مفاد کے منافی ہے۔ مدیر) ابھی ایک فوجی یونٹ نظر آئے گی جس کے گیٹ پہ باوردی سپاہی بندوق تھامے کھڑا ہو گا اور ساتھ میں ہی عوام الناس کے گھر اور ٹیڑھی میڑھی گلیاں ہوں گی۔ کہیں زمین اونچی نیچی ٹیلہ نما ہو گی تو کہیں نشیب میں پانی بہہ رہا ہو گا۔

ہمارے اماں ابا کے گھر کو جانے والی سڑک کے شروع میں ایک بازار تھا۔ بازار کے اختتام پہ ایک چھوٹی پلی تھی جو شاید کسی برساتی نالے کے لئے بھلے وقتوں میں بنائی گئی تھی۔ پلی پار کرنے کے بعد سڑک دورویہ ہو جاتی تھی۔

بازار تک تو سب صحیح تھا لیکن پلی پار کرنا کسی صراط مستقیم سے کم نہ تھا۔ پلی کی چوڑائی صرف ایک گاڑی جتنی تھی سو دونوں طرف کی ٹریفک باری باری اس پہ سے گزرتی تھی۔ اب ٹریفک کانسٹیبل تو تھا نہیں کہ ایک طرف والوں کو روکتا اور دوسری طرف والوں کو گزرنے دیتا۔ سو سب نے خود ہی یہ اصول اخذ کر لیا کہ جس طرف سے بھی کوئی گاڑی پلی پہ پہلے چڑھ جائے گی، دوسری طرف والی گاڑی رک جائے گی اور انتظار کرے گی کہ پہلے سے پلی پہ موجود گاڑی پلی پار کر لے۔ ایسا سالہا سال سے ہوتا آ رہا تھا۔

ہم اکثر شام کو ہسپتال سے آنے کے بعد بچوں کو گاڑی میں بٹھاتے اور اپنی لال آلٹو چلاتے ہوئے اماں سے ملنے روانہ ہو جاتے۔ آتش جوان تھا(حیدر علی آتش 1848ء میں وفات پا گئے۔ انہیں اگر اپنا مصرع آپ کے پلے پڑنے کا اندیشہ ہو تا تو آگ تخلص فرماتے۔ آتش جوان تھا کی بجائے آپ کی آتش بجانی کی رعایت سے " آگ بھڑک رہی تھی" لکھتے ۔ مدیر) سو گاڑی میں میوزک بھی اونچے سروں میں بجتا، گاڑی بھی خوب تیز چلتی اور پکے ڈرائیوروں کی طرح اونچا اونچا بولتے، تیوریاں چڑھاتے جب تک اماں کے گھر پہنچتے، مزاج برہم ہو چکا ہوتا جو اماں کا بوسہ پا کے فوراً ہی خوشگوار ہو جاتا۔

سرما کی ایک ڈھلتی شام تھی، جب ہم پلی تک پہنچے۔ پلی کے دوسری طرف ایک ٹرک تھا جو کچھ فاصلے پہ تھا۔ ہم نے بلا خوف و خطر پلی پہ گاڑی چڑھادی کہ ہم پلی کے آغاز تک پہلے پہنچ چکے تھے۔ دوسری طرف آنے والے ٹرک کا ڈرائیور شاید اپنے ٹرک کے خمار میں تھا یا شاید ایک عورت کو گاڑی میں دیکھ کے اس کی کوئی رگ پھڑک اٹھی تھی۔ ہم جو مزے سے پلی کے وسط تک پہنچ چکے تھے دیکھا کہ ٹرک بھی پلی پہ چڑھ کے ہماری طرف چلا آرہا تھا۔

"ارے یہ کیا؟ یہ رکا کیوں نہیں؟ دیکھ تو لیا تھا اس نے کہ ہم پہلے سے پلی پہ ہیں" ہم بڑبڑائے۔

اب صورت حال کچھ یوں بنی کہ ہم پلی کے وسط سے تھوڑا آگے اور وہ وسط سے تھوڑا پیچھے، پلی پہ ایک ٹرک میں بیٹھے دو مرد اور چھوٹی گاڑی میں بیٹھی ایک عورت ایک دوسرے کو خشمگیں نظروں سے گھور رہے تھے۔ ہم نے ٹرک کے کنڈیکٹر کو اپنی طرف آتے دیکھا

"بی بی، اپنی گاڑی پیچھے کرو"

ہمارے تو مانو تلووں میں لگی اور سر میں بجھی!

"کیوں؟ میں پلی پہ پہلے چڑھی ہوں، تم مجھے دیکھ کے سائیڈ پہ رکے کیوں نہیں"

"او بی بی، بس ہم آگیا، اب تم گاڑی پیچھے کرو"

"میں کیوں کروں، تم ٹرک پیچھے کرو"

"بی بی، ٹرک پیچھے کرنا مشکل ہے، تمہاری چھوٹی گاڑی ہے"

"دیکھو، بڑی چھوٹی میں نہیں جانتی، میں پل پہ کافی آگے ہوں، غلطی تمہاری ہے سو تم ٹرک پیچھے کرو"

"او بی بی، یہ نہیں ہو سکتا"

"پھر ہم سے بھی یہ نہیں ہو سکتا"

ٹرک کا ڈرائیور بھی نیچے آ چکا تھا، تو تو میں میں سن کے خلق خدا بھی اکٹھی ہو چکی تھی۔ ہمیں عورت سمجھ کے مفت مشوروں سے نوازا جا رہا تھا کہ ہمیں بات مان لینی چاہئے۔ ہمارا موقف تھا کہ ہم حق پہ ہیں، ٹرک ڈرائیور نے ہمارا حق غصب کرنے کی کوشش کی ہے جو ہم کرنے نہیں دیں گے۔

جب بات کسی طرح نہ بنی، ہم نے گاڑی بند کی، اور یہ کہتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئے کہ میں تو پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ اب تم لوگ خود ہی فیصلہ کر لو۔

پلی کے دونوں طرف گاڑیوں کی لمبی قطار تھی اور بھانت بھانت کی بولیاں تھیں۔ ہمارا سکون اور اپنے فیصلے کو نہ بدلنے کا ارادہ دیکھ کے لوگوں نے ڈرائیور کو سمجھانا شروع کیا جس کا بس نہیں چلتا تھا کہ ہمیں کچا چبا ڈالے۔

کچھ لوگوں نے ٹرک کی پیچھے والی گاڑیوں کو ریورس کرانا شروع کیا۔ ٹرک ڈرائیور زیر لب گالیاں دیتا ٹرک میں بیٹھا اور ٹرک کو پیچھے لے جانا شروع کیا۔ ہم نے گاڑی سٹارٹ کی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھاتے پلی پار کی۔ ہمارے لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔ ہم نے اپنا حق چھین کے واپس لیا تھا۔

خواتین ڈرائیوروں کو کم عقل اور اعتماد سے عاری سمجھنے والوں کو سمجھ لینا چاہئے کہ جس معاشرے میں عورت کے پر ہر دم جلتے ہوں، جہاں امتیازی رویوں کے کوڑے اوائل عمری سے جسم و جان کو زخمی کرتے ہوئے عورت کو ملکیت کے خانے میں رکھتے ہوں، وہاں ہر وہ عورت جو اس جنگل میں باہر نکل کے ہمت آزمانے کی جرات کرے، ستائش کی مستحق ہوا کرتی ہے۔

سراج الحق کی بیعت کا اعلان: میرا جسم تمہاری مرضی

ہم سراج الحق کے مداح تو پہلے سے تھے لیکن اب تو معتقدین میں شامل ہو گئے، جب سے انہوں نے " میرا جسم میری مرضی" جیسے بے ہودہ نعرے کے خلاف ملک گیر مہم چلانے کا اعلان کیا ہے۔

آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چار بیویوں، بے شمار لونڈیوں اور ستر حوروں کا نجات دہندہ اس بے ہودہ نعرے کو معاشرے میں قبولیت کی سند بخش دے۔

دیکھیے نا، آج تک تو عورت تفسیر تھی

" میرا جسم آپ کی مرضی"۔

اچھا بھلا کام چل رہا تھا کہ نہ جانے کچھ کلموہیوں کو کیا سوجھی۔ کہتی ہیں ہمیں بھی انسان سمجھو، لو بھلا انسان ہی تو سمجھتے ہیں، جبھی تو جب ضرورت پڑے، آواز دے لیتے ہیں۔ کبھی کسی نے بھیڑ بکری کو ساتھ سلایا ہے کیا؟

بخدا ہمیں سراج الحق صاحب کی ذہانت و فطانت پہ قطعی کوئی شبہ نہیں۔ جب وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کیا مضائقہ ہے۔ اگر عورت اپنی مرضی کے خلاف کسی چولہے کے پھٹنے میں راکھ ہو جائے۔ کیا ہوا، جو مرضی نہ ہوتے ہوئے منہ پہ پھینکے گئے تیزاب سے زندگی عذاب بن جائے یا لوہے کی راڈ سے نازک اعضا داغے جائیں۔ اور اس لاجواب امر کا کیا کہنا جب وہ چھوٹی سی عمر میں کسی ادھیڑ عمر سے بیاہ کے اس کی بجھتی جوانی کی تسکین کا باعث بنے۔ ثواب کی پوٹلی تو اور بھی بھاری ہو سکتی ہے اگر وہ کم عمر غیر مسلم بھی ہو۔

یہ موئی مرضی جائے بھاڑ میں اگر کسی نوجوان سے شغل میلے میں ریپ ہو جائے۔ مرضی کو کیا فریم کروا کے دیوار پہ لگا لیں۔ اگر کوئی عورت باپ بھائی کے گناہوں کا کسی جرگے میں ونی یا سوارہ کے طور کفارہ نہ دے سکے۔ آگ لگے ایسی مرضی کو جو بھائیوں کے مفاد کے لئے قرآن سے شادی نہ کر سکے۔ دیکھیے نا عورت تو کھیتی ہے اور ضرورت پڑنے پہ اگر کھیتی بنجر نکل آئے تو ہم ایسی کھیتی کو آگ نہ لگا دیں۔

سراج الحق صاحب کی تحریک کا نیک مقصد مردوں کا موقف ہی تو اجاگر کرنا ہے جن کا کہنا ہے کہ عورت کو اپنے دماغ پہ زور دینے کی مشقت میں کیوں ڈالا جائے۔ جب فکر کرنے والے موجود ہیں تو جیسے وہ چاہیں، عورت زندگی گزار دے۔ جہاں بٹھائیں، جو کھلائیں، جیسا مرضی سلوک کریں، جس کے ساتھ چاہے رخصت کریں، بولنے کی ضرورت کیا ہے آخر؟ کچھ مشرقی معاشرے میں شرم وحیا کے بھی تقاضے ہوا کرتے ہیں۔

شوہر کے گھر پہنچ کے بھی اطاعت گزاری تو واجب ہے نا۔ دیکھیے نا، کھلاتا پلاتا ہے، پہناتا ہے، گرمی و سردی سے چھت دے کے بچاتا ہے۔ کیا ہوا، اس کے بدلے میں جب دل چاہے، دھن کے رکھ دے۔ کیا فرق پڑتا ہے اگر باہر کا غصہ گھر میں عورت پہ نکال لے۔ کیا ہوا، اگر عورت کو دو کوڑی کا سمجھ لے۔ ارے کیا قیامت آ گئی اگر عورت کی وفاداری پہ سوال اٹھا ڈالے۔ یہ تو بچے بچے کی زبان پہ ہے (بلکہ ازلی نابالغ خلیل الرحمن قمر تک جانتے ہیں) کہ وہ تو عورت ہی نہیں جس کا خمیر وفا سے نہ اٹھا ہو۔

سراج الحق صاحب کا ماتھا ٹھنکتا ہے معاشرے کے اس چلن سے جب کچھ مادر پدر شوہر آزاد اور مرد مار قسم کی عورتیں معاشرے کی معصوم عورتوں کو ورغلاتی ہیں۔ ارے سمجھاتی ہیں انہیں کہ تمہاری مرضی بھی کسی چڑیا کا نام ہے۔ تعلیم حاصل کرنے پہ، کام کرنے پہ عورت کا بھی پورا اختیار ہے۔

پٹیاں پڑھاتی ہیں بھولی بھالی عورتوں کو کہ اپنے جسم کو مرد کی دست برد سے بچانا، اپنے آپ کو موت کی دہلیز تک نہ پہنچنے دینا، اپنے آپ کو مرد کی مغلظات سے محفوظ رکھنا، زدوکوب نہ ہونے دینا عورت کا حق ہوا کرتا ہے۔ یہ تو ہمارے معاشرے کی بنیادیں کھوکھلی

کرنے کے مترادف ہوا نا کہ جو نظام صدیوں سے چلا آرہا ہے، اس کو کچھ مغرب زدہ، گمراہ عورتوں کے ہاتھوں تباہ ہونے دیا جائے۔

ویسے شاید سراج الحق صاحب کو علم نہیں کہ مرد کی عورت کے جسم پہ مرضی کا سبق مغرب نے بھی پڑھ رکھا تھا اور آج بھی کہیں کہیں یہ چلن ہے۔ یہودی آرتھوڈوکس اور رومن کیتھولک فرقے وہاں بھی عورت کو اتنا ہی ناقص العقل، حقیر اور بچے پیدا کرنے کا کارخانہ سمجھتے ہیں۔ بس فرق اتنا ہے کہ وہاں کچھ کمزور مرد عورت کی بات کو سن بھی لیا کرتے ہیں اور عورت کے ساتھ ہمدردی بھی جتا لیتے ہیں۔

ہماری تجویز ہے جماعت اسلامی کی مرکزی انتظامیہ سے کہ آئندہ مغرب میں جب بھی تبلیغی گروہ بھیجیں، لازم قرار دیا جائے کہ وہاں کے بزدل مردوں کو آگاہ کیا جائے کہ جب اللہ نے مرد کو برتر بنا کے عزت بخش ہی دی ہے تو کچھ چلتر عورتوں کے جال میں پھنس کے اتنی کمزوری دکھانے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟

ہم اعلان کیے دے رہے ہیں کہ سراج الحق صاحب کی تحریک کے ہراول دستے میں ہم بھی موجود ہوں گے، اپنے ہاتھ میں کتبہ لیے،

"میرا جسم تمہاری مرضی؛ جیسے چاہو روندو، جیسے چاہو دفن کرو"

چڑیل عورتیں اور ایک بے چارہ غیرت مند مرد

کمال ہے بھئی، ہم تو شدید حیرت کا شکار ہیں آج کل!

کسی شخص کا انتہائی زہر آلود لہجہ اور چھلنی کرتے گستاخ الفاظ ہوں، گھمنڈی انداز ہو، کسی اور کو فکری اختلاف کی صورت میں انسان ہی نہ سمجھے، پھر بھی دیوتا ہی سمجھا جائے، پھر بھی چاہا جائے۔ معاشرے کے مرد و زن کی ایک بڑی تعداد اس کے حق میں خم ٹھونک کے میدان میں اتر آئے اور تاویلات کا ڈھیر لگا دے کہ حضور سے آخر ایسا ہوا کیوں؟

"سامنے والی عورت نے اسے اشتعال دلا دیا"

"اس کی بات بار بار کاٹی"

"اس عورت کا مقصد ہی اسے غصہ دلانا تھا"

"اس عورت نے اسے بات نہیں کرنے دی"

"وہ عورت ہے ہی گمراہ اور اسفل السافلین"

ہم خلیل الرحمن قمر کی اصلیت سے واقف ہوتے ہوتے ایک اور کیفیت کا شکار ہوئے اور خود کلامی کرتے ہوئے اپنے آپ سے ایک ہی سوال پوچھتے رہے،

"یہ کیسی ہمدردی ہے جو ایک شخص کے متشدد الفاظ اور جارحانہ پن کے باوجود ہر کسی کے رگ و پے میں اتر آئی ہے"

چونکہ تشخیص کرنے کے مرض میں مبتلا ہیں، سو سوچ بچار کے بعد علم ہوا کہ کرونا وائرس کے ساتھ ساتھ معاشرہ "Himpathy" کا بھی شکار ہو چلا ہے۔

صاحبان علم sympathy اور empathy کے بارے میں تو جانتے ہی ہوں گے۔ sympathy کسی دوسرے انسان کو مشکل میں دیکھ کے ہمدردی کا نام ہے اور

empathy وہ خاص قسم کی ہمدردی جو کسی دوسرے کے کڑے وقت کے خیالات وجذبات کو اپنے پہ طاری کر کے محسوس کی جائے۔

حال ہی میں کورنل یونیورسٹی امریکہ کی فلاسفر پروفیسر کیٹ مین (Kate Manne) نے himpathy کی اصطلاح روشناس کرائی ہے۔

"یہ وہ ناجائز اور بے حقیقت ہمدردی ہے جو مسوجنسٹ مردوں کو عورت پہ ہر طرح کی زیادتی یا بدتمیزی کرنے کے باوجود دی جاتی ہے "

اسی بات کو بیٹی فریڈن نے 1963 میں اپنی مشہور عالم کتاب The feminine Mystique میں ایک ایسے مسئلے کے طور پہ اجاگر کیا ہے جو موجود تو ہے لیکن کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔

Himpathy پدرسری معاشرے کا وہ بدصورت سچ ہے جہاں مرد کسی بھی گھٹیا صورت حال سے بری الزمہ ہونے کے ساتھ ساتھ بے تحاشا ہمدردی کا مستحق بھی ٹھہرتا ہے اور اس کے ہر فعل کی توجیہ گھڑ لی جاتی ہے۔

Himpathy کا شکار ہونے والوں میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کم نہیں۔ بات کچھ یوں ہے کہ پدرسری نظام کی بالادستی سے جنگ کرنا جلتے انگاروں پہ چلنے کے مترادف ہوا کرتا ہے۔ یہ ایقان و عزم ہر عورت کے حصے میں نہیں آیا کرتا کہ وہ ان حدود وقیود سے باہر نکلنے کا سوچے جس کا شیریں زہر اسے بچپن سے پلایا گیا ہو، سوال نہ پوچھنے اور اپنی مرضی کا اعلان نہ کرنے کی تربیت دی گئی ہو۔

معاشرے کی تھپکی لے کے خوش ہو جانے والیوں کو عافیت اسی میں نظر آتی ہے کہ طاقتور کی نظر کرم میں رہا جائے، اپنی ہی صنف پہ کیچڑ اچھال کے اچھی عورت ہونے کا تمغہ حاصل کیا جائے۔ اچھی عورت بننے کی توقعات کی زنجیر میں جان چھڑکنے والی ماں، وفادار بیوی، مؤدب بیٹی اور خدمت گزار بہن کے کردار بتا دیے گئے ہوں۔

معاشرے میں مرد کی آشیرباد سے ملنے والی سوشل کرنسی سے عورت معتبر ٹھہرتی ہے اور جوابا Himpathy کی راہ پہ چلتی ہے۔ عورت کے لئے Himpathy کی راہ

آسان ہے، سنگ باری کا سامنا اور بری عورت ہونے کا حصے میں نہیں آتا چاہے اندر کی آواز سب زنجیریں توڑ دینے کا ہی کیوں نہ کہتی ہو۔

اپنے حق کے لئے آواز اٹھانے والی عورت سر پہ چھت اور دو وقت کی روٹی کے جھانسے میں نہیں آتی۔ پر کٹی چڑیا بن کے پنجرے میں چوری کھانے سے بہتر ہے، اپنے پروں کی پرواز کو آزمایا جائے۔ دانے دنکے کی کیا فکر؟

1956 میں بننے والی فلم 'مائی فیر لیڈی' میں ایک گیت شامل تھا۔ یہ ہم ان تمام عورتوں کے نام کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے Himpathy کا تمغہ نہیں پہن رکھا۔

Women are irrational
that's all there is to that
Their heads are full of cotton, hay, and rags
They're nothing but exasperating, irritating,
vacillating, calculating, agitating,
Maddening and infuriating
hags

ترجمہ:

(عورتوں میں عقل کہاں!
بات اتنی ہے کہ
ان کے کھوپڑی میں روئی، بھوسہ اور چیتھڑے ٹھنسے ہیں
مصیبت ہیں، ایک عذاب ہیں عورتیں
گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ
چلتر اور فسادی
لہو کھولتا ہے انہیں دیکھ کے
چڑیل ہیں یہ عورتیں)

خلیل الرحمن قمر نے اپنی اصل شکل دکھادی

ہمیں قطعی حیرت نہیں ہوئی کہ کس آسانی سے تم نے کروڑوں عوام کے سامنے منہ در منہ مغلظات بکیں۔ ہم اس لئے شانت رہے کہ ہمیں علم ہے ہر کمزور مرد کے پاس جب دلائل کی کمی ہو جائے، کہنے کو کچھ نہ رہے اور مردانگی جوش مارے تو منہ سے ایسے پھول ہی جھڑا کرتے ہیں۔ ہمیں ان الفاظ کے سننے پہ غم بھی نہیں ہوا کہ ہمارے معاشرے کی خواتین کی اکثریت ایسے بدصورت پھول اپنے دامن میں سمیٹنے کی عادی ہے۔

تم عورت کے جسم کو کتنا حقیر جانتے ہو یہ آج علم ہو گیا۔ کس آسانی سے تم نے ایک عورت کو بھرے مجمعے میں بتا دیا کہ اس کے جسم میں کچھ بھی نہیں۔ ویسے یہ "کچھ نہیں" کی تشریح کرو گے تم کہ "کچھ" میں "کیا کچھ" گنتے ہو تم؟ اور کیا "کچھ" ہو گا تو تم اپنا لعاب دہن یا تمہاری زبان میں "تھوک" عنایت کرو گے؟

پورے ملک کے سامنے ایک عورت کے لگائے گئے ایک نعرے پہ اتنا اشتعال، اتنے آگ بگولا؟ لگتا ہے تمہارا خمیر کسی زہر آلود مٹی سے اٹھا ہے۔ تمہارا مزاج تشدد کی چغلی کھاتا ہے، تمہارے ننگے الفاظ تمہارے اندر کی بدصورتی کو نمایاں کرتے ہیں۔ تمہارا انتہائی سخت اور جارحانہ لہجہ تمہاری اصل شخصیت کے پول کھولتا ہے۔ تمہارا غرور بتاتا ہے کہ کون بے ادب، ادب کی چادر کی جھوٹی اوٹ لئے معاشرے میں پاگل پن کا بیج بو رہا ہے۔

لیکن ہمیں تو شکریہ ادا کرنا ہے تمہارا کہ تم نے دکھا دیا کہ ہمارے معاشرے کے اکثر مردوں کی اصلیت کیا ہے؟ وہ عورت سے مخاطب کیسے ہوتا ہے؟ عورت پہ چنگھاڑتا کیسے ہے؟ عورت کو کتنا غلیظ سمجھتا ہے؟ عورت کو کوڑا دان سمجھتے ہوئے کیسے اپنے مزاج کی

کڑواہٹ اس پہ انڈیلتا ہے ؟ عورت کو اپنے جیسا انسان سمجھنا تو دور کی بات، اسے دو کوڑی سے بھی ارزاں سمجھ کے اس کی عزت نفس تار تار کرنا اسے چنداں گراں نہیں گزرتا۔

آخر تمہارا دماغ تمہیں کیوں بھاتا ہے کہ " میرا جسم میری مرضی " کا معنی صرف وہی ہے جو تم اور تمہارے جیسے بہت سے مرد ازل سے جانتے ہیں اور شاید برت برت کے جانتے ہیں۔ خریدار بھی تم خود اور قاضی بھی خود!

ہمیں افسوس ہے کہ تمہارے نزدیک عورت کے جسم کا مصرف ایک ہی ہے کہ وہ تم اور تم جیسوں کی خلوتوں کی ساتھی رہے۔ تمہاری محدود و ناقص عقل جان ہی نہیں سکتی کہ عورت صدیوں سے حق تلفی کی زندگی گزارتے گزارتے، اپنے آپ کو پامال کرواتے، زندہ در گور قفس میں تھک چکی ہے۔ اب اسے تمہارے پڑھائے ہوئے مصنوعی وفا اور غیرت کے درس سمجھ میں نہیں آتے۔ وہی غیرت جو مرد کو ہاتھ اٹھانے اور زندہ در گور کرنے کا حق دیتی ہے اور وہی جھوٹی وفا جو عورت کو جسم کے پردے میں لپٹی ہوئی روح کو قربان کرنے کی تلقین کرتی ہے۔

جان لو آج اور سمجھ بھی لو کہ " جسم اور مرضی " نشان ہیں عورت کی شخصیت کے، جہاں وہ اپنے حق کی بات اور اپنی ذات کے دفاع کے طور پہ اس نعرے کو علامتی طور پہ استعمال کرتے ہوئے بتا رہی ہے کہ اس کا جسم جو ہمیشہ مرد کی نسبت سے معتبر ٹھہرتا ہے، اب اس نسبت کا تعین عورت کو خود کرنا ہے۔

اب اسے سوارہ نہیں بننا، ونی یا کاری نہیں ہونا، کنول پھول نہیں بننا، اپنے ختنے نہیں ہونے دینا، طلاق کے حق سے منہ نہیں موڑنا، چہرہ تیزاب سے نہیں جھلسوانا، پھٹتے چولہے کے سامنے نہیں مرنا، اسے کم عمر دلہن اور ماں نہیں بننا، اپنے جسم کو بچے پیدا کرنے کی مشین نہیں بنانا، ریپ نہیں ہونا، فحش جملے نہیں سننے، گرسنہ آنکھوں اور راہ چلتے ناپاک ہاتھوں کا لمس برداشت نہیں کرنا، قرآن سے نکاح نہیں پڑھوانا، کردار کی پاکیزگی ثابت نہیں کرنی، منہ پہ تھپڑ نہیں کھانے، اپنے جسم کو زدوکوب نہیں کروانا اور موت کے گھاٹ نہیں اترنا۔ اسے ایک انسان کے طور پہ جینے کے لئے تمہاری اجازت نہیں چاہیے۔

تمہیں آج کی عورت سے بہت چڑ ہے نا کہ یونیورسٹی کی فارغ التحصیل معاشرے کی اقدار خراب کرنے کو تلی بیٹھی ہے۔ گھر میں قید پابند سلاسل کو پندار نفس کا سبق پڑھا کے بہکا رہی ہے۔

آؤ تمہیں پچھلے زمانوں کی ایک خود شناس، وفادار، باکردار، سادہ لوح، خدمت گزار لیکن اپنی ذات کا احترام اور عزت نفس رکھنے والی ایک عورت کا قصہ سناؤں جس نے برسوں پہلے "میرا جسم میری مرضی" کا سبق عام کیا۔

گاؤں کی رہنے والی، پانچ جماعت پڑھی لکھی، زندگی کا ساتھی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ اور انتہائی مہذب، آپس میں بھرپور محبت، عزت اور گھر جنت کا نمونہ۔

اردگرد گالیاں کھا کے ذلیل ہونے اور پٹنے والیوں کی کمی نہیں تھی۔ اکثر کے شوہر جب چاہتے، مار پیٹ کے بعد کان سے پکڑ، نکال باہر کرتے۔ روتی پیٹتی میکے کو آتیں اور پھر کچھ عرصے بعد کان پکڑ کے معافی نامہ کر کے واپس جاتیں۔ ان عورتوں کو دیکھ کے وہ بے حد بدمزہ ہوتیں اور کہتیں،

"اگر میرا شوہر ایسا کرے تو میں فوراً گھر چھوڑ دوں اور پھر کبھی واپس نہ جاؤں"
پاس سے کوئی بچہ چٹکلا چھوڑتا

"لیکن کہاں رہیں گی آپ؟ گزارا کیسے کریں گی؟ نوکری کے لئے ڈگری تو ہے نہیں"

"ارے اپنی آن سے کچھ بڑھ کے نہیں۔ ڈگری نہ سہی، ہاتھ میں ہنر تو ہے۔ کپڑے سی لوں گی، کڑھائی کر لوں گی، آیا گیری کر لوں گی۔ یہ جو جسم ہے نا اس سے محنت مشقت کر لوں گی لیکن نہ گالی کھاؤں گی اور نہ تھپڑ"

یہ تھی میری ماں!
"میرا جسم میری مرضی" کی مکمل تفسیر!
جو علی الاعلان ہم بہنوں سے کہتی تھیں

"تم لوگوں کو میں نے اعلیٰ تعلیم ہی اس لئے دلوائی ہے کہ اپنی زمین اور اپنا آسمان خود دریافت کرنا۔ اپنے آپ کو شوہر کی زیادتی کا شکار مت ہونے دینا۔ بس اپنا کمانا اور عزت کی کھانا"

خلیل الرحمن قمر! آواز بلند کرنا بہت آسان ہے، کسی دوسرے کو حقیر جاننا بھی انتہائی سہل۔ تمہیں اپنے تلخ خیالات، سستی سوچ اور مرد ہونے کا گھمنڈ یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیتا کہ تم کس پاتال میں جا گرے ہو۔ تم کیا جانو کہ آدمی سے انسان بننے کی محنت کیا کچھ خرچ ہوتا ہے۔ تم ابھی اس منزل سے کوسوں دور ہو۔

سو کہتے رہو، جتنا اونچا بولو گے اپنا کردار دکھاؤ گے۔

تمہارے کہے اور کیے کی وضاحت دینے والے تمہارے بھائی بند جنہیں لگتا ہے کہ تم ایک عورت کے اشتعال دلانے سے اپنا ضبط کھو بیٹھے، تمہیں خدا جیسا بنا کے تمہارے جھوٹے طنطنے کو سہارا دینے میں مصروف ہیں۔ دماغ میں تو عورت کے لئے ایک ہی خیال راسخ ہے نا" ذات دی کوڑھ کرلی تے شہتیراں نوں جپھے"

ایک پاؤں میں پڑی مخلوق کے ہاتھوں صرف چار الفاظ" میرا جسم، میری مرضی" بولنے پہ ایک مصنوعی دیوتا اپنے غیظ و غضب کے زور پہ کیسے منہ کے بل آ گرتا ہے، یہ تین مارچ، 2020 کی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے رقم ہو چکا۔

چودہ سالہ بچی کے جسم کی مرضی

لیجیے عزیزان من! ایک اور کم عمر عورت کے جسم نے اپنی مرضی کر ڈالی!

راولپنڈی کے علاقے رتہ امرال کی رہائشی چودہ سالہ بچی ماں کے درجے پہ فائز ہوئی اور اپنے جیسی ایک اور بچی کو جنم دے دیا۔ گویا ایک اور عورت زمانے کی گردش یا کسی اور گھاگ شکاری کا شکار بننے کے لئے اس جنگل میں تشریف لے آئی۔

چودہ برس کی بچی کے جسم کو روندنے کے نتیجے میں بچی کی پیدائش کا سہرا چار مردوں کے سر بندھتا ہے۔ ہمسائے، ماں جائے جنہوں نے بن ماں کی بچی کا خیال رکھنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ بلکہ بچی کی تنہائی اور بے کسی کا خیال کرتے ہوئے گود میں ایک گڑیا کا تحفہ بھی ڈال دیا کہ آئندہ کے برسوں میں بچی اکیلی رہنے سے پریشان نہ ہو اور گڑیا سے دل بہلاتی رہے۔

چاروں بڑے جی دار نکلے کہ اپنی اولاد کا تحفہ دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ دیکھیے منٹو صاحب کا کہنا تو جھٹلا دیا نا کہ " عورت کے ساتھ داد عیش تو ہر کوئی دینا چاہتا ہے لیکن بچی کا باپ؟ مذاق چھوڑیے "۔ پس ثابت ہوا کہ یہ ادیب لوگ اناپ شناپ بکا کرتے ہیں۔

ہاں، ایک مشکل ضرور آن پڑی ہے۔ نہ جانے یہ گڑیا اسد علی کی غیرت کا شاہکار ہے یا بہادر علی کی بہادری رنگ لائی ہے۔ شنید ہے کہ جواں عمر اسد علی نے ہمسائے کی غیر موجودگی میں بن ماں کی بچی کا خیال رکھنے کا عزم کیا اور اس خیال کی روشنی میں اپنے دوست بہادر علی کو بھی شامل کر لیا۔ بچی کو منہ کھولنے کی صورت میں اگلے جہان بھیجنے کی دھمکی کا بھی

استعمال کیا۔ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ چوکھا آئے کے مصداق دونوں کئی ماہ تک کھل کھیلے۔

ایک روز دونوں اس مذموم کھیل کے بعد روانہ ہوئے ہی تھے کہ ادھیڑ عمر ہمسائے عابد نے مشکوک سرگرمیوں کی تفتیش میں بچی کے گھر گھسنے کا سوچا۔ عابد کی گناہ گار آنکھوں نے ایک معصوم چڑیا سی جان کو دو مردوں کی مردانگی کا شکار ہونے کے بعد نیم جان حالت میں اپنے آپ سے بے خبر پایا۔

معزز شہری، اخلاقیات کے خدائی فوجدار اور کئی بیٹیوں کے ادھیڑ عمر باپ عابد صاحب کی شیطانی رگ بھی جاگی اور حصہ بقدر جثہ کے مصداق بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کا سوچا۔ شقی القلب کا نہ دل پسیجا، نہ روح لرزی، نہ آسمان ٹوٹا، نہ زمین شق ہوئی۔

ان تین باعزت مردوں نے اپنے رنگین لمحات کی داستان کے چٹخارے محلے میں پھیلائے تو یحییٰ نامی ایک اور صاحب بھی اس نیکی کے کام سے اپنے آپ کو روک نہ سکے اور اپنا نام اس فہرست میں شامل کروا لیا جہاں ایک بچی کے جنم لینے کی صورت میں ولدیت کے خانے میں پہلے سے تین مرد موجود تھے۔ یعنی یک نہ شد، چار شد۔

ہمیں سمجھ میں نہیں آتی کہ سینہ کوبی کریں کہ یزداں کے دامن سے لپٹ کے فریاد کریں۔ یہ بھی خیال گزرتا ہے کہ شاید ہمارا احساس کا دامن ہی بہت نازک اور بوسیدہ ہے کہ فوراً تار تار ہو جاتا ہے۔ ہمیں ظلم اور بربریت کی یہ داستانیں پڑھنے اور سننے میں ہضم ہی نہیں ہو پاتیں، جنہیں بہت سے لوگ نہ صرف پڑھتے ہیں بلکہ ستم گزیدہ کو یہ کہہ کے مزید چرکے لگاتے ہیں کہ کچھ تو ہو گا دوسری طرف بھی؟

خدارا کوئی ہمیں سمجھا دے کہ چودہ سالہ معصوم تنہا اور خوفزدہ بچی کو اسد علی اور بہادر علی نے اپنی بہادری کا نشانہ بنایا کیسے؟ کس پوائنٹ پہ ہونے والے جنسی عمل میں ان دونوں کو لذت ملی کیسے؟ اس وحشیانہ پن نے کہاں پرورش پائی؟ ایسا جنگلی پن جو شکار کی بے بسی دیکھ کے عود کر آیا اور چڑیا جیسی بچی کو پھاڑ کھایا، کہاں سے پایا؟ کیا اپنے گھر میں کسی پاکیزہ بندھن میں بندھے تھے دونوں؟

کیا عابد اور یحییٰ نامی شقی القلب افراد کو، جو بچی کے باپ کے ہم عمر تھے، اس پاتال میں قدم رکھتے ہوئے اپنی بچیاں یاد آئیں تھیں؟ یا ان عذاب ناک لمحات میں وہ صرف مرد تھے اور بچی ان کا شکار؟

وہ کم عمر بچی چودہ برس کی عمر میں صدیوں کا سفر طے کر چکی۔ بچپن داغدار ہو کے الوداع ہو چکا۔ وہ سبق جو ابھی پڑھنے کی عمر نہیں تھی، ازبر ہو چکا۔ جو منزل ابھی کوسوں دور تھی، اس کے آخری نشان تک وہ پہنچ چکی۔

زخمی روح، اجڑا تن، ویران دل اور گود میں ہمکتی ایک نشانی کے ساتھ ایک ایسی آسیب زدہ گلی میں کھڑی ہے جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں!

"میرا جسم، میری مرضی" جیسی فحاشی کی مخالفت کرنے والے غیرت مندوں کے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ اب ہمارے پاکیزہ معاشرے میں چودہ برس کی بچیوں کے جسم بھی اپنی "مرضی" کرنے لگے ہیں!

بیوی کا پانچواں سیزیرین، خاوند کی مذہبی سوچ اور لیڈی ہیلتھ وزیٹر پھوپھی

آج ہفتہ وار پرائیویٹ پریکٹس کا دن تھا!

اپنی باری پر پاکستان سے تعلق رکھنے والے میاں بیوی داخل ہوئے۔ خاتون پانچویں حمل سے تھیں۔ پچھلے چاروں بچے سیزیرین آپریشن سے پیدا ہوئے تھے، اب پانچواں سیزیرین ہونا تھا۔

پانچویں دفعہ پیٹ کاٹ کے بچہ نکالنا بہت مشکل اور خطرناک کام ہے۔ اس کی بے انتہا پیچیدگیاں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے خاتون کی زندگی کو خطرہ ہوتا ہے۔ کوئی سپیشلسٹ درجے کا ڈاکٹر بھی پانچویں دفعہ ایسے آپریشن سے کتراتا ہے کہ اس کے لئے بہت مہارت کی ضرورت ہوتی ہے اور معمولی غلطی بھی مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔

میاں بیوی سامنے بیٹھے تھے!

بنیادی باتوں کے بعد ہم نے کہا کہ بچے کے آپریشن کے ساتھ ضروری ہے کہ بچے بند کروانے کا آپریشن بھی کروالیا جائے۔ یہ سنتے ہی وہ صاحب کرسی سے اچھلے اور بولے،

"یہ تو سراسر اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے"

"دیکھئے ایسا نہیں ہے، ہم کسی حمل کو ضائع نہیں کر رہے، کسی بچے کو ساقط نہیں کر رہے۔ یہ صرف حمل کو روکنے کی احتیاطی تدبیر ہے" ہم نے کہا

"نہیں جی، جس روح نے آنا ہے وہ تو آئے گی ہی، تو اس عمل میں رکاوٹ خدائی کام میں دخل اندازی ہے" وہ تنتنا کے بولے

"بات سنیے، خدا نے جو یہ کائنات بنائی ہے، ان سارے سسٹمز کا کوئی طریقہ عمل ہے۔ مرد و عورت کے جماع کا نتیجہ حمل ہے۔ حمل ٹھہرنے سے پہلے اگر جماع کے عمل میں سپرم اور ایگ کو ملنے سے روک دیا جائے تو اس میں خدا کے حکم کی خلاف ورزی کیسے ہوئی؟ کیا آپ کوئی ریفرنس لا سکتے ہیں جہاں صاف صاف یہ کہا گیا ہے کہ سپرم کو ایگ سے ملنے میں رکاوٹ مت ڈالو۔ سپرم کو ایگ تک پہنچنے کے عمل میں میں کوئی مار دھاڑ نہیں ہے میرے بھائی"

ان صاحب کے پاس میری بات کا کوئی جواب نہیں تھا، لیکن وہ میں نہ مانوں کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔

"دیکھیے، سمندر بھی خدا نے بنایا۔ کیا آپ تیراکی جانے بغیر سمندر میں چھلانگ لگائیں گے کہ زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح آگ خدا نے بنائی، کیا آپ آگ میں کودنا چاہیں گے یہ سوچتے ہوئے کہ خدا جلنے سے محفوظ رکھے گا۔ یہ معجزے ہوتے ہیں لیکن نبیوں کے ساتھ اور یا پھر خدا چاہے تو۔ پہاڑ بھی خدا نے بنائے ہیں کبھی چوٹی سے گر کے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ عام طور پہ خدا اپنے کاروبار میں دخل اندازی نہیں کرتا اور ہمیں عقل و شعور دے کے یہ سمجھنے میں حق بجانب ہے کہ ہم زندگی میں احتیاطی تدابیر اختیار کر کے اسے احسن طریقے سے نبھائیں گے" ہم نے ایک لمبی تقریر کی ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، سو انہوں نے اب پینترا بدلا۔

"ہم نے پاکستان میں رہنے والوں سے مشورہ کیا ہے اور سب نے کہا ہے کہ اس کے بعد بہت سی تکلیفیں شروع ہو جاتی ہیں"

"مثلاً" ہم نے پوچھا؟

"جسم پھول جاتا ہے، چکر آتے ہیں اور خاتون کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہتی"

"یہ معلومات دینے والا کون تھا؟" ہم متجسس ہوئے

"میری پھوپھی نے بہت سال پہلے یہ آپریشن کروایا تھا اس کے بعد وہ بیمار ہی رہیں۔ میری بہن لیڈی ہیلتھ وزیٹر ہے اس نے بھی مجھے سختی سے منع کیا ہے"

اب پھوپھی اور لیڈی ہیلتھ وزیٹر کی دانش کو ہم کیسے جھٹلاتے!

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ ایسے سیزیرین مشکل ہوتے ہیں، بعض دفعہ آنول رحم اور مثانے تک پہنچ جاتی ہے اور خاتون کو بچانا مشکل ہوتا ہے" ایک اور کوشش کی

"آپ اللہ کا نام لے کر کریں جی، کچھ نہیں ہوتا" انہوں نے بے اعتنائی سے کہا۔

اب کیسے بتاؤں کہ اللہ کے دیے ہوئے علم سے ہی انہیں سمجھا رہی ہوں۔

اس ساری گفتگو میں خاتون خاموش تھیں۔ چونکہ ہم ہار ذرا مشکل سے مانتے ہیں سو اب خاتون کی طرف رخ کیا،

"دیکھو، تمہارے چار بچے پہلے ہیں، یہ پانچواں ہے۔ یہ تمہارا جسم ہے اور تمہیں اپنے جسم پہ اختیار ہے۔ تم سسرال اور شوہر کی چھوڑو۔ تکلیف تم نے سہنی ہے، زندگی اور موت کا پل تم نے پار کرنا ہے اگر تم کہو تو میں تمہارا آپریشن کر دوں؟"

اس نے تھکی تھکی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی

"ہم کچھ اور تدبیر کر لیں گے"

"مگر یہ حمل بھی تو پچھلی تدبیروں کی ناکامی کی وجہ سے ہی ٹھہرا ہے نا۔ تم نے خود ہی مجھے بتایا تھا"

"جی وہ تو ہے مگر۔۔۔۔"

وہ بے چارگی کی تصویر تھی!

ہم نے ایک اور کوشش کی اور تھوڑی بے رحمی سے کی،

"دیکھو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اگر تم دنیا سے رخصت ہو گئیں تو تمہارے صاحب تو ایک اور بیاہ رچائیں گے، یہی دیکھنے میں آیا ہے۔ فرق تمہارے بچوں کو پڑے گا جو بن ماں کی زندگی گزاریں گے۔ اس لئے تم یہ فیصلہ کرو"

اور پھر ہم نے اسے اپنی خالہ کی داستان سنائی، جو چھٹے حمل کے دوران زیادہ خون بہنے سے اللہ کو پیاری ہوئیں تھیں اور خالو نے دوسری بیوی سے پھر خدا کے فضل سے پانچ بچے پیدا کیے تھے۔

خاتون کی آنکھ میں آنسو جھلملا رہے تھے اور صاحب انتہائی خشمگیں نظروں سے ہمیں گھور رہے تھے۔

اور ہم سوچ رہے تھے کہ کاش ہم ہر دفعہ کلینک کرنے کے بعد پدرسری معاشرے کی بدصورتیاں آپ کو دکھا سکیں۔ وہ سب مرد وزن جو ہمارے ہر کالم کے بعد نتھنوں سے دھواں چھوڑتے ہیں اور قلم سے آگ اگلتے ہیں، دیکھ سکیں کہ اگر ان کے گھر میں یہ گندگی نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ تعفن زدہ سوچیں اور رویے معاشرے میں وجود نہیں رکھتے۔ (ویسے مشاہدہ یہی بتاتا ہے کہ اپنے گھر میں جو گندگی موجود ہوتی ہے، اس کا وجود بھی "گھر کی عزت" کا حیلہ بنا کر جھٹلایا جاتا ہے۔ و۔ مسعود)

تعلیم کی کمی اور بعض دفعہ تعلیم کی موجودگی میں شعور کی کمی، مولوی حضرات کی ماڈرن سائنس سے ناواقفیت اور عورت ذات کے احساسات اور ضروریات سے چشم پوشی کرتے ہوئے اپنے ذاتی مفاد کے منافی ہر چیز کو خلاف اسلام ٹھہرا دینے کا رویہ عورت کو کتنا مجبور اور مظلوم بنا دیتا ہے کاش ہم آپ کو دکھا سکیں۔

شاید آپ کو خیال آئے کہ اتنی لمبی بات بھلا کونسا ڈاکٹر مریض کے ساتھ کرتا ہے۔ ہمارے ساتھ مشکل یہ ہے کہ ہمیں معمول کے طبی معاملات نمٹانے کے مرحلے سے گزرے مدت ہو چکی۔ پیشہ ورانہ مہارت کی اس سطح پر ہمارے پاس وہی کیسز پہنچتے ہیں، جہاں پیچیدگی اسپیشلسٹ ڈاکٹر سے آگے کنسلٹنٹ کی اس علمی مہارت کا تقاضا کرتی ہے جہاں معلوم اور نامعلوم کے درمیان کے دھندلکے میں راستہ نکالنا ہوتا ہے۔ ناگزیر طور پر مریضوں کی تعداد کم ہوتی ہے اور ہمیں خوشی بھی ہوتی ہے کہ رنگ رنگ کے لوگوں سے کسی قدر تفصیل سے بات کرنے کا موقع ملتا ہے اور ہر بات کے پیچھے ایک کہانی ہوتی ہے۔

اب تک آپ کو معلوم ہو ہی چکا ہے کہ ہم بات کہنے اور سننے کے کتنے رسیا ہیں۔
لوگوں کی کہانیاں سن سن کے دکھی بھی ہوتے ہیں لیکن امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے
کیونکہ جانتے ہیں کہ

زندہ لوگوں کی بود و باش میں ہیں
مردہ لوگوں کی عادتیں باقی

قیدی پرندے کی بات جاننے والی شاعرہ: مایا اینجلو

ماں!
یہ سچ ہے
تمہیں میرے لئے بنایا گیا
تمہاری آواز مجھے سکون بخشتی ہے
تمہارے بازو مجھے جھلانے کے لئے تخلیق کئے گئے
تمہارے جسم کی مہک مجھے معطر کرتی ہے

ماں!
تم مجھے سمجھتی تھیں
اور میں تمہیں جانتی تھی
تمہیں لگا کہ تم میری رکھوالی کرتی تھیں
لیکن میری نظر تمہارا تعاقب کرتی تھی

ہر ایک لمحہ
تمہاری مسکراہٹ، تمہارا غصہ
اور تمہاری غیر موجودگی میں
میں تم بننے کی کوشش کرتی
جیسے تم گنگناتی تھیں
جیسے گیت کے آخر میں تمہاری سانس ٹوٹتی تھی

جیسے تم سر کو جھکاتی تھیں
روشنی تمہارے چہرے کو منور کرتی تھی
جب تم اپنی انگلیاں میرے ہاتھ پہ رکھتی تھیں

اور پھر بازو پہ
مجھے لگتا تھا، مجھے صحت، مضبوطی اور مقدر کی دولت سے مالا مال کر دیا گیا ہو

تم میرے لئے ہمیشہ
تمام خوشیوں کا مرکز رہیں
شیرینی سے گندھی
ہنسی کی پھوار پھوٹتی ہوئی
میں تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں ماں
میں تم سے محبت کرتی ہوں۔

محبت اور حلاوت میں گندھے ہوئے ان الفاظ کی تخلیق کار مشہور زمانہ شاعرہ، ادیبہ، ڈرامہ نگار اور سوشل ایکٹیوسٹ مایا اینجلو تھیں جن کی چار اپریل کو 92 سالگرہ منائی جا رہی ہے۔ 1928 میں پیدا ہونے والی مایا اینجلو نے 2014 میں وفات پائی۔ ان کی عمر ادب کی تخلیق مین بسر ہوئی۔ لکھنے کے بارے میں ان کی رائے دیکھ لیجئے:

"لکھنا ایسا ہی ہے جیسے چلنا پھرنا، باتیں کرنا، پہاڑوں پہ چڑھنا یا سمندر میں تیرنا۔ لکھاری ہونے کے پیچھے ایک ہی فلسفہ ہے کہ لفظ قلم پہ خود بخود اتر آتا ہے، جو بتاتا ہے کہ ہمارے اندر ایک احساس کا مدو جزر ہے جو لوگوں تک پہنچنا چاہتا ہے"

والدین میں طلاق ہونے کے باعث مایا اینجلو کا بچپن ارکنساس اپنی دادی کے زیر سایہ گزرا۔ یہاں رہنے والوں کے درمیان گورے اور کالے کی تفریق بہت گہری تھی۔ گورے بچوں کا اپنے ہی ہم عمر کالے بچوں کے ساتھ نامناسب سلوک مایا کے دماغ میں بہت سے سوالوں کو جنم دیتا تھا۔

''ارکنساس کے پاس عمر رسیدہ کالوں کو نفسیاتی طور پہ بونے سمجھنے کا سالہاسال کا تجربہ تھا۔ گورے بچوں کے پاس اپنے والدین کی عمر کے کالوں کو کسی بھی تحقیر آمیز لفظ سے پکارنے کی کھلی چھٹی تھی''

مایا پر ان مشاہدات و تجربات کے گہرے اثر نے بعد کی زندگی میں اسے انسانی حقوق کا علمبردار بننے میں مدد کی۔

''میں نے سیکھا کہ میری ایک مسکراہٹ بھی کسی دوسرے کے لئے ایک عطیہ ہو سکتی ہے۔ ایک مہربان لفظ، اور تسلی کے لئے بڑھایا گیا ہاتھ بھی گرانقدر تحفہ ہیں۔ میں کسی گرے ہوئے کو کھڑا ہونے میں مدد دے سکتی ہوں۔ میں دلوں کو جوڑنے والی موسیقی کے سر بکھیر سکتی ہوں''۔

مایا کی زندگی میں ایک قیامت آٹھ برس کی عمر میں آئی وہ اپنی ماں کے گھر رہنے گئی۔ ماں کی غیر موجودگی میں اس کے پارٹنر نے مایا کو ریپ کر دیا۔ صدمے کی شدت سے مایا پانچ سال تک بولنے سے قاصر تھی۔ یہ مایا کی زندگی کا ایک ایسا داغ تھا جسے وہ کبھی نہیں بھول سکی۔

اپنی کتاب '' میں جانتی ہوں کہ قیدی پرندہ قفس میں کیوں گاتا ہے''میں لکھا،

''مجھے چپ رہنا تھا اور یہ تب ہی ممکن تھا جب میں تمام آوازوں کو جونک بن کے چمٹ جاتی۔ میں سب کمروں میں جاتی جہاں لوگ ہنس بول رہے ہوتے اور ان کی آوازیں پتھروں کی طرح دیواروں سے ٹکرا رہی ہوتیں۔ میں خاموشی سے سب سنتی، ان آوازوں کو لپیٹتی اور کہیں دفن کر دیتی۔ پھر میرے ارد گرد خاموشی چھا جاتی کیونکہ میں اس شور کو ہڑپ نگل چکی ہوتی''۔

مایا کو زندگی کی طرف واپس لانے والی دادی اور ماں تھیں۔ جن کے متعلق انہوں نے لکھا۔

''میں آج جو ہوں وہ اپنی دادی جنہیں میں نے بہت چاہا اور اپنی ماں جن سے عشق کیا، کی وجہ سے ہوں۔ ان کے پیار نے مجھے یقین دیا، تعلیم دی اور اڑنا سکھایا۔ پیار نہ صرف

زخم مندمل کرتا ہے بلکہ آزاد بھی کرتا ہے۔ پیار صرف جذبات کا نام نہیں بلکہ ایک ایسی کیفیت ہے جو ستاروں کو اپنی جگہ قائم رکھتی ہے اور جو لہو کو رگوں میں دوڑاتی ہے"

مایا اینجلو نے عمر کا کچھ حصہ مصر اور گھانا میں بھی گزارا جہاں عرب آبزرور اور افریقن ریویو میں کام کیا۔ افریقہ میں گزارے ہوئے ان برسوں نے ان کی ذات پہ گہرے نقوش چھوڑے۔

مایا بیسویں صدی کی مضبوط ترین عورتوں میں سے ایک قد آور آواز کے طور پہ سامنے آئی۔ حالات کی بھٹی نے اسے کندن بنا دیا تھا۔ مایا کی تحریروں، شاعری، ڈراموں اور شوز کو سرکاری طور پہ سراہا گیا۔ 1993 میں صدر بل کلنٹن کی تقریب حلف برداری میں مایا نے اپنی مشہور عالم نظم "صبح کی دہلیز پر" پڑھی۔ امریکی تاریخ میں رابرٹ فراسٹ کے بعد وہ دوسری شاعر تھیں جنہیں یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اس نظم نے 1994 میں گریمی ایوارڈ جیتا۔ (اس تحریر کے آخر میں مایا اینجلو کی زبانی 20 جنوری 1993 کی صبح واشنگٹن کے پرامید ہجوم میں پڑھی گئی یہ نظم سن لیجئے۔ 27 برس پہلے "صبح کی دہلیز پر" کھڑے انسانوں کو کیا خبر تھی کہ 2020 کا سورج ڈونلڈ ٹرمپ کے امریکا میں طلوع ہو گا۔)

ایک بھرپور زندگی گزارنے کے بعد قفس میں گانے والا پرندہ بالآخر 2014 میں اس قید سے رہا ہو گیا۔

"تم میرا نام تاریخ میں لکھ سکتے ہو
تلخ جھوٹ کے ساتھ
تم مجھے خاک میں ملا سکتے ہو
لیکن میں پھر اٹھوں گی
کیا تم مجھے بکھرا ہوا دیکھنا چاہتے ہو
جھکا ہوا سر اور نیچی نظر
آنسوؤں کی طرح گرتے ہوئے کندھے
روح سے اٹھتی سسکیاں
تم مجھے اپنے الفاظ سے قتل کر سکتے ہو

تم مجھے اپنی نگاہوں سے کاٹ سکتے ہو
تم مجھے اپنی نفرت سے مار سکتے ہو
لیکن پھر بھی، ہوا کی طرح، میں پھر اٹھوں گی
دہشت بھری راتوں کو بھولتے ہوئے
میں اٹھتی ہوں
ایک روپہلی امید بھری صبح میں
میں اٹھتی ہوں
اپنے آباو اجداد کا اثاثہ لئے
میں غلامی کا ترک کیا ہوا خواب اور نئی امید ہوں
میں اٹھتی ہوں
میں اٹھتی ہوں
میں اٹھتی ہوں"

اللہ طارق جمیل کے لئے آسانیاں پیدا کرے

محترم طارق جمیل بہت مشکل میں ہیں۔ مقدمہ ایسا کمزور ہے کہ منصف سے نظریں چرا کر اپنے ہی موکل سے داد چاہتے ہیں۔

چاہ اور بیزاری کے چاہ ماروت میں جھولتے حضرت، زمین پر اپنی نارسائی کی خجالت سے گریزاں، فلک کی پہنائیوں میں اپنے ترسیدہ تخیل کا پیوند ٹانکتے ہیں۔ ہجوم طفلاں کی آرزوئے خام کو مہمیز کرتے محترم کے بیان کا مرکزی خیال تو عورت ہی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ دنیا میں رہنے والی انہیں گناہ گار، قابل تعزیر اور بے حیا نظر آتی ہے۔ مٹی کی بنی ہوئی اس دنیا کی میلی کچیلی عورت (بقول ان کے) انہیں قبول کرنا گوارا نہیں، وہ تو عود و مشک و عنبر سے بنی، سولہ سنگھار کیے، عشوے و غمزے کرتی جنت کی لڑکی خواب میں دیکھا کرتے ہیں اور حواس کھو بیٹھتے ہیں۔

سوچا ہے کچھ بھی ہو، ذکر چاہیے اس پری وش کا ہر وقت، ہمہ دم!

ان کی میٹھی میٹھی ڈانٹ، شرمیلی مسکراہٹ اور نم آنکھوں والے بیانات سن سن کے ہم تو مانو دن بدن مغرور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کبھی اپنے آپ پہ رشک آتا ہے اور کبھی پیار۔ پھر بے یقینی سے اپنے آپ کو آئینے میں تکتے ہیں کہ کیسی چنگیز خانی صلاحیتیں ہمیں ودیعت ہوئی ہیں کہ ذرا جو آنچل سر سے سرکا کے زلف بام پہ لہرا دیں تو نہ صرف دامن تقویٰ پہ بجلیاں گریں گی بلکہ زاہدان خود آرا کی ریاضت بھی بھنگ ہو جائے گی۔ دھرتی دھڑک اٹھے گی، زعم کے سنگی بت اوندھے منہ گریں گے۔۔۔ اور ہم تماشا دیکھیں گے۔

آنچل کی جھلک سے بڑھ کے اگر کبھی ہم نے مغربی لباس پہن لیا تو کہیں سیلاب و طوفان کا خطرہ اور کہیں قحط سالی کا ڈر، پڑھنے لکھنے کا نام لیا تو مساجد ویران ہونے کا خدشہ، غیر مردوں کے ساتھ کام کر لیا تو برائی کا بازار گرم، سانپ کی طرح رینگتی انگلیوں اور گرسنہ نگاہوں کے خلاف میرا جسم میری مرضی کی بے حیائی کر لی تو کرونا کا عذاب تو آ ہی گیا جس نے دنیا بھر میں جھاڑو پھیر دی۔

یقین جانیے ہم تو سر فخر سے بلند کیے نازاں پھرتے ہیں کہ ہماری طاقت، ہماری بے حیائی کائنات کو درہم برہم کرنے میں اس قدر دخیل ہے جسے مولانا کی تمام تر روحانیت، پاکیزگی اور عبادات روک ہی نہیں پاتیں۔ آخر میں انہیں پھر تسبیح پھیرتے صادق و امین کے پہلو میں بیٹھ کے ہم بے حیاؤں سے منت والتجا کرنی پڑتی ہے کہ میری قوم کی بیبیو، خدا کے لئے حیا کرو، باہر بے پردہ نکل کے مجھ جیسوں کا امتحان نہ لو اور نہ ہی قدرت کو ناراض کرو۔

دیکھیے نا کہتے تو وہ درست ہیں!

دنیا بھر میں لاکھوں لوگ مر گئے ہماری وجہ سے، دنیا کی معیشت تباہ ہو گئی ہم ذمہ دار، ہمارا ایمان دار معصوم وزیر اعظم پریشان ہمارے کارن۔ کتنی بری ہیں ہم پاکستانی عورتیں، اپنی بے حیائی کی خاطر دنیا اجاڑ دی۔

سو کہیے کہیے، ہمیں برا کہیے!

ایک اور بات بھی ہمیں حیران کرتی ہے کہ آخر دنیا بھر کی میڈیکل یونیورسٹیاں پاکستانی عورت کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتیں؟ کچھ تحقیق تو کریں کہ جو کام مغرب کی عورت ننگ دھڑنگ ہو کے نہیں کر پائی وہ پاکستانی عورت نے نقب کی جنبش خفیف سے کر دکھایا۔

ویسے عورت پر یہ الزام تراشی کچھ ایسی نئی بات نہیں۔ زمانہ قدیم سے مختلف مذاہب اور معاشروں کے پیشوا اسی ڈگر پہ چلے ہیں۔ بابا آدم کے خلد سے نکلنے کا الزام اماں حوا کی نادانی کے سر ہی منڈھا جاتا ہے جنہوں نے معصوم مرد کو بھٹکا دیا۔ صحیح تو ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو طارق جمیل اور حواری جنت میں ہی رہ رہے ہوتے نا، دن عید اور رات شب بارات ہوتی، اس کورونا کا عذاب تو نہ دیکھنا پڑتا۔

پھر بھیا قابیل بھی ایک عورت کی وجہ سے بھائی ہابیل سے بھڑ بیٹھے اور بیٹھے بٹھائے اماں حوا کے گھر میں بربادی کی نیو ڈال دی۔ ہائے ری عورت تیرا ستیاناس!

قرون وسطی میں مغرب کے پادری کسی بھی ناپسندیدہ عورت کو چڑیل ہونے کے شک پر "وچ ہنٹ" کی آزمائش سے گزارتے تھے۔ پنجرے میں جنگلی جانوروں کے آگے زندہ ڈال دیا جاتا، بھڑکتی آگ میں پھنکوا دیا جاتا یا پہاڑ کی چوٹی سے چھلانگ لگانے کو کہا جاتا۔ قسمت کے پھیر سے بچ جانے والی چڑیل ثابت ہو جاتی جس کا مقدر ہر حال میں موت ہوتا۔ جو اس مشق ستم میں جان کی بازہ ہار جاتی، اسے چڑیل ہونے کے الزام سے نجات مل جاتی۔ گویا چت بھی میری اور پٹ بھی۔ ہر دو صورتوں میں عورت کو ان پادریوں کے ہاتھوں جان سے ہارنا پڑتا جن کی عیاشی کی رنگین داستانیں ہر چرچ کے گوشے گوشے میں کل بھی لکھی تھیں اور آج بھی لکھی جا رہی ہیں۔ ہمارے خطے کا مولوی بھی اس ضمن میں کسی پادری سے کم نہیں۔

کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ ہم بے حیا عورتوں کی وجہ سے عالمی وبا تو آ گئی۔ خدا جانے ازل سے ملاؤں کی پسندیدہ علت مشائخ سے قیامت کب ٹوٹے گی؟ طارق جمیل اپنے ہم مشربوں کے لئے زبان کب کھولیں گے؟ کب مسجد کے منبر پہ بیٹھ کے اپنے ساتھیوں کو اپنی دلگیر آواز میں سمجھائیں گے کہ خدا ارا ننھے فرشتوں پہ ظلم خدا کے قہر کو آواز دے سکتا ہے۔

میں یہ بھی سوچتی ہوں کہ ہم عورتوں کی بے حیائی سے برافروختہ ہونے والے طارق جمیل کیا کبھی کسی ایسے جلوس کی قیادت کریں گے جو ننھی بچیوں کے ریپ اور قتل کے خلاف نکالا گیا ہو۔ وہ تمام عورتیں جو جلا دی جاتی ہیں، ونی ہوتی ہیں، اغوا ہوتی ہیں، کیا اس کمتر مخلوق پہ ہونے والے ظلم کے خلاف طارق جمیل اپنی زبان مبارک کو تکلیف دیں گے؟ کیا اپنے لاکھوں چاہنے والوں کو اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی تلقین کریں گے؟

طارق جمیل کے کرونا کو ہم بے حیا عورتوں کے سر منڈھنے پر ایمان دار کی خاموشی اس بیان سے متفق ہونا ظاہر کرتی ہے۔ صادق اور امین خود گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکے، زندگی کی جی بھر کے رنگینیاں سمیٹ چکے، لیکن ان کا تصدیق شدہ اعلی کردار انھیں اتنی

جرات نہ دے سکا کہ اپنے کئے دھرے کی ذمہ داری کا بار ایسے کسی کٹہرے میں اٹھا سکیں جسے اقتدار کی نیم تاریک غلام گردشوں میں گٹھ جوڑ کی بیساکھیوں پر کھڑا نہ کیا گیا ہو۔

طارق جمیل کا اتنے وثوق سے کورونا کو ہم بے حیا عورتوں کے گلے ڈالنا ایک سوال کا متقاضی ہے۔ وہ دنیا تخلیق کرنے والا کیا صرف مردوں کا خدا ہے، جن کی ہر طرح کی جنسی بے راہ روی، ظلم و تشدد، ڈاکہ و قتل اور ہر طرح سے دنیا کو بد صورت بنا دینے کے باوجود کوئی وبا نہیں آتی؟

کیا طارق جمیل کا اللہ سے براہ راست خط و کتابت کا سلسلہ ہے جس میں انہیں پاکستانی عورتوں کو لعنت و ملامت کرنے کی عظیم ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

طارق جمیل صاحب، مانا آپ کی افسانہ طرازی اور داستان گوئی کی صلاحیتیں بے مثال ہیں لیکن ڈریے اس دن سے جب ہم بے حیا عورتیں اللہ کے حضور پیش ہو کے آپ سے ان سب باتوں کا ثبوت مانگیں گی۔

کوئی کہانی سوچ رکھیے ابھی سے! اللہ آپ کے لئے آسانیاں پیدا کرے۔

بے حیا عورتوں سے ملاقات

میں عورتوں کے ہجوم میں گھری ہوں۔ مضمحل، تھکی ماندی، مضروب عورتیں ۔کرب و اذیت چہرے پہ نمایاں!

ہر ایک میرا دامن پکڑ کے کچھ کہنے کی کوشش میں ہے۔ ہر کسی کی کوشش ہے کہ وہ اپنا درد کہہ ڈالے جو اسے مصلوب کیے ہوئے ہے۔ ہر عورت اپنا تعارف کروانا چاہتی ہے!

یہ عورتیں نہیں ہیں، زندہ لاشیں ہیں یا شاید مردہ کہانیاں!

آوازیں ہی آوازیں!

میں قبر میں مردہ بے جان حالت میں ریپ ہونے والی عورت ہوں!

میں ننھی بچی زینب اور فرشتہ کے روپ میں کوڑے کے ڈھیر پہ ملنے والی عورت ہوں!

میں جسمانی مار پیٹ سے مضروب عورت ہوں!

میں چولہے میں جلائی جانے والی عورت ہوں!

میں تیزاب سے منہ بگاڑ دی جانے والی عورت ہوں!

میں ذہنی اذیتوں سے پاگل ہو جانے والی عورت ہوں!

میں جنسی اعضا کو بجلی کی راڈ سے داغی جانے والی عورت ہوں!

میں گالیاں سن سن کے زندگی بتانے والی عورت ہوں!

میں طلاق کے بعد بچے چھین کے گھر سے نکالی جانے والی وہ عورت ہوں جو ساری عمر بچوں کی دید کو ترستے گزار دیتی ہے!

میں وڈیرے کے حکم پہ گینگ ریپ ہونے والی عورت ہوں!
میں گلیوں میں مختاراں مائی کی شکل میں ننگی گھمائی جانے والی عورت ہوں!
میں کاری کے الزام پہ گل سما کے روپ میں سنگسار ہونے والی عورت ہوں!
میں مرد کی بدکاریوں کے کا بدلہ ونی کی صورت میں قربان ہونے والی عورت ہوں!
میں کم عمر بچی ہو کے ادھیڑ عمر مرد کا وظیفہ زوجیت ادا کرنے والی عورت ہوں!
میں سکول کے دروازے بند دیکھنے والی ملالہ جیسی عورت ہوں!
میں جہیز نہ لانے پہ زدو کوب ہوتی عورت ہوں!
میں بچی پیدا ہونے پہ لعنت و ملامت کا شکار ہوتی عورت ہوں!
میں زچگی میں خون کا عطیہ نہ ملنے پر جان ہار جانے والی عورت ہوں!
میں حمل میں کھانا نہ ملنے پہ بھوک وپیاس کاٹتی عورت ہوں!
میں زندگی کی سختیاں کاٹ کے بوڑھا ہونے پہ سوتن دیکھنے والی عورت ہوں!
میں بدکار شوہر کو برداشت کرنے کی ہدایت کے ساتھ زندہ عورت ہوں!
میں مرد کی جنسی بیماریوں کا شکار ہونے والی عورت ہوں!
میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد کام کی اجازت نہ ملنے پہ گھر میں بٹھائی عورت ہوں!
میں کما کے لانے کی صورت میں اپنی کمائی پہ بے اختیار عورت ہوں!
میں باپ اور بھائیوں کے ہاتھوں ریپ ہوتی ہوئی عورت ہوں!
میں مذہب کے نام پہ جنسی اعضا کے ختنے ہوتی ہوئی عورت ہوں!
میں اپنے جسم کو اگر چادر میں نہ چھپاؤں تو چھونے اور ٹٹولنے دو کا حکم سننے والی عورت ہوں!
میں نکاح نامے میں طلاق کا حق نہ پانے والی عورت ہوں!
میں حق مہر کے نام پہ کچھ ٹکے پانے والی عورت ہوں!
میں سسرال میں خادمہ سمجھی جانے والی عورت ہوں!

میں ریپ کی صورت میں کہیں انصاف نہ ملنے والی عورت ہوں!
میں شوہر کے ہاتھوں کھیتی سمجھ کے جنسی تشدد کا شکار عورت ہوں!
میں شوہر کے حکم پہ سگے بہن بھائیوں سے قطع تعلق کرنے والی عورت ہوں!
میں اختلاف کی صورت میں جسمانی ایذا برداشت کرتی عورت ہوں!
میں قرآن سے شادی کروائی جانے والی عورت ہوں!
میں اغوا کے بعد ریپ ہو کے ماری جانے والی عورت ہوں!
میں کھیتوں میں پڑی لاش ہوں!
میں شک کی بنیاد پہ زندہ جلائی جانے عورت ہوں!
میں اپنی مرضی کے خلاف ہر برس بچہ پیدا کرنے پہ مجبور عورت ہوں!
میں مرضی کی شادی کی اجازت نہ ملنے پہ ساری عمر گھر بٹھائی جانے والی عورت ہوں!
میں بیوگی کے بعد بدکاری کا لیبل لگائے زندہ رہنے پر مجبور عورت ہوں!
میں خاوند اور اس کے بھائیوں کا مشترک جنسی مال ہوں!
میں اغوا کے بعد کوٹھے پہ بٹھائی جانے والی عورت ہوں!
کوٹھے پہ بوڑھی ہو کے ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مرتی ہوئی عورت ہوں!
"بس کرو، خدا کے لئے بس کرو" میں چیخ اٹھتی ہوں،
"ان کا کہنا ہے کہ تم بے حیا تھیں، تم بے پردہ نہیں تھیں، تم فاحشہ تھیں فاحشہ!"
زینب اور فرشتہ سی ننھی بچیاں آگے بڑھتی ہیں اور معصوم آواز میں کہتی ہیں، "یہ فاحشہ کون ہوتی ہیں؟"
ہجوم میں سسکیوں کا شور بڑھ جاتا ہے!
ہچکیاں، چیخیں، کراہیں! ہر سسکی اذیت کا سمندر ہے، ہر آہ اندوہناک ہے۔ ہر آنسو آتش فشاں کے لاوے کا وہ قطرہ ہے جو جہاں گرتا ہے، مٹی راکھ میں بدل جاتی ہے۔
میں کانوں کو اپنی ہتھیلیوں سے ڈھانپ لیتی ہوں۔ مجھے نہیں سننا کچھ بھی، یہ رنج و الم کے نوحے ہیں جو سنے تو خون جگر سے رقم بھی کرنا پڑیں گے۔

یہ کہانیاں تو درد کا وہ سمندر ہیں جس میں تیرنے والا ہی جان سکتا ہے کہ عورت کس طور زندگی کے امتحان دیتی ہے۔ امتحان لینے والوں کے پاس تاویلات کی کمی نہیں ہوتی۔

اور تماشہ دیکھنے والے خوش نصیب جان ہی نہیں پاتے کہ جسم و جاں پہ کوڑے کھانے والی مضروب کس طرح زندگی کا پل صراط پار کرتی ہیں۔ وہ تو صرف تنقید کرنا جانتے ہیں، پنجرے سے باہر آسمان دیکھنے کی خواہش پہ تنقید۔ پدرسری معاشرے کے مروجہ اصولوں سے انحراف پہ تنقید۔

ہمارے اتنا کہنے پہ ہی دل زخم زخم ہو چکا، اب اور کہنے کی ہمت نہیں!

مظلوم دولہا اور عورت گردی کا افسانہ!

ایک صاحب کا کالم پڑھا اور یقین مانیے، غصے کی بجائے ہنسی آئی۔ اور اتنی زور سے آئی کہ پاس بیٹھی بیٹی اچھل پڑی کہ آخر ماں نے کیا لطیفہ پڑھ لیا۔

آرٹیکل میں لکھے الفاظ فریم کروا کے گھر میں ٹانگنے کے قابل ہیں اور نوجوان طلاق شدہ دولہا کے ساتھ ہماری پوری ہمدردیاں ہیں۔ بے چارے کے نشیمن پہ فوراً ہی بجلی گر پڑی، تاج محل زمین بوس ہو گیا، ارمانوں پہ اوس پڑ گئی اور شیخ چلی کے خواب دھرے کے دھرے رہ گئے۔

اب دیکھیے ناپورے حساب کتاب کے بعد شادی کی تھی کہ دلہن تو ملے گی ہی، گھر کے کام کاج اور پکا پکایا کھانا بھی ہو گا۔ اگرچہ دلہن بھی کام سے واپس آئیں گی مگر گربہ کشتن روز اول کے مصداق پہلے مہینے میں ہی دولہا کے نخرے برداشت کرنے کی عادت ڈال دی جائے تو خوب مناسب ہو گا۔ ساتھ ہی ساتھ دلہن کی تنخواہ کا مزا بھی، یعنی ایک ٹکٹ میں دو نہیں بلکہ کئی مزے۔

اور ہمارے لئے مزے کی بات یہ ہے کہ دولہا میاں کو ہتھیلی پہ سرسوں جمانے کی اس قدر جلدی جلدی تھی کہ ایک مہینے میں ہی نئی نئی شادی کا سب نشہ ہرن ہو گیا۔ ایک ہی ماہ میں نئی نویلی دلہن سے گھر کا آرام مانگ لیا گیا۔ ایک ہی ماہ میں گھر کے بل کھلنے لگے۔ ایک ہی ماہ میں دلہن کی تنخواہ کا حساب کتاب کر لیا گیا۔ ایک ماہ میں ہی رشتے داروں کے سامنے جھگڑے شروع ہو گئے اور ایک ماہ میں ہی اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گیا۔

ایک ماہ کی شادی اور سارے مراحل طے!

بات کچھ سمجھ نہیں آئی۔ ایک ماہ میں تو نیا ملازم رکھا جائے تو نہ اس کو پتہ چلتا ہے کہ مالک کا مدعا کیا ہے اور نہ ہی مالک کو اندازہ ہو پاتا ہے کہ امور خانہ داری کس ڈھب سے چل رہے ہیں۔ یہاں خانہ داری سے لے کے لین دین اور خلوت وجلوت سب رخ روشن کی طرح عیاں ہو گئے اور وہ بھی صرف تیس دن اور تیس راتوں میں۔ واہ دولہا میاں واہ!

ویسے دولہا میاں کوڑی دور کی لائے پڑھی لکھی کماؤ لڑکی سے بیاہ کرنے کی۔ اور ہمارا مشاہدہ ہے کہ یہ خواب آج کل کافی لوگوں کی بے خواب راتوں کی پرائرٹی لسٹ پہ ہے، یعنی ٹرینڈ ہے۔

مگر مشکل یہ ہے کہ یہ سب دیوانے شوقین تو ہیں مفت کی دھن دولت کے ساتھ زندگی کے مزے لوٹنے کے لیکن ساتھ میں اپنے منصب اعلیٰ یعنی مجازی خدا کے مرتبے پہ بھی فائز رہنا چاہتے ہیں۔

ان کو ایک ایسا پیکج چاہیے جو مزے تو ورکنگ بیوی والے کروائے اور ساتھ میں ایسی دوشیزہ ہو جو مشرقی مرد کے ناز نخرے بھی اٹھا سکے۔ نوکری کے بعد وہ جب ہانپتی کانپتی گھر پہنچے تو ان کے پاؤں سے جوتے اتارے اور حس شامہ کو نظر انداز کرتے ہوئے بدبو دار موزوں پہ بھی الفت بھری نظر ڈالے کہ موصوف کے ساتھ پڑھوائے گئے دو بول اندھی اور فوری الفت کے متقاضی ہیں۔ ساتھ میں معاشرہ انہیں لونڈی نما بیوی کا درس پڑھا چکا ہے سو ان کی خدمت میں گرم گرم کھانا پیش کرے، اور آخر میں راحت دل وجاں کا اہتمام بھی کہ جذبات کا بھی خیال رکھنا ہے۔ اس سب بیگار میں ورکنگ دلہن بیگم کی تھکاوٹ کا کیا عالم ہے یہ سمجھنا دولہا میاں کا سر درد نہیں۔

مضمون کے بیچ بیچ میں ہلکا سا ذکر ملتا ہے کہ شوہر کی ڈانٹ ڈپٹ یا مزاج کی برہمی تو اس رشتے کے بیچ ہوا ہی کرتی ہے اور اس کی یہ اکڑ تو نر مرد کی شان ہے۔ سو دلہن بیگم کی نوکری اپنی جگہ لیکن ان کا اتنا نخرہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ اتراتی پھریں اور شوہر کے مزاج کے ساتھ اتنی چھوٹی موٹی ایڈجسٹ منٹ بھی نہ کر سکیں۔

موصوف نے یہ بھی فرمایا ہے کہ دیہات کے خاندانوں میں عورت کی حکمرانی ہوا کرتی ہے۔ نہ معلوم کون سا گاؤں دیکھ رکھا ہے؟

یا تو حضرت نے یوٹوپیا بسایا ہوا ہے یا پھر کوئی فرضی جنت جہاں عورتوں کی عملداری اتنی ہے کہ لڑکیاں کاری نہیں ہوتیں، ریپ نہیں ہوتیں، اغوا نہیں ہوتیں، ان کی قرآن سے شادی نہیں ہوتی، عزت کے نام پہ قتل نہیں ہوتیں۔ گاؤں کے وڈیرے اور چوہدری گھر کی عورت کے سامنے چوں نہیں کر سکتے۔ ان کے گھروں کی بیٹیاں بھی ویسے ہی حکومت کرتی ہیں جیسی کہ مائیں۔ بیٹیوں کی قسمت کے فیصلے ان کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ جرگوں کی جرات نہیں ہوتی کہ کسی مختاراں مائی کو گلیوں میں رسوا کریں۔

بھئی، اگلی دفعہ پاکستان آئی تو ایسا گاؤں ضرور دیکھوں گی، بس مجھے ذرا محل وقوع بتا دیجئے گا۔

چلیے، آپ کو کام کرنے والی عورتوں کے کچھ قصے سناتے ہیں کہ اسی قبیلے سے تعلق ہے۔ معاشرے کی اعلیٰ تعلیم یافتہ یعنی ڈاکٹر عورتوں کی کچھ کہانیاں۔

ایک ڈاکٹر، یورپ کے ایک ملک میں کنسلٹنٹ، میاں کا کسی اور پروفیشن سے تعلق اور ان کی تنخواہ بیگم سے کم تھی۔ شوہر صاحب کی خواہش تھی کہ بیگم اپنا اکاؤنٹ علیحدہ سے نہیں کھولیں اور ان کی تنخواہ شوہر کے اکاؤنٹ میں جائے۔ کچھ اجارہ داری کا مسئلہ تھا۔ سو ڈاکٹر بے چاری نے چپقلش کھڑی کرنے کی بجائے منظور کیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ سالہا سال وہ اپنے کمائے ہوئے پیسے اپنی ذات پہ بھی اجازت کے بنا خرچ نہیں کر سکتیں۔ شوہر صاحب نے پچاس یورو ماہانہ کا جیب خرچ باندھ رکھا ہے۔

ایک اور ڈاکٹر ہیں، ان کو اپنا اکاؤنٹ کھلوانے کی اجازت تو مل گئی مگر وہ اکاؤنٹ آپریٹ نہیں کر سکتیں کہ اے ٹی ایم کارڈ شوہر کی جیب میں اور وہ ٹکے پائی کا حساب رکھنے کے شوقین۔ اگر کبھی کارڈ مانگ لیا جائے تو انا مجروح ہو جاتی ہے اور ڈاکٹر بے چاری کو رعب جمانے اور آنکھیں دکھانے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔

ایسی ہی ایک اور ڈاکٹر جو سعودی عرب میں کام کر رہی تھیں اور میاں نوکری سے فارغ تھے۔ ہر ویک اینڈ پہ عمرہ کرنے کے بہت شوقین تھے۔ ایسے ہی کسی ویک اینڈ پہ جب وہ ساتھ نہ جا سکیں، شوہر اے ٹی ایم کارڈ جیب میں ڈالے عمرہ کے لئے تشریف لے گئے۔ اور

گھر پہ ڈاکٹر کے پاس بچے کا دودھ منگانے تک کے پیسے نہیں تھے۔ شوہر میاں کی واپسی تک ڈاکٹر صاحبہ نے ساتھیوں سے مانگ تانگ کے گزارا کیا۔

چلیں جی اور سنیں۔ ایک ڈاکٹر صاحبہ کو بتا دیا گیا کہ اگر اپنا پروفیشن جاری رکھنا ہے تو اس کی قیمت سب اخراجات کو شئیر کرنا ہے بھلے میاں صاحب کی آمدنی کئی گنا زیادہ ہو۔ اگر یہ نہیں منظور تو گھر بیٹھو، گھر داری کرو جو تمہارا اصل مقام ہے۔ ہمیں کا ہے کا فائدہ کہ تمہاری مشقت کا بار برداشت کریں۔

اب ادھر کا حال سنیے، جہاں میاں بھی ڈاکٹر تھے اور دونوں برابر کا کما رہے تھے۔ میاں صاحب کی خواہش تھی کہ بیوی کی تنخواہ کا بھی وہی حساب کتاب رکھیں گے۔ وہ خود اپنے ماں باپ کو پیسے بھیجا کرتے تھے لیکن بیوی کو یہ اجازت نہیں تھی۔ ایک دفعہ بیگم کے والدین ملنے کے لئے آئے تو وہ نہ ان کی خاطر داری کر سکیں اور نہ ہی ان کو کچھ تحفہ خرید کر دے سکیں۔ جس پہ وہ بہت عرصہ رنجیدہ رہیں کہ انہی ماں باپ کی مشقتوں کے صلے میں وہ آج اس قابل تھیں لیکن ان کے میاں یہ دیکھنے سے قاصر تھے۔ ان کے شوہر اپنی ذہین سوچ خود تک ہی محدود نہیں رکھتے تھے بلکہ باقی کے شوہروں کو بھی اپنے ڈھب پہ لا کر اپنی انجمن بنانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے تاکہ کہیں سے کوئی اور ان کی بیگم کو بہکا کے بغاوت پہ آمادہ نہ کروا دے۔

ایک اور ڈاکٹر کو جانتے ہیں ہم، جن کے میاں غصے میں اتنے منہ زور اور ہتھ چھٹ ہو جاتے تھے کہ کچھ نہیں دیکھتے تھے کہ ضرب کہاں لگی۔ وہ ان کے دانت توڑ چکے تھے، کان کا پردہ پھاڑ چکے تھے۔ غصہ اترنے پہ ان کے پاس توجیہہ ہوتی کہ ان کے سامنے زبان چلا کے ان کو غصہ دلایا گیا تھا سو سب قصور بیگم کا تھا اور ڈاکٹر صاحبہ بھرم رکھے جا رہی تھیں۔

کچھ ایسے بھی جوڑوں کو ہم جانتے ہیں جن کی بیگمات ڈاکٹر ہیں اور شوہر مناسب نوکری نہ ملنے پہ گھروں میں قیام کرتے ہیں۔ اب آپ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ ان کے گھروں میں طاقت کا توازن بدل چکا ہے۔ مرد کے لئے مرد ہونے کا لاحقہ ہی تخت و تاج ہے اور وہ سب ورکنگ بیویاں اس صورت حال کے ساتھ نباہ کر رہی ہیں۔

یہ سب اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتیں ایسی زندگی گزارنے کا سمجھوتہ کیوں کر لیتی ہیں؟
اس کا جواب معاشرے کے اس تانے بانے میں ہے جس نے بے نظیر بھٹو جیسی عورت کو گھریلو زندگی میں سرنگوں کر دیا۔ جہاں عورت کے لئے ہر قدم پھونک کے چلنے کا حکم ہے اور جو مرد کو عورت پہ حکمرانی کرنے کے حق کا ماننا بھی ہے اور بڑھاوا بھی دیتا ہے۔

ہماری پچیس سالہ پروفیشنل زندگی کی چند درد بھری کہانیوں کا عکس جنہیں ہم نے قریب سے رستے دیکھا، آئس برگ کی وہ نوک ہے جو دنیا کو نہایت معمولی نظر آتی ہے لیکن طوفانوں کو چھپائے ہوئے ہوتی ہے۔

ان تمام باتوں سے ہمارے معاشرے کے صاحبان لاکھ انکار کریں، عورتوں کے مکر وفریب کی داستانیں ڈھونڈ کے لائیں، لیکن دیکھنا یہ ہو گا کہ تاریخ میں اور روز مرہ کی زندگی میں زیادتی اور حق تلفی کا چلن کس صنف کا خاصہ رہا ہے۔ کس صنف پہ ہونے والے مظالم کی داستانیں صدیوں سے زبان زد عام ہیں اور زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھنا ہی چاہیے۔

ہم آپ سے اتنا چاہیں گے کہ خدارا کچھ لمحوں کے لئے اپنے گریبان میں جھانکیے۔ سچ کا سامنا کیجیئے، یقیناً معلوم ہو جائے گا کہ ضمیر کا قیدی کون ہے؟

ہم جنتی لوگ ہیں

واہ جی واہ، سب مسلمان رطب اللسان ہیں جیسنڈا کی انسان دوستی پہ۔ نازاں ہیں کہ جو ظلم مسجد کے اندر ہوا اس پہ گوری چمڑی والے خوب شرمندہ ہیں۔ اس شرمندگی کا ازالہ کرنے کے لئے بے چارے مسجدوں میں بھی چلے آ رہے ہیں اور سر پہ حجاب بھی لے رہے ہیں۔ کھانا بھی اکٹھا کر رہے ہیں، مسجدوں کے دروازے پہ پہرے بھی دے رہے ہیں۔ چلئے شاید اسی بہانے بیچارے بخشے جائیں۔

ہماری بیٹی ایک محفل کا احوال سنا رہی تھی جہاں مختلف قومیتوں اور مختلف مذاہب کے لوگ موجود تھے۔ بحث کے دوران ایک نے اس سے مخاطب ہو کے کہا، ہمیں معلوم ہے کہ تم مسلمان مذہبی احساس برتری کے مارے لوگ ہو۔ ہمارے بارے میں سوچتے ہو کہ ہم تو سیدھا جہنم کا مال ہیں، ہم جتنے چاہیں نیکی کے کام کر لیں، ہمارا ٹھکانا جہنم ہی ہو گا۔ جنت تو تخلیق ہی تم لوگوں کے لئے ہوئی ہے اور برے سے برا بندہ بھی جنت میں جائے گا کہ بالآخر معاف کر دیا جائے گا۔ ہماری بیٹی کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا اور شاید ہمارے پاس بھی نہیں ہے۔

جیسنڈا آرڈن کو سراہنے والوں میں وہ سب مذہبی پرچارے شامل ہیں جو عورت کو خدا کی مخلوق تو مانتے ہیں مگر یہ مخلوق ان جیسے احساسات، جذبات اور حقوق کی مالک ہے، یہ ان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ ان کے نزدیک عورت کا کام بستر میں ان کا دل بہلانا، سال بہ سال اسلام کے سپاہیوں میں اضافہ کرنا اور روزانہ کی بنیاد پہ ان کی خدمت کر کے جنت کمانا ہے۔ ہم اکثر سوشل میڈیا پہ جنتی بیویوں کی نشانیاں پڑھتے اور سنتے ہیں۔ ہاں جنتی شوہر کی علامات

جاننے کی کوئی ضرورت نہیں، مسلمان مرد اور پھر شوہر، سیدھا جنتی ہی تو ہے۔ اگر کوئی عورت ذکر کر دے کہ مرد اور عورت میں کوئی زیادہ فرق نہیں سوائے Y کروموسوم کے- اول تو سائنس پڑھنا ہی شیطانی کام اور دوسرے ایسا بیان عورت کے منہ سے توبہ توبہ -ضرور یہ عورت لادین ہے، بے شک کلمہ گو ہے پر منکر ہو چکی ہے کہ اسلام تو مردوں کو برتر قرار دے چکا ہے۔

اب آپ جیسنڈا کو کس خانے میں فٹ کریں گے؟ عورت اور وہ بھی دہریہ! مرے پہ سو درے کوئی معاشرتی پابندی بھی اپنی ذات پہ لاگو کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ان پیمانوں کے مطابق تو وہ قابل گردن زنی ہے۔

مگر ٹھہریے، وہی تو ہے جو باہر نکلی ہے، وہی تو ہے جو آپ کے ساتھ رو رہی ہے- وہی تو ہے جو آپ کو اپنا مان رہی ہے، جو آپ کو لپٹا رہی ہے اور آپ لپٹ بھی رہے ہیں -جو پارلیمنٹ کا خطاب سلام سے شروع کر رہی ہے۔ وہی تو ہے جو آپ کے نزدیک جہنمیوں کو اذان سنوا رہی ہے۔ جو ملک کی ایک فیصد آبادی کی خاطر ملکی قوانین تبدیل کروا رہی ہے۔

کیوں کر رہی ہے وہ ایسا؟ کہیں بے چاری مسلمانوں سے متاثر تو نہیں ہو گئی۔ شاید بیچاری ہمارے مذہب کی حقانیت پہ یقین لے آئی ہے۔ اسی لئے یار لوگ اس کی تسلی و تشفی کے درمیان اپنی تبلیغی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کر رہے ہیں۔ دکھ اور غم کی گھڑی اپنی جگہ مگر جنت کمانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے، موقع محل ہو نہ ہو۔

یاد رکھیے، جیسنڈا کا شعوری انتخاب لادینیت ہے۔ جیسنڈا آزادی اور لامحدود آزادی پہ نہ صرف یقین رکھتی ہے بلکہ عمل بھی کرتی ہے۔ اسی لئے وہ بن بیاہی ماں بھی ہے۔ جب دین ہی نہیں تو کیا مشکل؟

جیسنڈا مسلمانوں کا احساس برتری سمجھنے سے قاصر ہے۔ نہیں جانتی کہ گو ان میں سے بیشتر اس مذہب کے پیروکار پیدائش کے جبر سے ہیں لیکن اول دن سے اپنے آپ کو افضل جاننا اور دوسرے مذاہب کو حقیر سمجھتے ہوئے ان کو جینے کا حق نہ دینا، سیکھ چکے ہیں۔ مغرب میں شوق سے رہنا اور ہر وقت لاحول کی گردان کرنا بھی عادات میں شامل ہے۔

آخر جیسنڈا اتنی متحرک کیوں ہے؟ وہ کیوں اپنے مقام سے اتر کے ماری ماری پھر رہی ہے؟ ہمارے وطن عزیز سے ہی سبق پکڑے، بیان داغے، تحقیقات کا وعدہ کرے اور بھنگ پی کے سوجائے۔ رات گئی اور بات گئی!

جیسنڈا کی مشکل یہ ہے کہ وہ انسانیت کی نام لیوا ہے۔ وہ انسان کو انسان سمجھتی ہے چاہے وہ گورا، کالا، پیلا، نیلا کوئی بھی ہو۔ اور چاہے نہ بھی ہو کہ اس کے دل میں انسان کیا، خدا کی بنائی ہوئی تمام مخلوق کا درد ہے۔ اور یہ وہی انسان ہے جس کے متعلق قران کہہ رہا ہے کہ ایک انسان کے قتل میں پوری انسانیت کا قتل ہے۔ خالق کائنات اگر سب کا تخلیق کار ہے تو ماں کو تو اپنے سارے بچے اچھے لگتے ہیں چاہے جیسے بھی ہوں۔

جیسنڈا کی دوسری مشکل یہ ہے کہ اس نے یہ حکمرانی لوگوں کی جان و مال کے لئے قبول کی ہے۔ اپنے ذاتی جاہ و حشم کی طلب میں نہیں۔ اور اس کی ذمہ داری میں دیے ہوئے لوگ چاہے کسی بھی خدا کو مانیں اور چاہے تو نہ مانیں، وہ سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتی ہے۔ نظریاتی طور پہ وہ اس مملکت کی تقلید میں ہے جہاں اسلام کے بعد غیر مسلموں کو بھی مسلمانوں جیسے حقوق حاصل تھے۔ حکمران دجلہ کے کنارے پیاسے رہ جانے والے کتے کے لیے بھی اپنے آپ کو جواب دہ سمجھتے تھے۔

ہمیں سمجھ نہیں آتا کہ وہ سارے مولوی حضرات، جن کے فتوے اپنے شکم کے حجم کے مطابق نکلتے ہیں، جو کئی نسلوں سے جبہ و دستار کے تکبر میں مبتلا ہو کے خدا کی بنائی ہوئی مخلوق کی جانیں عذاب میں ڈالے ہوئے ہیں، جو اپنے آپ کو کسی بھی حساب کتاب سے بالاتر جانتے ہیں، جو مذہبی منافرت کے ذمہ دار ہیں، جو عورت کو ویسے ہی جہنمی مخلوق جانتے ہیں، وہ کیوں جیسنڈا کے ان اقدامات پہ خوش ہو ہو کے اسے اسلام ہی کی فتح گردان رہے ہیں۔ انہیں کیوں لگ رہا ہے کہ اب جیسنڈا، جو سر ڈھانپے پھر رہی ہے، کے اسلام قبول کرنے میں تھوڑا ہی وقت باقی ہے۔

یاد رکھیے، جیسنڈا انسانیت کی داعی ہے اور انسانیت کا کوئی مذہب نہیں ہوا کرتا۔ وہ بھلے لادین ہے مگر ایک اعلی و ارفع انسان ہے۔

اب تھوڑی دیر کے لئے منظر بدل دیجیے۔ مقام پاکستان ہو، فائرنگ گرجاگھر پہ ہوئی ہو اور مجرم مسلمان ہوں اور وقت کی حکمران ہوں بے نظیر بھٹو۔

کیا بے نظیر یہ سب کر سکتیں؟ کیا وہ کہہ پاتیں کہ وہ حفاظت نہیں کر پائیں ان لوگوں کی جو صدیوں سے اسی مٹی کی پیداوار تھے۔ کیا پارلیمنٹ میں چرچ کی سروس ہو پاتی؟ کیا پورے پاکستان کے مسلمان اپنے مسیحی بھائیوں کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے؟ کیا گرجاگھر پہ مسلمان بھائی پہرا دیتے؟

اور فرض کیوں کریں، ہمارے پاس لاہور کے چرچ میں حملے کا واقعہ، علامہ اقبال ٹاؤن میں خودکش حملے کا واقعہ موجود ہے۔ دوسرے مذاہب کو تو چھوڑیے، ہمارے پاس اپنے کلمہ گو بھائیوں جو دوسرے مکاتب فکر سے تعلق رکھتے تھے کو مارنے کے بے شمار واقعات موجود ہیں۔

کیا ہمارے حکمران جیسنڈا کے مقام کو چھو سکے؟ کیا کسی حکمران نے جا کے لوگوں کو گلے لگایا؟ کیا اپنی ذمہ داری میں کوتاہی پہ معافی مانگی؟ شکل دکھانا تو دور کی بات، کیا افسوس بھی تھا کہ نہیں؟

اور حکمرانوں کو تو چھوڑیے، پورا پاکستان جو انتہائی صوم وصلوات کے پابند مسلمانوں سے بھرا پڑا ہے، عمرے اور حج کے شوقینوں کی قطاریں لگی ہیں، کتنے باہر نکلے لوگوں کے زخموں پہ پھاہے رکھنے، دکھ بٹانے۔ کیا ہم واقعی افسردہ تھے؟ یا پھر سوچ رہے تھے خس کم جہاں پاک۔

لیکن نیوزی لینڈ کے واقعے کو تو اس سے نہیں ملایا جا سکتا نا۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔

جیسنڈا تم لادین ہو کے بھی بازی لے گئیں، پر جنت کا مت سوچنا۔ وہ ہمارا حق ہے۔

مجھے ڈھانپ دو کہ تمہارا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے

کیوں جھکاؤ تم نگاہ اپنی؟ کیوں اپنی ہوس کو لگام ڈالو؟ کیوں قابو کرو اپنی نفسانی خواہشات؟ کیوں روکو زیر لباس رینگتے اپنے ہاتھ؟ کیوں ترک کرو عورت کو تنگ عطا کرتا اپنا تکیہ کلام، جنسی لطیفے سننے اور سنانے کا حظ اور پورن فلمیں دیکھنے کا چاؤ؟۔

تمہارے لیے عورت محض جنسی آسودگی کا ذریعہ اور ہر لڑکی جو چار دیواری سے باہر نکلی ہے ریپ کے لائق ہے۔ آخر وہ تمہارے نفس کو مشکل سے دوچار کرنے کا باعث بنی ہے۔

تمہارا کیا دوش کہ عورت کو محض دیکھ کے تمہارا ضبط کمزور پڑ جاتا ہے اور عورت کے جسمانی اعضا تمہاری مشکلات میں اضافہ کرتے ہیں۔ تمہاری خواہش کسی جانور کی طرح بے لگام ہے۔ آخر یہ منحوس لڑکیاں اپنے آپ کو سات پردوں میں چھپائے بغیر تمہارا امتحان لینے کیوں چل پڑتی ہیں۔ نارمل کپڑے تو ناکافی ہیں ناکہ آخر لڑکی ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

اگر کپڑوں کے رنگ چھپانے کے لئے عبایہ اور حجاب کا سہارا نہیں لیں گی تو تمہاری بے راہ روی کی ذمے دار تو وہی ہوں گی نا کہ رنگ تمہاری نازک طبع کو گراں گزرتے ہیں، آنکھ بہکتی ہے اور بار بار بہکتی ہے۔

سنو اے عورت!

کیوں اپنی آنکھ پہ پہرے بٹھائیں ہم، کیوں اتنا کشٹ کاٹیں؟ یہ ہمارا جہاں ہے، ایک مرد بچے کا جہاں اور تمہارا تو مقصد حیات ہی مرد کی خدمت ہے۔ تمہیں اس جہاں میں

ہمارے لئے لایا گیا ہے اب یہ کیا کہ تم گھر سے تعلیم کے بہانے نکل کے ہمارا دل للچاؤ، ہمارا ایمان خراب کرو، آخر مسلمان مرد کا ایمان ہے۔

اسی لئے تمہاری بہتری کے لئے فیصلہ کیا گیا ہے کہ اگر تم کم عقل ہو اور تمہارے گھر کے مرد بے غیرت ہیں کہ تمہیں عبایہ اور حجاب کے بغیر یونی ورسٹی بھیج دیتے ہیں اور ہمیں آزمائش میں مبتلا کرتے ہیں تو کوئی بات نہیں۔ عورت تو سب کی سانجھی ذمہ داری ہوا کرتی ہے، ہم دیتے ہیں عبایہ اور حجاب کا تحفہ، تاکہ ہمارا ایمان خطرے میں نہ پڑے اور تم بھی ریپ ہونے سے بچ جاؤ۔

چلو شاباش، پہنو، ضد نہ کرو!

تم نہیں جانتیں گو تمہارا لباس پورا ہے اور اگرچہ ہمیں تمہارا جسم ننگا نظر نہیں آتا۔ مگر کیا کریں ہماری نظر تو برمے جیسی ہے نا اور ہمیں تمہارے جسم کے خطوط کا ایکس رے کرنا ہے۔ نوٹس لینے دینے کے بہانے انگلیاں تم سے چھوتی ہیں اور اس کے بعد ہمیں کس قیامت سے گزرنا ہے، تم کیا جانو؟

ہم کیوں یاد رکھیں کہ ہمیں اپنی اس حس کو قابو میں رکھنا ہے۔ کیوں یاد رکھیں کہ اسلام اس بارے میں کیا کہتا ہے؟ کیوں یاد رکھیں کہ تمہارے کیا حقوق ہیں؟ کیوں یاد رکھیں کہ تمہیں زندہ دفن کرنے کی ممانعت کے بعد زندگی میں پوری طرح جینے کا حق دیا گیا تھا۔

تم کیا جانو کہ معاشرہ ہماری شہوت کو کیسے ہانکتا ہے؟ تم کیا جانو کہ جنس کا تذکرہ بچپن سے کیسے کان میں انڈیلا جاتا ہے؟ تم کیا جانو کہ اس جادو کو سر پہ چڑھا کے فخر کرنے کا درس کیسے دیا جاتا ہے؟

تم کیا جانو کہ تم صرف کوڑا دان ہو، مرد کی غلاظت سنبھالنے والا کوڑا دان۔ جب تم یونی ورسٹی پہنچ ہی جاتی ہو معاشرے کی سنگلاخ حدود و قیود پار کر کے تو صرف لباس کافی نہیں یہاں ہمارے ساتھ پڑھنے کے لئے، پردے ڈالتے ہیں اپنے جسم پر اپنے خطوط چھپانے کے لئے۔

کیا کہا تم نے، تمہیں ماں بہن سمجھنے کے لئے ہم اپنا ذہن بدلیں اور عبایہ اور حجاب کا سہارا مت لیں۔ دیکھو اتنی مشکل باتیں نہ کرو۔ علم نہیں کون تمہیں بہن سمجھے گا، کون محبوبہ

اور کون اگلے ریپ کا ٹارگٹ؟ سوچ میں جھانکنے کا کام تو مشکل ٹھہرا تو کون اتنی مشکلوں میں پڑے، سیدھا سیدھا تمہیں ہی پابند سلاسل کیوں نہ کیا جائے؟

اور تمہارا کہنا کہ ہماری تربیت کی جائے عورت کی عزت کے لئے، انتہائی بچگانہ خیال ہے۔ کون کرے گا میری تربیت اور کیسے کرے گا؟ یہ میری دنیا ہے اور میں ہوں طاقت کا سرچشمہ، قبیلوں کا سردار، زمانے کو فتح کرنے والا، مجھے کسی بھی تربیت کی کیا ضرورت؟ مجھے تو یہ بتا کے پروان چڑھایا گیا ہے کہ تم، تمہارے لب و رخسار سب میرے لئے ہیں، تمہارا وجود میری آسانیوں کے لئے ہے۔

اور ہاں جان لو کہ تمہیں عبایہ اور حجاب کا تحفہ دینے کا فیصلہ صرف ہم جوانوں کا ہی نہیں، یونی ورسٹی کے بڑے بھی یہی چاہتے ہیں۔ کیا ہوا اگر وہ زندگی کی شاہراہ کے آخر میں کھڑے ہیں؟ کیا ہوا جو ہاتھوں میں رعشہ آ چکا؟ کیا ہوا جو منہ میں بتیسی بدل چکی؟ دل تو دھڑکتا ہے نا، خواہشات تو ابھی بھی باقی ہیں نا، جذبات میں بھی تلاطم ہے۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں، آنکھ میں تو دم ہے!

سو ان کو بھی آزمائش میں مت ڈالو، بے شک وہ ابا جان کی عمر کے ہی ٹھہرے، پر ابا تو نہیں ہیں نا۔

سو ان کی، ہماری، تمہاری یا یوں کہیے کہ ہم سب کی بہتری اسی میں ہے کہ تم عبایہ اور حجاب اوڑھ لو۔ پھر ہم بھی کوشش کریں گے کہ تمہیں بہن سمجھ لیں۔

لگتا تو مشکل ہی ہے۔

(فیصل آباد یونی ورسٹی میں 14 فروری کو عبایہ اور حجاب تقسیم کر کے لڑکیوں کو بہنیں بنانے کا فیصلہ)

جنگل کا ننگے پاؤں شکاری اور غار کی مالک

گزرے زمانوں میں حضرت انسان جنگلوں میں دوڑا پھرتا تھا، نہ تن ڈھانپنے کا شوق، نہ ننگے پاؤں کی فکر۔ فطرت نے ہر غم زندگی سے آزاد رکھا ہوا تھا۔ مرد شکار کے پیچھے دوڑتا اور عورت لائے ہوئے شکار کو نظام ہضم کا حصہ بنانے میں مدد کرتی۔ طاقت کے استعمال نے مرد کو اپنے طور باور کروایا کہ نیزہ لے کے دوڑنا ہی بنیادی کام ہے سو فطرت کے اس نظام کی ڈور اس کے ہاتھ میں ہے۔

لکڑیاں کیسے اکٹھی ہوتی ہیں؟ آگ کیسے جلتی ہے؟ غار کا فرش پتوں سے کیسے ڈھانپا جاتا ہے؟ لایا ہوا شکار کیسے استعمال ہوتا ہے؟ مرد کے جبلی تقاضوں میں کون ساتھ دیتا ہے؟ نئی زندگی کی نشوونما کون کرتا ہے؟ نئی روح کو اس زندگی میں لاتے لاتے کس کے ہاتھ سے زندگی کی ڈور پھسل جاتی ہے؟ یہ سب مرد کے سوچنے کی بات نہ تھی وہ تو ایک ہی بات جانتا تھا کہ وہ شکاری ہے۔

وقت نے کروٹ بدلی، تہذیب کے نام پہ انسان کی جون بدلی، وحشیانہ پن اور جنگلی فطرت کہیں اندر دبالی گئی اور اب ہر چہرے پہ نقاب تھا، بدن پہ خوب صورت لباس اور پاؤں میں جوتا یا جوتی۔ غاروں کی جگہ خوب صورت گھروں نے لے لی۔ شکار ابھی بھی کیا جاتا تھا مگر کرنسی کا اور کرنسی کا پلڑہ بھاری ہونے کی وجہ سے مرد پہ ابھی بھی طاقت کا نشہ طاری تھا۔

پھر کچھ سر پھری عورتوں نے مقابلہ کرنے کا سوچا اور طاقت، اختیار اور ذمہ داری میں توازن کی بات چلی۔ وہ نشہ جو صدیوں سے مرد پہ طاری تھا اس کو ہرا کرنے کی کوشش کی۔ مگر یہ دنیا مرد کی دنیا تھی، آقا کا میدان جنگ تھا اس لئے ہار کیسے مان لی جاتی۔ مروجہ

رسوم ورواج پہ معاشرتی ضروریات کا لیپ کیا گیا اور اس پہ بھی بات نہ بنی تو اپنی خواہشات پہ مذہب کا تڑکا لگایا گیا۔ ہر مذہب کی رو سے یہ ثابت کیا گیا کہ عورت کمتر ہے، اس کی ذمہ داریاں دوسرے درجے کی ہیں اور وہ ملکیت ہے مرد کی، کسی بھی اور چیز کی طرح، جیسے زمین، مال مویشی، گھر اور جیسے جوتی!

جی ہاں، پاؤں کی جوتی، جس کے بنا آپ زندگی کے اونچے نیچے راستوں پہ نہیں چل سکتے۔ جو آپ کے پاؤں کو پتھروں سے بچاتے بچاتے خود جان دے دیتی ہے۔ جس کی موجودگی آپ کے جبلی تقاضوں کو مطمئن کرتی ہے اور جس کا وجود آپ کی زندگی میں آسانیاں لاتا ہے۔ جو آپ کی نسل کی امین بنتی ہے اپنی جان پہ کھیل کے، جو اپنے خونی رشتوں کو تج کے معمور ہو جاتی ہے آپ کے خونی رشتوں کی خدمت پہ، جو زندگی کی ہر اونچ نیچ میں آپ کی پشت پہ رہتی ہے۔ جو اپنی جوانی کے دن آپ کی جدوجہد پہ وار دیتی ہے، جو اکیلے پن کا عذاب سہتی ہے، جو سورج مکھی بن کے آپ کے گرد گھومتی ہے۔

مگر کیا کہیں، کہ آپ کے اندر کا مرد اسے ساری عمر جوتی گردانتا ہے جسے پرانا ہونے پہ کوڑے کے ڈھیر پہ پھینکا جاتا ہے اور نئی جوتی آپ کی ہم سفر بن جاتی ہے۔ اب جب عورت ہے ہی جوتی تو کیا حق اور کیا حقوق۔ پاؤں کی چیز ہے، پاؤں میں رہنے دینا چاہیے، سر کا تاج تو نہیں بنایا جا سکتا نا۔

جب مرد کو مذہب ہی اجازت دے دیتا ہے، دوسری لانے کو، تیسری لانے کو اور اگر اتنا جھنجھٹ نہ پالنا ہو تو تین حرف بول کے گھر سے نکالنے کا تو آپ ایسے مالک کو کیسے بتائیں کہ ہم نے اس چھت کے نیچے زندگی بتائی ہے۔ اگر تم نے پیسہ کمایا ہے تو میں نے جسم و جان جلائی ہے۔ اگر زندگی کی رہ گزر پہ تم نے محنت کی ہے تو میں نے مشقت کی ہے۔ اگر تم نے چھت بنائی ہے تو تمہارا پسینہ میں نے پونچھا ہے۔ اگر تم نے دن ایک کیا ہے تو میں نے راتیں تمہارے بچوں کے لئے کالی کی ہیں۔

اب جب زندگی کا سفر آگے بڑھ چکا، نظر پہ چشمہ لگ چکا، بالوں میں چاندی اتر آئی۔ اب جسم میں وہ توانائی نہیں، جذبات میں وہ شدت نہیں، سورج مکھی کا پھول مرجھانے کو ہے۔ لیکن تم کو ابھی بھی سودا ہے، نئی منزلیں سر کرنے کا، انجانے سفر کا۔ تمہارا دل ہمکتا